

UNIVERSAL
LIBRARY

OU-234393

UNIVERSAL
LIBRARY

۱۶۴

سِلْسِلَةُ أَخْمَنَ تَرْتِي أَرْدُ

نمبر ۲۶

تاریخ اخلاق یورپ

جلد دوم

یعنی یہ کی مشہور کتاب ہسٹری آف یورپین مائرس کا تلخیص ترجمہ

جس میں

فلسفہ معاشرت تمدن مذہب و اخلاق کے باہمی تعلقات پر

یورپ قدیم کی تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے

از

عبدالماجد

بی اے، ممبر اسٹائلین سوسائٹی (لندن) ممبر رائل ایشیائیک سوسائٹی آف گریٹ برٹن (لندن)

ممبر ایشیائیک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) فیلو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) مصنف

فلسفہ جذبات و فلسفہ اجتہاد مترجم مکالمات برکے، تاریخ تمدن وغیرہ

باہتمام محمد تقی علی خاں شہرانی

مطبع زین العیسیٰ گٹھ کالج پریس بی بی

(لاہور دفتر اخمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع ہوئی)

کتاب خانہ

مطبوعاتِ انجمنِ ترقی ادو

تاریخ تمدن حصہ اول | یہ سترہ ماہیں کل کی مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں تمدن کی ابتدائی تعریف سے لیکر انتہا تک ہر مسئلہ پر بے نظیر قابلیت اور عدم المثال و وسعت نظر کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب بین الاقوات پر غور کرنا اور ان سے صحیح نتائج کا اخذ کرنا سکھاتی ہے۔ مصنف نے انسانی تمدن کے متعلق عجیب و غریب اصول قائم کئے ہیں۔ اور بڑی پرزور و جیش کی ہیں اور اپنے اصول و کلیات کی شہادت و حمایت میں تاریخی واقعات کے انبار لگا دیے ہیں۔ قیمت غیر مجلد (پیر)

تاریخ تمدن حصہ دوم | یہ یکل کی تاریخ تمدن کا دوسرا حصہ ہے۔ قیمت غیر مجلد (پیر) جلد (۵) فلسفہ جذبات | (از مولوی عبدالمجید صاحب بی اے) نفسیات (سائیکالوجی) پر اردو زبان میں یہ پہلا کتاب ہے۔ اس میں نفسیات کے صرف ایک حصہ یعنی جذبات و احساسات انسانی پر بحث کی گئی ہے۔ باوجودیکہ یہ علمی کتاب گہریت و دلچسپی اور مفید ہے۔ اور اس کا مطالعہ کرنا ہمارے ہم وطنوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں تقریباً ۵۰ اصطلاحات کی فہرست مع انگریزی کے دی ہے۔ ملک کے علما اور اخبارات نے اس کتاب کو بہت پسند کیا۔ قیمت مجلد (پیر) غیر مجلد (دعہ)

تاریخ اخلاق پوچھنا قول | یہ پروفیسر کی پینٹل اور عالمانہ کتاب کا ترجمہ ہے۔ اٹھارویں صدی اور اسکے باقیں کی معاشرت و مذہب و اخلاق کے معلومات کا ایک حیرت انگیز ذخیرہ ہے۔ یہ نہایت دلچسپ اور سکھانہ کتاب ہے۔ اور اس کے پڑھنے سے دماغ میں روشنی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مترجمہ مولوی عبدالمجید صاحب بی اے قیمت مجلد (سے)

یہ اخلاق پر

بلاؤم

از

عبدالماجد

صفحہ	مضمون
۱۲۹	فصل (۱۲) خانقاہیت کا تعلق خصال عقلی کے ساتھ ۔
۱۲۹	فصل (۱۳) خانقاہیں بطور خزان علم کے ۔ ۔ ۔
۱۵۵	فصل (۱۴) مغربی یورپ کی اخلاقی حالت ۔ ۔ ۔
۱۶۰	فصل (۱۵) کلیسائیں عسکریت کا آغاز اور نشو و نما ۔ ۔ ۔
۱۶۱	فصل (۱۶) دینیوی مراتب کا مذہبی احترام ۔ ۔ ۔
۲۲۶	باب پنجم۔ عورت کا مرتبہ ۔ ۔ ۔
۱۸۸	فصل (۱) یونان کی اخلاقی حالت ۔ ۔ ۔
۱۹۹	فصل (۲) رومہ کی اخلاقی زندگی کی فضیلت ۔ ۔ ۔
۲۱۷	فصل (۳) مسیحیت کا اثر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۲۲۶	فصل (۴) فضائل سنوانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دیباچہ

تاریخ اخلاق یورپ کی جلد اول جنوری ۱۹۱۷ء میں شائع ہو چکی ہے جلد ثانی اس وقت ناظرین کے روبرو ہے۔ اس کا مسودہ اپریل ۱۹۱۶ء میں تیار ہو چکا تھا، اس سارے مین برس کے عرصہ میں طبع و اشاعت کی جن دشوار گزار مہینوں سے ہو کر گزرنا پڑا، اس کا اندازہ بکباران سائل کسی طرح نہیں کر سکتے۔

اصل ترجمہ میں جس قسم کے تصرفات کئے گئے ہیں ان کی تصریح جلد اول کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے۔ بہتر ہو گا کہ جلد ہذا کے مطالعہ سے قبل اس پر ایک مرتبہ پھر نظر کر لی جائے۔ یورپ اسامہ کی فہرست بھی انگریزی خط میں جلد اول میں شامل ہے۔

اغلاط طبع سے متعلق کچھ کما تحصیل حاصل ہے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ لیتھو پریس میں غلطیوں سے پاک کسی کتاب کا نکالنا ناممکن ہے۔ آئندہ ادراک میں ناظرین کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے البتہ یہ غنیمت ہے کہ اردو مطبوعات میں اغلاط طبع کا عموماً جو تناسب رہتا ہے، اس کے لحاظ سے اس کتاب میں غلطیاں نسبتاً بہت کم نظر آئیں گی۔ اس کے لئے مہتمم صاحب مطبع کی تششیں مستحق شکر یہ ہیں۔

گولہ گنج لکھنؤ

عبد الماجد

۲۰ ستمبر ۱۹۱۹ء

۱۰۰۰ مطبع میں مسودہ جنوری ۱۹۱۷ء میں ہو چکا ہے خدا جانے اپریل ۱۹۱۷ء سے دسمبر ۱۹۱۷ء تک کہاں رہا۔ مہتمم مطبع

باب چہارم

قسطنطین کے زمانہ سے شارلمین کے عہد تک

فصل (۱)

تمہید

گزشتہ باب میں اجالا، مگر کافی وضاحت کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے کہ رومہ میں مسیحیت کو پھیلنے کے کیا کیا اسباب ہوئے اور اس اہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں حائل رہیں۔ موجودہ باب میں دیکھنا ہے کہ مسیحیت نے دنیا کے سامنے اخلاقی معیار و نصب العین کیا پیش کیا، اور دنیا سے اس کی تعمیل کیونکر کرانی؟ لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھیں، ایک عام غلط فہمی کا شروع میں رفع کر دینا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مسیحی تعلیمات کے مقابل مارکنس آریلیس و سنیکا کی تحریروں سے اُن کے متحد المضمون فقرات اقتباس کر کے رکھ دیتے ہیں، اور پھر ان دونوں میں موازنہ کر کے مسیحیت کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ طریق موازنہ قطعاً ناقابل اعتماد ہے۔ مشرکانہ وسیحانہ اخلاق کی بہت بڑی فارق یہ ہے کہ مشرکوں کا اخلاق اُن کے فلسفہ کا جزو تھا، برخلاف اس کے مسیحوں کا اخلاق اُن کے مذہب کا جزو تھا۔ اول الذکر کے یہاں جو کچھ سرمایہ اخلاق تھا، وہ نام تعالیٰ ہیچمانہ اصول کا جو فلاسفہ نے بعد غور و خوض کے قائم کیے تھے۔ وہ فلاسفہ ہی کے لیے موزوں تھے، اور عوام کو اُن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ خلاف اس کے آخر الذکر کا نظام اخلاق

اُن کے مذہب کا جزو غیر منفک تھا، جو مذہب کے قائم کردہ حدود و عبارات، معتقدات و معاملات سے ذرا بھی الگ نہ تھا، اور اس واسطے عوام و خواص سب پر یکساں موثر تھا۔ مشرکوں کا مذہب کوئی مسائل حل کرتا تھا؟ یہ کہ علم غیب کی فکر محال ہو سکتا ہے؟ کائنات کی علت حقیقی کیا ہے؟ مصائب سے کیونکر باموں ہٹا جائیے؟ اور دیوتاؤں سے کیونکر استعانت کرنا چاہیے؟ ان کے اندر اس کی کس گنجائش ہی نہ تھی، کہ پاکیزگی اخلاق کے ذریعہ سے روحانی ترقی حاصل کرنا چاہیے ان کے ہا دیان شریعت فضائل اخلاق سے باہل بیگانہ تھے، اور ظلم و اظلام مذہب شریعت سے مطلق واسطہ نہ رکھتے تھے۔ یہ شرف محض مسیح کے لیے مخصوص تھا کہ اس نے اخلاق و مذہب کے ڈانڈے ملا دیے۔ اخلاقی پاکیزگی کو نجات اخروی کا ذریعہ بتایا، اور سن اخلاق کے لیے وہ محرمات و مہربات فراہم کر دیے، جن سے عوام و خواص دونوں برابر متاثر ہوتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ اہل خطابت کے ہاتھ میں پڑ کر فلسفہ ملک میں زیادہ مقبول و شایع ہو گیا تھا، اور فیثاغورثی و مشرقی مذاہب میں صفات باطن کا بھی ایک درجہ مقرر کیا گیا تھا، تاہم اس قدر قطعی ہے کہ مذہب و اخلاق میں جتنی صریحی، بلاد واسطہ اور قریبی آمیزش و اتحاد مسیحیت نے پیدا کر دیا، یہ اس سے پیشتر دنیا کے لیے نامعلوم تھا۔ اس نے مذہبی تقدس اور برگزیدگی کی بنیاد فضیلت اخلاقی پر رکھی، اور موثرات قوی سے کام لے کر وجود باری تعالیٰ کو روح و فرائض انسانی کے مسائل کو، جن تک قدامت کا تحلیل ہی نہیں پہنچتا تھا، وقف عام کر دیا۔

لیکن مسیحیت اس اخلاقی انقلاب میں کامیاب کیونکر ہوئی؟ اگر کہنے کے اپنی تعلیمات کی خوبیوں سے، تو مشرک بھلا، اخلاق کی تعلیمات کی رفعت و حسن سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس کا اصلی باعث یہ تھا کہ مسیحیت نے اخلاقی تعلیمات کو موثر بنانے کے طریقہ بالکل نئے اختیار کیے۔ وہ طریقہ یہ دیتے۔ ایک یہ کہ مسیحیت نے حیات بعد الموت میں جہنم و سہلہ کا پورا یقین دینا کہ وہ لا دیا۔ مشرکوں کے یہاں یہ تحمل بہت ہی دسند لا وہم تھا، مسیحیت نے اسے پوری وضاحت و قطعیت کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرے مسیحیت یہ بتایا کہ ہر نفس کو اپنے جزیات اعمال تک کا فرد افراد حساب کرنا ہوگا اور سزا میں عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوگی یہ دونوں طریقہ دنیا کے لیے بالکل نئے تھے، اور ان کا

عام مطلوب پر سجدہ کرنا۔ پشتر لوگ ماقبت کی طرف سے غافل و بے خبر رہتے تھے، لیکن اب انھیں اپنے ہر حقیر سے حقیر قول و فعل پر ذمہ داری محسوس ہونے لگی، اور انھیں یقین ہو گیا کہ اُن کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی تو ہم آخرت کے حسابہ و باز پرس سے باہر نہیں رہ سکتا، خواہ دنیا میں وہ سب کی نظر سے مخفی ہے۔ ایک اثر تو یوں پڑا۔ دوسری طرح پر یہ خیال اس لیے زیادہ موثر ہوا کہ مسیحیت نے جہاں فضائل اخلاق پر زیادہ زور دینے کے، اصل زور دایم اخلاق کے نتائج پر دیا۔ مشرکوں کا فلسفہ یہ تھا کہ ”نیک کردار جو فضائل اخلاق سے آراستہ ہو، مسیحیت نے اس کے برخلاف یہ دعوت دی کہ ”بدکاری سے بچو۔ دایم اخلاق سے اپنے تئیں گنگنا کر نہ بناؤ“ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، لیکن پہلی صورت انسان کو فرشتہ بنانے میں زیادہ مہین ہوتی ہے، اور آخری صورت شیطان کو انسان بنانے میں۔ قدیم قطعہ اخلاق پر عمل سے چند مخصوص اشخاص کا، جو پہلے سے نیک کرداری پر آمادہ و مائل ہوتے ہیں، اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کا ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ عام افراد کا اخلاق ایک مختصر خط تک اصلاح پذیر ہو جائے۔ یہ قوت صرف اس آخری طریقہ دعوت کو حاصل ہے۔ جو لوگ طبعاً بدکاری کی جانب مائل ہیں، اُن کے سامنے فضائل اخلاق کے مقابل پیش کیا بالکل بیکار ہیں۔ اُن پر اگر کوئی شے موثر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ بدکاری سے عذابِ آخری میں گرفتار ہو گئے اور عذابِ دہائی میں پڑو گئے۔ انھیں اور راست پر صرف خوف لا سکتا ہے۔ اور پھر وہ خوف، جو عذابِ الہی کا ہو، دنیا کی اخلاقی غامیوں کی اصلاح کا یہی ایک راستہ ہے اور ملامی کو مسیحیت نے اختیار کر کے گویا کائنات اخلاقی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

دنیا کی ہر شے میں نقص و ضرر و دونوں ہوتے ہیں۔ غنی سے مفید شے بھی مضر کے پہلو سے خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ مسیحیت نے اصلاح اخلاق کا جو طریقہ اختیار کیا، اس نے نہایت کاہل و اثر رکھا تاہم اس کے مضر پہلو بھی بے اثر نہیں ہے۔ انسانیت کے تاریک رخ پر ہر وقت زور دیتے رہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء مسیحیت کوہن میں انسان کے جو مصلحتی ہونے کا خیال بہت مبالغہ کے ساتھ سا گیا، اور وہ مصیبت کو انسان کی اصل سرشت سمجھنے لگے، انھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا کہ

تقلید کرتے رہنا چاہیے۔ لیکن تقلید و تبع، اور آلفت و محبت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ مسیحیت کے لیے مخصوص تھا کہ اس نے دنیا میں سب سے اوّل بار لوگوں کو محبت کے راستہ سے اخلاق کی تعلیم دی اور نسل انسانی کے سامنے ایک ایسا بلند کیرکیر، ایک ایسی دلغیرب شخصیت پیش کی، جو اپنی دلغیرب و محبت سے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کو متاثر کرتی رہی ہو، جو بہترین محرک اخلاق ہو، جو آٹھ سو سال گزر جانے پر بھی بد تو ر قوی و موثر ہو، اور جس کی عجیب و غریب قوت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ گو اس کی ساری زندگی کے صرف تین سالوں کا علم ہو، لیکن اُس کی اسی سالہ زندگی کے کارنامہ طبعیت پر وہ اثر ڈالتے ہیں جن کا مقابلہ بڑے سے بڑے داعیین کے مواظف اور بہتر سے بہتر حکماء کے مقولہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت میں مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع یہی مسیح کی محبت رہی ہو، جو مبدی انقلابات پر بھی اب تک جوں کی توں ہو، اور گو آگے چل کر مسیحیوں نے خود اپنے دین و ملت میں بیسیوں زخموں پیدا کیے، لیکن اپنے آقائے نامدار کے سیرت کی دلغیرب پر کبھی کوئی حرف نہ لائے دیا۔ محبت کا کل اپنے سامنے کسی استحقاق و دعویٰ کو نہیں ٹھہرنے دیتی۔ پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق و محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں اتنا ہی خلوص و ذوق سے کرتے ہیں، جن میں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہو اور نہ صلہ و تحین کی۔ سینٹ تھریسیا دعا مانگا لگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات ناپید ہو جائے، اور اکیلی میں موجود ہوں تاکہ آفاقی خدمتگاری کا فخر تنہا مجھی کو حاصل ہے، اور اُس کی اس تنہائی کی آواز باز محبت اُس صبی ہزار ہا عاشقانِ مسیح کی زبان سے آتی ہو۔ خود تعیدوں کو زمانہ میں منتہائے شدید پر تحمل و برداشت کی قوت مسیحیوں میں کس نے پیدا کر دی تھی؟ اسی عشقِ مسیح نے۔ زندہ زمین میں دفن کیے جاتے تھے، جنگلی جانوروں کے آگے چھوڑ دیئے جاتے تھے، لیکن صلیب کو اپنے محبوب مصلوب کی محبوب یادگار کو کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے، زخم پر زخم کھاتے تھے، دوسروں کو اُن کی حالت پر ترس آ جاتا تھا، لیکن وہ خود خوش و خرم تھے کہ مسیح کے نام پر یہ زخم کھائے جا رہے ہیں۔ موت آتی تھی اور وہ اس کا اس سرسبز استقبال کرتے تھے کہ گویا دو لہا اپنی دلی دلس کو آغوش میں لے رہا ہو۔ یہی ہے

محض اس لیے کہ موت سے انہیں اپنے مشوق کا وصل نصیب ہو گا سینٹ فیلپس زندانِ عفو میں اسیر تھی کہ وضعِ حل کا وقت آگیا۔ ایسی حالت میں اُسے جیسی کچھ تکلیف ہوئی ہوگی ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس سال میں بے اختیار ایک پیچِ آس کے ٹھنڈے سے نکل گئی۔ ایک ناشائی نے ترس کھا کر کہا کہ ”ابھی اسقدر بچین ہو رہی ہو، ذرا دیر میں درندوں کے سلسلے ڈال دی جاؤ گی، وہ تکلیف کیسے برداشت کر دگی؟“ اس پر اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا کہ ”نہیں اُس وقت مجھے مطلق تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ تکلیف میں جس کے لیے برداشت کر دنگی، وہ حقیقت خود ہی اُسے برداشت کر لینگا“ اسی طرح جب سینٹ میلینا کا شوہر اور دونوں لڑکے دفن ہو چکے اور دنیا میں اُس کا کوئی والی و وارث باقی نہیں رہا تو وہ اُن کی قبروں پر جا کر بیٹھی اور کہا کہ ”اُمی، تیرا شکر ہے کہ تو نے ان بھڑوں سے مجھے نجات دے دی میں اب پوری کیسوی کے ساتھ تیری خدمت گزار کر سکتی گی“

جو لوگ اس اُقیسےؑ بانہر ہیں کہ جذبات کی قوت و تندی کے مقابلہ میں اکثر محض قوتِ فرض شناسی کیونکر بیکار ہو جاتی ہے؛ جو لوگ اس مُرنے آگاہ ہیں کہ اسلام باوجود اپنی خالص توحید اور اعلیٰ نظامِ اخلاق کے محض اُس باعث کہ اس کے متبعین کے سامنے کوئی اعلیٰ غلیٰ نمونہ نہیں شرافت و محبت کے لطیف ترین جذبات سے کس طرح معرّی رہا ہے؛ اور جن لوگوں کے پیشِ نظر مسیحی تاریخ کے اوراق ہیں جن کی ہر سطر میں محبتِ مسیح کے کرشمہ نظر آرہے ہیں، وہ سینٹ اگنا کے اس فقرہ کی اہمیت و لطف کا پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ ”مسیحی اخلاق، فلسفہ اخلاق نہیں بلکہ ایک نظامِ محبت ہے“ بلکہ ایک طرح پر ہم قدما مسیحین کی پورے جوشِ محبت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ وجہ یہ کہ اُن کی دماغی زندگی کی ایک خاص خصوصیت تھی، آج جو ہم میں سے کسی میں موجود نہیں۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ کائنات کے مستمر النظامِ پابند قوانین ہونے کا علم یقین جیسا آج کل ہم کو ہر قدم میں کسی کو نہ تھا۔ آج ہم میں کا کوئی تعلیم یافتہ شخص خواہ کیسا ہی مذہبی خوش عقیدگی میں ڈوبا ہوا ہو، یہ یقین ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں کھتا کہ قحط و وبا، طوفانِ دریا

کسی مستبدِ عالم کی طرف سے انسانی افعال کے صلہ یا سزا کی طور پر نازل ہوتے ہیں بلکہ ہر شخص پر جاتا ہے کہ یہ طبعی واقعات ہیں جو طبعی و مادی اسباب پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن قدامتِ مسیحین کی یہ حالت نہ تھی۔ اُس وقت عالم کے مستمر النظام ہونے کا عقیدہ تقریباً معلوم تھا۔ اُس وقت ہر شخص برا و راست ایک فرمانِ الہی کی معلول سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حالت اور اپنے زمانہ میں کسی ہستی کے بارے میں یہ اعتقاد کہ ایک طرف وہ ساری دنیا پر مقصوف و حاکم تھا جس کا حکم ہر شے پر حاوی تھا اور جسے کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، دوسری طرف باوجود اس غیر محدود و قوت و اقتدار کے وہ محض اپنی اُمت کی نجات کے لئے محض اپنے اُبلے کے گناہوں کے کفارہ کے لیے انتہائی مظلومیت و نکستی کے ساتھ سولی چڑھ گیا، اور سخت سے سخت شدید برداشت کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد کس قدر مؤثر ہوتا ہوگا خون میں حرارت پیدا ہوتی ہوگی، تو اسی تخیل سے؛ ارادوں میں جوش پیدا ہوتا ہوگا، تو اسی عقیدہ سے؛ غرض اسی اُس زمانہ میں عینی کچھ بھی اہمیت ہو، ہمارے اندازہ سے یقیناً زائد ہوگی۔ مصیبت کا مارا، ایک غیب و ناچار دیکھا رہا، جسے دنیا میں ہر طرف ناکامی و مایوسی کا چہرہ نظر آتا تھا، وہ بھی آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہتا تھا کہ "اے مولیٰ تیرا ہی اسرار ہے"

پس اگر ایسے مذہب نے جس نے اپنا مقصد اولیٰ اصلاحِ اخلاق رکھا تھا، اور جس نے اپنے زبردست نظام، اپنے عقیدہ جزا و سزا، اور اپنی قوتِ تخلیقِ خلوص و خود فراموشی سے قلوبِ انسانی پر ایک عظیم النظر قابو حاصل کر لیا تھا، اگر ایسے مذہب نے اپنے متبعین کو تقدس کی بہت بلند سطح پہنچا دیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ بیچ یہ ہے کہ یورپ میں مسیحیت نے اپنے داخلہ سے تقریباً دو سو سال تک پاکیزگیِ اخلاق کا جو نمونہ پیش رکھا، اُس کی نظیر تو شاید کیس مل جائے، تاہم اسے تبرعاً نہ یقیناً کہیں نہیں ملتا۔ رومیوں کے درمیان رہ کر، مگر اُن کی تباہ کاریوں کے الگ سیاسی شور و شوش سے دور، مقدمہ بازیوں سے علیحدہ؛ جنگی و قومی مشاغل سے بچاؤ؛ اپنے آقا کے ظہور کے مشتاق؛ اپنے مذہب کی تعلیمات کے جوش و غلو میں سرشار؛ اور اپنے گرد و پیش کی

زہر ملی ہو اسے غیر متاثر؛ ان مسیحیوں نے مدت دراز تک اپنی اخلاقی آن دبا ن قائم رکھی اس سے انکار نہیں کہ اس زمانہ میں بھی اخلاقی انحطاط کے علامات خال خال موجود تھے اور کیونکر نہوتے جب کہ صد ہائے نام عیسائی اس طبقہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور دولت و ثروت کا جادو اپنا اثر دکھانے لگا تھا، تاہم یہ اس وقت کسی کے سامان و گمان میں بھی نہ آتا تھا کہ وہ مذہب جو کچھ دنوں میں شرک و بت پرستی کا بجھن ثابت ہو گا، جس کے ائمہ کے سامنے بڑے سے بڑے تاجداروں کو سرنگوں ہو جانا پڑے گا۔ اور جس کے اکابر اپنا اثر دنیا کے تمدن پر ایک ہزار سال تک قائم رکھینگے؛ اُس کا یہ عین قوت و اقتدار کا زمانہ، تمدنی حیثیت سے تاریخ کے حقیر ترین زمانوں میں شمار ہو گا۔

اس زمانہ کے خاص حالات ہم مختصر الفاظ میں بیان کیے دیتے ہیں:-

مارکس آریلس کی وفات کے زمانہ میں جو وہی زمانہ تھا جب کہ مسیحیت نے روم میں اثر و اہمیت حاصل کرنا شروع کر دی تھی، سلطنت کے اقبال میں گھن لگ گیا۔ اور روز بروز انحطاط و زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ سب سے پہلے مسیحی تاجدار یعنی قسطنطین نے اپنا دار الحکومت ایک نئے شہر قسطنطنیہ کو قرار دیا، جو شرک و بت پرستی کی روایات کی زہر ملی ہواؤں سے غیر متاثر تھا، اور یہاں اُس نے ایسی سلطنت کی بنیاد لی جس کا اخلاق تمام تر مسیحی مآخذ سے ماخوذ تھا، اور جو ۱۱۰۰ سال تک قائم رہی، لیکن اس سچو کے بارہ میں جسے بازنطینی حکومت کہتے ہیں، مؤرخین کا یہ متفقہ فتویٰ ہے کہ اس سے زیادہ ذلیل و پست تمدن اب تک دنیا نے نہیں دیکھا ہے۔ شہ، ظلم، شقاوت، بے ہمی میں اور بت پرستی اس سے بڑھ چڑھ کے ہوئے ہیں، لیکن کم ظرفی، دانات، و سفلہ پن کی مثالیں کسی دوسرے تمدن میں اس کثرت سے نہیں ملتیں۔ تمدن کے ظاہری لوازم کی ان میں کمی نہ تھی، علم ان کے پاس تھا، یونان قدیم کا پر جوش و رغبت لٹریچر ان کے پیش نظر تھا۔ یہ سب کچھ تھا، با اینہم سفلہ پن کے مظاہر ہر سمت جلوہ گر تھے۔ سازش و غبا بازی، بددلی

احسان مستعوضی، ناشکر گزاری، بُزدلی، و غلامانہ خصوصیات کی ہر طرف گرم بازاری تھی، اور واقعات جو چاروں طرف سنائی دیتے تھے، وہ اس طرح کے ہوتے تھے کہ آج اس نے اُس کے کھانے میں زہر ملا دیا، کل اُس نے اس کا محرم اسرار دوست بن کر عین موقع پر لے دغا دی، پرسوں کسی نے کسی رُئس کی ڈیوڑھی کے خواجہ سراؤں کو گناٹھکر محل سے اسباب اُڑالیا، وغیرہ لگ رہے کہ اس زمانہ میں نیرو کا سا ظلم، اور ہیلیو گلیس کا سبے شرم، کوئی تاجدار نہیں پیدا ہوا، تو پھر یہ بھی تو ہے کہ کوئی فرمانروا اتھوٹا و مارکس آریس کے لگ جگ بھی نہیں پہنچا۔ یہودیگی کی یہ حالت قائم تھی کہ مسلمانوں کے حملہ نے مشرقی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور اہل شہر کو ابھی قیامت نہ موشگافیوں سے فرصت نہیں ملی تھی کہ قسطنطنیہ، ہلال کے زیر نگین آگیا۔ ایشیا میں تو کلیسا پر بدت ہوئی، فاطاری ہو چکی تھی، ایشیائے کوچک میں مسیحیت نے پُر جوشش پُر غلور اسباب اور متشدد فقہا کو بہت سے پیدا کر دیے تھے۔ لیکن اخلاق میں شتمہ برابر بھی اصلاح نہیں کی تھی۔ لوگوں کو فقیانہ مناظرہ کا تو ایک اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا، تاہم اُن کی عیش پرستی، اُس کے اثر سے ذرا بھی ماند نہیں بچتی تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ قبول مسیحیت کے بعد تعیش اور بڑھ گیا تھا۔

یہ سرگزشت تو مشرقی سلطنت کی تھی۔ مغربی سلطنت کا حال اس سے کس قدر مختلف تھا۔ قسطنطین کے اصبلان کو ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ روم کو الار نے اپنے قبضہ میں کیا، اور وحشیوں کے متواتر حملوں نے رومی تمدن معاشرت کی بنیادیں لرز کر دیں۔ ادھر ان وحشی حملہ آوروں نے خود ہی مسیحیت قبول کر لی، اور چونکہ ان میں بیشتر کسی قسم کا تمدن موجود نہ تھا، اس لیے گرجا کو جو قدما کے تمام خزانے کا محافظ تھا، پورا موقع ملا کہ اس سادہ صفحہ کی جس طرح پر چاہے خانہ پُری کرے۔ چنانچہ اُس نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ صدیوں تک اُس نے دل و دماغ و زبان پر اپنی حکومت قاہرہ قائم رکھی، اور ایسا نظام تمدن برقرار رکھا جس کے ایک ایک گونہ ورنیشہ میں کلیسا کی جہت

سرایت کیے ہوئے تھی، یہاں تک کہ عند ظلمات میں بھی جو اپنی تاریک خیالی کے واسطے
استقرار بجا طور پر بدنام ہو، شرفیائے داعیِ اخلاق کے جو ہر بکثرت چمکتے نظر آتے ہیں۔ یہ زمانہ
بلحاظ فیاضی، مذہبی تقدس و احترام، وفا شعار، اور مشارکت و معاونت، قدماء و مشرکین کے
زمانہ سے؛ بلحاظ انسانیت و خدا ترسی رومی تمدن سے؛ اور بلحاظ عصمت پرستی، یونانی تمدن
سے کہیں بڑھا چڑھا ہوا تھا۔ ایک طرف ان میں یہ خوبیاں تھیں۔ لیکن دوسری طرف طغیانی
قومی ہمدردی، حریت پسندی کا ان میں پتہ نہ تھا۔ نہ ان کے یہاں قدماء کی طرح کوئی اعلاظم
رجال پیدا ہوئے۔ اور نہ ان کے اخلاقی مطنہ نظر میں کبھی وہ رفعت و لطافت پیدا ہو سکی جو
قدماء کے یہاں تھی۔ طوائف الملوکی، بد نظمی، خانہ جنگی، نظم و جبر، جدال قتالی، کایا زار و گرم تھا۔
اور کمالات علمی کی تو شاید ہوا بھی انہیں نہیں لگی تھی۔ اس سے جاہل تمدن دنیا میں
کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اختلاف رائے و عقائد پر رواداری کے نام سے کسی کے کان بھی
آشنا نہ تھے۔ البتہ مقبول و متعارف عقائد کی تائید میں اختراع و واقعات و روایات و خلع
و محکم کے لیے کامل رواداری تھی۔ زود اعتقادی و توہم پرستی کی خاص تعلیم دی جاتی تھی
اور تحقیق و تنقید کا نام لینا گویا کلمات کفر کہتا تھا۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی، بحرِ فقہ اور ہنر
کے اور اس زمانہ کا کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس گیارہ بارہ سو سال کی مدت کے کسی
زمانہ میں رہنے کے مقابلہ میں یونان و روم کی قدیم حکومتوں میں رہنے کو نہ ترجیح دیتا۔
مشرقی و مغربی حکومتوں کی دوازدہ صد سالہ مختصر تمدنی تاریخ اوپر کی سطروں میں
بیان ہو چکی۔ میرے نزدیک اب اس سے بڑھ کر واضح و معتبر شہادت اس حقیقت کی کیا ہو سکتی
ہی کہ اگرچہ مسیحیت دنیا کو چند نئے اصول اخلاق دیئے، اور اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود
میں اس نے ایک نہایت زبردست اصلاحی عنصر کا کام دیا، تاہم اس کی جو شکل کلیسیا
یونان و روم نے پیش کی، اس کے لحاظ سے یہ بالکل اس کے لیے ناموزوں تھی کہ کسی تمدن
کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی۔ بعض مصنفین اس الزام کو رفع کرنے کے لیے یہ

تادیل میں کرتے ہیں کہ ”رومی سلطنت میں مسیحیت کے دین حکومت ہونے سے پیشتر ہی خطا شروع ہو چکی تھی، اور چونکہ مسیحی حکمرانوں نے قدیم مشرکانہ روایات کو ایک حد تک زندہ و برقرار رکھا۔ اس لیے جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کی ذمہ داری مسیحیت پر کسی طرح عاید نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ کہ عمد ظلمات میں جو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس کا اصلی باعث وحشیوں کے حملہ تھے، جو امن پسندوں کو دم ہی نہیں لینے دیتے تھے۔“ تادیل ایک حد تک واقعت پر مبنی ہے۔ لیکن نفع الزام کے لیے کافی نہیں جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بازنطینی حکومت کا صدر مقام تو ایسا شہر تھا، جو مشرکانہ روایات و رسوم سے قطعاً غیر متاثر تھا، نیز یہ کہ مغرب میں مسیحیت کو وحشیوں کی شورش کے اچھی طرح فرد ہو جانے کے بعد، پورے سات سو سال تک عروج و افتدار کامل چل رہا، تو اس تادیل کا وزن کچھ بھی نہیں باقی رہ جاتا، اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مسیحیت کو اپنے امتحان لینے کا پورا موقع حاصل رہا۔ اور اس امتحان میں وہ ناکام ثابت ہوئی۔ یہ بتادینا بہت آسان ہے کہ قدما میں فلاں فلاں معایب تھے، اور مسیحی تحریریں ان سے بالکل پاک ہیں، لیکن یہ طریق موازنہ قرین انصاف نہیں۔ اگر ہم انصاف کے ساتھ موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو چاہیے کہ دونوں تمدنوں کا بہ حیثیت مجموعی موازنہ کریں، اور صرف اسی پر نظر نہ رکھیں کہ ایک تمدن میں کیا کیا نقصانات تھے، جن سے دوسرا پاک رہا، بلکہ یہ بھی لحاظ رکھیں کہ ہر تمدن بہ لحاظ فضائل اخلاق کے تنوع اور مداح کے دوسرے سے کہاں تک ممتاز رہا۔ اور جب ہم اس طریقہ پر موازنہ کرتے ہیں، تو نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں:-

(۱) مسیحیت نے اپنی زندگی کی ابتدائی دو صدیوں میں اپنی اخلاقی سطح نہایت بلند رکھی۔ اور اس کی یہ بلند اخلاقی، خاص طور پر پائس کے دین برحق والہامی ہونے کی سندیں پیش کی جاتی رہی۔

(۲) تیسری صدی سے انحطاط کے علامات پائے جانے لگے۔

(۳) اس کے بعد کی دوسریاں بہ بقول پادری مورخوں کے، معصیت و سیہ کاری کی صدیاں تھیں۔

(۴) اس کے بعد جو زمانہ خاص مسیحی تمدن کا ۸-۱۰ صدیوں تک رہا، گونفائل سے خالی نہ تھا، تاہم وہ اس قابل نہیں کہ مسیحی اُسے غر کے ساتھ اپنی تائید میں پیش کریں۔

(۵) آخری تین صدیوں (یعنی سترھویں اٹھارھویں اور انیسویں) میں، تمدن بے شبہ پھر نہایت بلند سطح پر آگیا ہے، لیکن اس کے لیے یہ مسیحی اخلاق کا کچھ یوں ہی سادست نگر ہے۔ ورنہ سائنس کی ترقی، آلات کی ایجادیں، علوم طبعی کے انکشافات، کاروباری زندگی کا پھیلاؤ، علم و لٹریچر کی اشاعت عام، نظام حکومت کی بہتری، تمدن کی روایات غرض موجودہ تمدن کو اس قدر بلند سطح لانے والی نامرہی مادی چیزیں ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر زیادہ دقت نظر سے تفتیش کی جائے تو دو حقائق اصولی اور بھی ظاہر ہونگے:-

(الف) اڈولایہ کہ قرون وسطیٰ کے تمدن کو خواب غفلت سے ہوشیار کرنے والی چیزیں اور یہ دونوں تھیں مسیحیت کے اثر سے بالکل الگ تھیں۔ ایک قدامت یونان و روم کا لٹریچر، دوسرے مسلمانوں کے مدارس و درسگاہیں۔

(ب) ثنائی یہ کہ تمدن جدید، جوں جوں مذہب کے اثر سے آزاد ہوتا گیا ہے اُسی نسبت سے ترقی کرتا رہا ہے۔ فنِ طب، سائنس، صنعت و حرفت سیاسیات، بلکہ فلسفہ اخلاق تک محسوسے کو اٹھا کر دیکھئے، ہر جگہ یہ نظر آئے گا کہ جوں جوں کلیسا کی گرفت ہلکی پڑتی گئی ہے، تمدن کی رفتار تیز ہوتی رہی ہے۔ (اس بحث پر ہم نے اپنی ایک دوسری تصنیف

”تاریخ عقلیت یورپ“ میں تفصیل سے نظر کی ہے۔

ان مراتب کے بعد اب اصل مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر ایک ایسا مذہب جو اپنی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے بے نظیر، جو انسان کے دل و دماغ، دست و زبان پر ایک حیرت انگیز اثر و اقتدار رکھتا ہے۔ اور پچھلی تین صدیوں سے دنیا کے لیے آیہ رحمت ثابت ہو رہا ہے، ہزار بارہ سو سال تک اخلاق یورپ کی اصلاح میں ناکام و بے بس رہا؟ میرے خیال میں اس کے متعدد دوسرے اسباب تھے۔ اور اس مدت میں کلیسا اگرچہ بعض حیثیات سے اصلاح کرتا رہا، لیکن بعض دوسری حیثیات سے تخریب و زوال کا بھی باعث رہا۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے آئندہ تفصیل ملاحظہ طلب ہیں۔

فصل (۲)

مسیحیت کا پہلا سبق نفس انسانی کا احترام

مسیحیت نے اگر دنیا کو سب سے پہلا اخلاقی سبق اخوت انسانی کا دیا۔ اُس نے یہ بتایا کہ کسی شخص کی زندگی اس دنیا میں نہیں ختم ہوتی بلکہ ہر شخص کو اُس کے بعد آخرت میں جزا و سزا ملتی ہے اور ہر شخص حصول نجات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متحد اور اُس کے مساوی ہے۔ اور اس بنا پر ہر بشر کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کی زندگی کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھے۔ ہمیں سے دنیا میں نفس بشری کی عظمت کا عقیدہ سب سے پہلی بار پھیلایا۔ یہاں پر جملہ معترضہ تو ہوتا ہے، لیکن مسئلہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہم اصل محبت سے ذرا ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔

ضمیریت پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ جن عقائد کو داخل مرثیت و جز و فطرت سمجھا جاتا ہے وہ تحقیقات کے بعد ایسے نہیں ثابت ہوتے مثلاً ایک قتل انسانی ہے کہ اس کی طرف سے نفرت کو جز و فطرت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ معترضین کی اصولی غلط فہمی ہے۔ حامیان ضمیریت نے یہ کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ متعین مشخص افعال کے متعلق نفس بشری میں نفرت یا رغبت کی یکساں کیفیت پائی جاتی ہے، لیکن کا دعویٰ صرف اس قدر ہے کہ دنیا میں رذائل کی طرف سے نفرت اور فضائل و محاسن کی طرف رغبت ایک اجمالی طور پر سب انسانوں کے ذہن فطرۃً برابر درجہ کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ احساس ہر شخص کے دل میں فطرۃً موجود ہوتا ہے کہ انسانیت، ارحم و خدا ترسی قابل اختیار ہیں اور شقاوت، بیرحمی و بیدردی قابل ترک۔ رہا یہ کہ انسانیت و شقاوت کی تعریف کیا ہے؟ تو اس کا دار و مدار تمام تر سوسائٹی کے اثرات و تعلیم و تربیت پر ہے اور انہیں کے اقتضا سے ان کی تعریفات مختلف ممالک و مختلف زمانوں میں بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ خود اسی مسئلہ قتل انسانی کو لیجئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وحشی قبائل کا ذکر نہیں، اکثر اچھی خاصی متہد جماعت میں

بھی اپنے بعض بھجنوں کی خونریزی کا تماشہ دیکھنا ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا گیا ہے۔ رمیوں کو اپنے غلاموں اور سیافوں کی جان کی کچھ بھی پروا تھی؟ اہل یونان وحشیوں کے قتل و ہلاکت کو کچھ بھی معیوب سمجھتے تھے؟ اہل اسپین اپنی مفتوح امریکی قوموں کی زندگی ایک ذرہ برابر بھی عزیز رکھتے تھے؟ خود آج میلہ فاتح و قیس اپنے مقتوحوں کے ساتھ کیا سلوک رکھتی ہیں؟ ان سب چیزوں کو بھی جانے دیجئے۔ ایک بچہ کشی کی رسم کو لیجئے۔ کتنے ملک ایسے ہیں جو اس رسم سے بچے ہوئے ہیں؟ اور تو اور، تین سو سال اُدھر خود انگلستان کی اس باب میں کیا روش تھی؟ قدما میں نیک دل سے نیک دل رحیم سے رحیم اشخاص بلا تکلف سیانی اور دیگر خونریز مناظر کی سیر کرتے تھے۔ غرض یہ ایک سلم اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تفصیلات اخلاق کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ان اختلافات رواج سے حجت پکڑ کر ضمیریت پر اعتراض کرتا ہے، تو اس کا اعتراض تمام تر باور ہوا ہے۔ ضمیریت کی صحت کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ اگرچہ ہر ملک اور ہر زمانہ نے اپنے لئے ایک جداگانہ معیار اخلاق قرار دیا ہے تاہم اتنے جزو پر فروع انسانی ہمیشہ متفق رہی ہے کہ اصولی حیثیت سے اخلاق بد اخلاقی سے، نیکی بدی سے، اور خیر شر سے بہتر ہے۔ فلاطون، جو بچہ کشی کی تلقین کرتا تھا، اکیٹو جو اپنے ضعیف غلاموں کو فروخت کر داتا تھا، لیکن، جو ذوق و شوق کے ساتھ مناظر سیانی سے لطف اٹھاتا تھا، قدیم جسمل جو اسیران جنگ کو غلامی یا سیانی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے، موجودہ زمانہ کے جنرل جو اس طرز عمل کو وحشیانہ خیال کرتے ہیں، قدیم واضعان قانون جو نئے موت کے لئے طرح طرح کی ہولناک طریقہ جاری کرتے تھے، حال کے واضعان قانون جو سزا سے موت کو باہتمام آسان و سہل بناتے ہیں، قدیم استاد جو پاہیٹ کر پڑھاتے تھے، حال کے اُستاد جو سمجھا بھجا کر پڑھاتے ہیں، بڑے سے بڑے بیدار دشکاری اور رحم دل سے رحم دل اشخاص جو شکار کے خیال سے بھی لرزاتے ہیں، یا خونج حیوانا کے لئے آسان اور بے تکلیف طریقہ ایجاد کرنے میں مشغول رہتے ہیں، غرض یہ کہ تمام مختلف الرائے و مختلف الخیال اشخاص جو اپنے عقاید و اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں، اتنے جزو پر ہر حال بالکل متحد و ہم رائے ہیں کہ ظلم و شقاوت قابل نفرت اور انسانیت و

رسم قابل تحسین ہے۔

خیر یہ فقرہ معترضہ توضیہ کے مخالفین کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ مسیحیت کا شاید سب سے زیادہ روشن کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے نہ صرف عام طور پر لوگوں کو باہمی حسن سلوک کی تعلیم دی، بلکہ قتل انسانی کو ایک معصیت کبیرہ قرار دے کر دنیا کی تاریخ اخلاق میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں ہی سب سے بڑی بات یہ کہ حیات انسانی کے مفہوم سے اس نے حیات کے بالکل ابتدائی دور کو مستثنیٰ نہیں رکھا، بلکہ رحم مادر میں جس جس وقت سے نطفہ قرار پاتا ہے، اپنی وقت سے اُس نے اس پر زندگی کا اطلاق شروع کر دیا۔ قدامت کے نزدیک اسقاطِ حمل مطلقاً معیوب نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو یہ غلطی مسئلہ رائج تھا کہ حالت جنین میں زندگی نہیں ہوتی، دوسرے یہ بھی ایک بالکل قدرتی جذبہ ہے کہ جو بچہ جو ان آدمی کی موت سے اس کے اغوا و احباب کو ہوتا ہے، وہ ایک ایسی ہستی کی ہلاکت سے قطعاً ہمارے دل میں نہیں پیدا ہو سکتا جس کی طرف سے نہ ابھی ہمارے دل میں کچھ توقعات قائم ہوئی ہیں اور نہ جسے جان دینے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر قدامت کے نزدیک اسقاطِ بالکل جائز تھا۔ آرسطو نے اسے نہ صرف جائز قرار دیا، بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ جب ملک کی آبادی ایک خاص حد سے بڑھنے لگے، تو اس قاعدہ کو حکماً نافذ کرنا چاہئے۔ مصنف ہذا کے علم میں یونان و جمہوریتِ روم نے کبھی اسے ناجائز نہیں قرار دیا، لیکن اگر جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے، کسی زمانہ میں قانون نے اسے جرم قرار دیا ہی تھا، تو یہ قطعاً ہے کہ اس قانون کا نفاذ کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ متعدد مسیحی و مشرک مصنفین کی متفقہ شہادت ہے کہ یہ رسم اس زمانہ میں علانیہ و بالعموم جاری تھی۔ اس کے اسباب کیا ہوتے تھے؟ ایک افلاس، دوسرے حفظِ نفس کہ صل کے زمانہ میں مرد کی صحبت ترک کرنا ہوگی، اور تیسرے جسمانی زمینت و خود آرائی کا شوق کہ وضعِ حل و رضاعت سے عورت کے بعض اعضا میں شل سابق کے رعنائی و خوش نمائی نہیں باقی رہتی۔ یہ مصنفین اس والدہ کا ذکر غیر معمولی طرح و دستاویز کے ساتھ کرتے ہیں، جس نے کبھی اپنی اولادِ غیر مولود کو ہلاک نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج عام تھا، اور اس کی تعلیم کی بڑی دلیل تو یہی ہے

کہ حل کو نہ ٹھہرنے دینا۔ ایک مستقل پیشہ ہو گیا تا، بیسیوں عورتیں تھیں، جن کا ذریعہ معاش یہی تھا کہ مختلف تدابیر سے وہ حل نہ ٹھہرنے دیں اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ آؤڈ، سنیکا، جوئیل، ویلٹا مارک، گو اس کی تعلیم کی پوری شہادت دیتے ہیں، تاہم اسے معصیت بھی قرار دیتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت رومی اسے محبوب تو سمجھنے لگے تھے، لیکن اسے کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

مگر مسیحوں نے اپنی روش شروع ہی سے اس باب میں مختلف رکھی۔ اپنے لب و لہجہ میں نہایت شدت قطعیت کے ساتھ اور کج حال تو ارتداد استقلال انہوں نے ہمیشہ اس رسم کو نہ صرف قبیح و مذموم ظاہر کیا، بلکہ اسے صاف قتلِ عود کے مراد قرار دے دیا، اگر جاکی عمارت میں حصولِ تبرکات کے لئے داخلہ جن چند خاص حسبِ اہم کی شکل میں ممنوع قرار دیا گیا تھا، ان میں اسقاط کا جرم بچہ کشی کے مساوی رکھا گیا تھا، بلکہ شروع شروع اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں رکھا گیا تھا، اور یہ ایسا جرم مسترار دیا گیا تھا جو موت کے وقت تک کسی ریاضت کسی توبہ، کسی استغفار سے معجز نہیں ہو سکتا۔ اور گو اس سزا کی میعاد بعد کو گھٹا کر دس سال اور سات سال تک کر دی گئی، تاہم یہ جرم ہمیشہ بہ طورِ معصیت کبیرہ کے شمار ہوتا رہا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس خیال کی زیادہ تائید ایک ایسے عقیدہ سے ہوئی، جو پادریوں کے علمِ العقائد میں نہایت ہی محلِ عقیدہ ہے، مشرکوں اور اکیلی مشرکوں پر کیا موقوف ہے عام طور پر دنیا کے نزدیک اسقاط و بچہ کشی اگر جرایم ہیں، تو کسی بالغ جیسے جی انسان کے قتلِ عمدہ کے مقابلہ میں تو یہ یقیناً ہلکے ہیں، لیکن پادریوں کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے نزدیک بچہ کی جان ایک غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ ان کے عقیدہ کے بموجب جنین میں جو نفی روح پڑی، اُس پر آدم کے گناہ کی ذمہ داری، اور روزِ حشر کی مسئولیت عائد ہو جاتی تھی، اور اگر وہ قبلِ ولادت کے ہلاک ہو گیا، تو اُس کی روح یا تو (بہ قولِ کلیسائے یونان) ہمیشہ عالمِ برنخ میں پڑی رہے گی، اور یا (بہ قولِ کلیسائے رومہ کے) تعزیم میں ڈال دی جائے گی۔ یہ عقیدہ گو بجا سے خود مہمل ہے، تاہم انہوں میں بچہ کی زندگی کی عظمت و اہمیت پیدا کرنے میں یہ بڑی حد تک موثر ثابت ہوا، اور اسی کے اثر سے آج ہمارے دلوں میں بچہ کی زندگی کا وہ احترام قائم ہو گیا ہے، جسے کوئی اعتقادی تغیر کوئی مذہبی

تبدیلی کوئی تحول دین نہیں بدل سکتا۔ قرون اولیٰ وسطیٰ میں جو شے مسیحیوں میں اطفال کشی سے سب سے زیادہ روکتی تھی، وہ یہ خیال نہ تھا کہ بچہ بلاوجہ قتل و ہلاک کئے جا رہے ہیں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلا اصطلاح کے قتل کئے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ اسی زمانہ کے ایک شخص کا یہ افسانہ مشہور ہے کہ اُسے قبل ولادت بچہ کی حالت دیکھنے کا بہت شوق تھا، ایک دن اسی اضطراب شوق میں اُس نے ایک حاملہ عورت کو قتل کر ڈالا جس سے عورت اور بچہ دونوں مر گئے، اب ہوش درست ہوئی پرتشدد مات ہوئی، اور توبہ و استغفار کی نیت سے اُس نے ایک جنگل میں جا کر تنہا عبادت و ریاضت شروع کر دی۔ سالہا سال کی مشقت کے بعد ایک عدائے غیبی آئی، کہ ”عورت کے قتل کا حشر ہم معاف کر دیا گیا“ لیکن وہ مرتے مرتے مر گیا، مگر یہ عدائے کان میں کہی نہ آئی طفل غیر مولود کے قتل کا گناہ بھی بخش دیا گیا۔ اس افسانہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد غیر مولود کے قتل کا جرم کس قدر سنگین خیال کیا جاتا تھا۔

اسقاط کے بعد طفل کشی کا نمبر آتا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ تمدن قدیم کے دامن طفل کشی کا ایک سخت بدنامہ ہیہ ہے۔ اس دستور کی تاریخ کچھ عجیب سی ہے۔ وحشی، جن کے دماغ میں جذبہ رحم و خدا ترسی بالکل ابتدائی و ناقص حالت میں ہوتا ہے اور جن کا خانہ بدوشانہ طرز معاشرت بجائے خود اُن پر بچوں کی پرورش و پرداخت و بال کر دیتا ہے۔ اُن کے یہاں غالباً عام دستور یہ ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے پر والدین خود یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اُس زندہ رہنا چاہئے یا نہیں، اور اگر نفی میں فیصلہ ہوتا ہے، تو اُسے قتل کر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد تمدن کا جو درجہ آتا ہے، اس میں یہ دستور بہت ہلکا پڑ جاتا ہے، تاہم یہ نہ سمجھنا چاہئے، کہ مدارج تمدن کے ساتھ ساتھ یہ دستور بھی مٹ جاتا ہے۔ کیونکہ شایستگی پہلنے کے بعد یہ رواج از سر نو پھیلتا ہے گو اب اس کی محرک و حشیانہ متفاوت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ناجائز حظ نفسانی کی سعی اخفا ہوئی ہے۔ پھر بعض اقوام و ممالک میں یہ رواج یوں قائم ہو جاتا ہے کہ والدین اولاد کو اپنی عزیز ترین ملک سمجھ کر خدا کی راہ میں بہ طرہ قربانی کے نذر کر دیتے ہیں۔ خود یونان میں اگرچہ عملاً یہ رواج عام

طور پر جاری نہ ہوتا، بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ تھیس میں یہ جرم سزاے موت کا مستلزم تھا، تاہم علیٰ عموم یونان میں یہ اصولاً بالکل جائز تھا اور اصول افادہ کی بناء پر فلاطون و ارسطو، لائیکریس و سولن نے اسے قانوناً واجب کر دیا تھا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ آبادی جب ایک حد متعین سے بڑھ جائے گی، تو یقیناً ملک کی فلاح و بہبود پر مضر اثر ڈالے گی، خصوصاً اگر ملک میں زیادہ تعداد بیکار و معطل العضو اسرا د کی ہوئی تو صرف سچا ملک کو نقصان عظیم پہنچے گا۔ اس لئے یونانی قانون سازوں نے نصاب یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو مریض معطل العضو اطفال جماعت و ملک کے لئے بار ہوں انہیں بے تعلیق طریقہ سے ہلاک کر ڈالنا چاہئے۔ یہ حکم ملکی خیر اندیشی و مصلحت شناسی کی بناء پر تو تھا ہی، اس کو کچھ تقویت تو یونانی عیش پرستی سے پہنچی، جس کا یہ عالم تھا کہ کسی شوہر کو رضاعت وغیرہ کے زمانہ میں اپنی بیوی کی ہم بستری سے عرصہ تک محروم رہنا گوارا نہ تھا۔ اور کچھ اس کی یوں ہی تائید ہوئی کہ مائیں، جو باپوں کی بہ نسبت صغیر سن اطفال سے زیادہ محبت و الفت رکھتی ہیں، اپنے شوہروں پر اس قدر اثر ہی نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں اطفال کشی سے مانع آسکیں۔

رومانے قدیم میں والدین کو اپنی اولاد کی موت و زبست پر اختیار حاصل تھا۔ اس اختیار کی بناء پر قتل اطفال کا شمار بہت زیادہ بڑھ گیا ہوتا۔ لیکن اس کی روک تھام کے لئے ایک اور نہایت قدیم قانون رومولس کے وقت سے موجود تھا، جس کا منشا یہ تھا کہ والد پر اپنی تمام اولاد کو روکنا اور اولاد انات میں سب سے بڑی اولاد کو پرورش کرنا فرض ہے، اور کسی صحیح و سالم اولاد کو تا وقتیکہ اس کی عمر تین سال کی نہ ہو جاوے قتل نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ ناقص العضو اولاد کو اسکی ولادت کے وقت ہلاک کر سکتا ہے، مگر اپنے قریب ترین اعزہ میں سے پانچ آدمیوں کی منظوری کے بعد۔ روم کا اصل الاصول، بہ خلاف یونان کے آبادی کو محدود کرنا نہیں، بلکہ بڑھانا تھا۔ چنانچہ رومنہ میں اطفال کشی کی کہیں گرم بازاری نہیں ہوئی، بحسب اس زمانہ کے کہ جب سلطنت کے دور انحطاط میں نفس پرستی لے کر کی قید غالباً اس لئے تھی کہ اس اثنا میں والدین کو خواہ نہ خواہ بچہ سے محبت بڑھ جائیگی۔ اور تین برس کے بچے کو بچہ کی جان لینے ہوئے از خود وہ بچکھا بیٹھے

دشمنوں کی رانی کی عام ہوا چل گئی۔ مگر اس وقت بھی قانون سازانِ رومہ خاموش نہیں تھے بلکہ انہوں نے اسے سختی سے معیوب قرار دیا، اور بالواسطہ قوانین کی مدد سے اس کا انکار کرنا چاہا۔ مثلاً کثیر الاولاد اشخاص کو خاص حقوق و مراعات دیے، مفلس والدین پر ٹیکس بہت ہلکے رکھے اور لاوارث بچوں کی حفاظت کا بھی ایک حد تک سامان کیا عام رائے بھی اس دستور کو مستحسب مانہ سمجھتی تھی، چنانچہ عیسائیوں کے خلاف جو غلط الزامات لگائے جاتے تھے، منجملہ ان کے ایک لازم یہ بھی تھا۔ بائبل میں ہمہ سعی و مشترکانہ دونوں شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اطفال کشی کا دستور رومہ میں انحطاطِ سلطنت کے وقت عام طور پر رائج ہو گیا تھا، اور یہ قول ٹرنولین کے اس باب میں جو قوانین موجود تھے ان کی گرفت سے نہایت آسانی سے رہائی ہو جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں بچوں کی ہلاکت کے مختلف طریقہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں براہ راست قتل کر ڈالا، دوسرے یہ کہ انہیں خود قتل نہیں کیا بلکہ کسی سنان مقام پر جا کر تنہا چھوڑ آئے کہ وہیں پڑے پڑے ہلاک ہو جائیں۔ آخر الذکر جسمِ کبھی قانونی مواخذہ کے تحت میں نہیں آیا۔ چنانچہ یہ دستور نہایت کثرت کے ساتھ کھلے خزانہ جاری رہا، اور مفلس والدین کے لئے کوئی شخص اسے سنگین جرم نہیں خیال کرتا تھا۔ یہ متروک بچی بہت سے تو ہلاک ہو جاتے تھے، لیکن اکثر صورتوں میں یہ ہوتا تھا کہ لوگ انہیں اٹھا کر فروخت کر ڈالتے تھے، اور عموماً لڑکے غلامی کے لئے، اور لڑکیاں طوائف کے پیشہ کے لئے خرید لی جاتی تھیں۔

غرض اشاعتِ مسیحیت کے وقت اس خاص باب میں لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ معیوب ہے، البتہ اس جذبہ کو قوی کر کے اطفال کشی کو سخت ترین معصیت قرار دینے اور متروک اولاد کی حفاظت کے سامان کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مسیحیت نے یہ سب کچھ کیا۔ اُس نے سب سے پہلے پرزور طریقہ پر اطفال کشی کو معصیتِ کبیرہ ٹھہرایا، جیسا کہ صفحہ ۱۱۰ میں گزر چکا ہے، اور پھر لوگوں کی یہ بھی بتایا کہ متروک اولاد کو اجنبیوں کے رحم پر چھوڑ دینا بھی ایک طرح پر انہیں قتل ہی کرنا ہے۔ مسیحیت کا یہ اثر قانون میں بھی اپنی جھلک دکھانے لگا۔ روایت

ہے، لیکٹینٹس کے مشورہ سے قسطنطین نے اپنے سنہ اصطباغ ہی میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ نادار والدین کی اولاد کے کھانے پینے کا خرچہ سرکار کے ذمہ رہے گا۔ یہ قاعدہ آٹونائیس کے عہد حکومت میں بھی جاری رہا، لیکن قسطنطین نے اسے از سر نو باضابطہ صورت میں پہلے آٹلی میں جاری کیا، اور پھر ۱۸۳۲ء میں آفریقہ تک اسے وسیع کر دیا۔ ۱۸۳۹ء میں یہ قانون نافذ ہوا کہ والدین اپنی اولاد کو فروخت کرنے کے بعد پھر حقیت دے کر لے سکتے ہیں۔ ۱۸۳۶ء میں اس قانون کا نفاذ ہوا کہ متروک اولاد جب کسی شخص کی زیر پرورش آجائے، تو وہ اسی کی ملکیت جاتی ہے، وہ آسے جس پیشہ میں چاہے لگا دے، والدین کو اس پر کوئی حق باقی نہیں رہتا اور نہ وہ آسے واپس لے سکتے ہیں۔

گزیرہ آخر الذکر ہر دو قوانین صحیح معنی میں اصلاحی قوانین نہیں کہے جاسکتے، کیونکہ ان سے بہتر قوانین پیشتر سے موجود تھے، مثلاً ایک قدیم قانون مشرکوں کے زمانہ سے یہ چلا آتا تھا، کہ والدین جب چاہیں انہیں متروک والدین کو اجنبی مرتبوں اور آقاؤں سے قیمت دے کر بچہ واپس لے سکتے ہیں، بلکہ تیر سجن نے تو یہاں تک حکم جاری کر دیا تھا کہ اولاد متروک کسی صورت میں غلامی کے پیشہ میں نہیں لگائی جاسکتی۔ اس قانون کے مقابلہ میں قسطنطین کا ۱۸۳۳ء والا قانون، جس نے اولاد متروک کی دایمی غلامی پر مہر ثبت کر دی کسی طرح قابل ستائش نہیں کہا جاسکتا۔ یہ قانون، مغرب کی حکومت میں تو ہمیشہ جاری رہا، البتہ مشرق میں یہ ہوا کہ ۱۸۲۹ء میں جینیوا نے پھر مشرکوں کے قانون کی تجدید کر کے، غلامی کے پیشہ کو متروک اولاد کے لئے بالکل ناجائز کر دیا، یہی حال قسطنطین کے دو سرے قانون، یعنی ۱۸۳۷ء والے قانون کا ہے۔ کیونکہ متعدد مشرک تاجداروں بخصوص کر تیکلا نے آزاد بچوں کی تجارت کو بالکل منع کر دیا، اور ڈیو کلیٹن نے تو اس باب میں بہت سخت قوانین نافذ کر دیے تھے۔ البتہ قسطنطین کو اپنے قانون کے نفاذ کی ضرورت شاید اس لئے پیش آئی کہ خاک کی اندرونی لڑائیوں نے اس وقت صد ہا باشندوں کو بالکل نادار بنا

لے آٹونائیس کے نام کے دو مصلحین ہوئے ہیں۔ یہ ان کی جمع ہے

دیا تھا، اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ غلاموں کی تجارت کو از سر نو رواج دیا جائے۔ اسکے بعد کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ ہٹیو ڈو سیس اعظم نے یہ قانون نافذ کیا، کہ متروک اولاد کو والدین ان کے مرتبوں سے بلا قیمت دیے ہوئے واپس لے سکتے تھے، کیونکہ جتنے دن انہوں نے خدمت لی، یہ کافی معاوضہ ہو چکا۔ لیکن ویسینٹین سوم نے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ عملاً اولاد فروشی، باوجود پادریوں کے شور و غل کے، ہٹیو ڈو سیس کے بعد مدتوں جاری رہی اور کسی مسیحی فرماں روانے ڈایوکلٹس مشرک کے مفید و اصلاحی قانون کی تجدید نہ کی۔

اس طرح کے قوانین کا مقصد متروک اولاد کے تحفظ و بقا کے لئے سامان کرنا تھا، لیکن ان کے علاوہ بعض قوانین ایسے جاری کئے گئے، جس کا مقصد براہ راست اطفال کشی پر مواخذہ کرنا تھا، یہ قوانین کب اور کس طرح جاری ہوئے؟ یہ ایک بہت ہی بحث طلب و اختلاfi مسئلہ ہے لیکن اس قدر غالباً صحیح ہے کہ مشرک و اضعان قانون، اطفال کشی کو قتل عمد کی ایک قسم قرار دیتے تھے، گو اسے اس قدر سنگین نہیں خیال کرتے تھے جتنا کہ قتل عمد کی اور اقسام کو، چنانچہ اطفال کشی کی سزا، سزائے موت کی بجائے جلادطنی تھی قسطنطین نے ایک قانون کے ذریعہ سے جو شاید صرف آفریقہ کے لئے مخصوص تھا، جہاں بچہ اکثر زل کی نذر کر دیے جاتے تھے قتل اولاد کو قتل کی دفعہ میں کہا، ویسینٹین نے سترہویں صدی میں اسے قتل عمد کا جرم قرار دیا، اور متروک اولاد کے والدین پر خصوصیت کے ساتھ سختی کی۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسقاط و اطفال کشی کی سزا یہ نافذ ہوئی کہ یا مجرم کی آنکھیں نکال لی جائیں یا اسے قتل کر ڈالا جائے۔ شارلیمن نے اپنے عہد میں طفل کشی کو گھونرا سے موت رکھی۔

اب آج یہ متعین طور پر دریافت ہونا دشوار ہے کہ ان قوانین نے اطفال کشی کا کس حد تک انسداد کیا، تاہم مسیحیت کا اتنا اثر تو قطعی ہوا کہ متروک اولاد کی تجارت کا دروازہ بند ہو گیا اور دلوں میں طفل کشی کی اہمیت و خصوصیت پوری طرح جم گئی۔ اس جرم کے ارتکاب کا ایک بہت بڑا سبب والدین کا افلاس ہوتا تھا۔ مسیحیت نے اس کا بھی علاج کر دیا۔ صد ہا مسیحیوں نے فرائڈ

متروک اولاد کو اٹھا کر تعلیم و تربیت دی۔ اور چند صدیوں بعد یعنی سترہویں و اسی کی ابتداء میں اجتماع کوشش سے انہوں نے اس مقصد کے لئے پرورش گاہیں کھولنا شروع کر دیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک ایسی پرورش گاہ ٹریوس میں چھٹی صدی میں، اور انگریزوں میں ساتویں صدی میں کھلی تھی، اور آٹھویں صدی میں میلان میں ایک کا قیام ہونا تو یقینی طور پر ثابت ہے۔ نویں صدی میں روم کے پادریوں نے ایک صلائے عام دیا کہ جو بچے اپنے وضع محل کو مخفی رکھنا چاہتی ہیں، وہ گر جا کے دروازہ پر اپنی اولاد نو مولود کو چھوڑ جایا کریں کہ یہاں اُن کی پرورش ہو جائے گی۔ ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت غالباً گر جا کے خدام و غلاموں کے ساتھ ہوتی تھی، کیونکہ ایسی اولاد کو غلام بنانا گر جا کے نزدیک کچھ معیوب نہ تھا، جیسا کہ شارکین کے ایک قانون اور آریس کے پادریوں کی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلہ سے ظاہر ہے کلیسا نے عورت کی عصمت کو اُم القیاس خیال کیا، اس لئے اس قسم کی پرورش گاہوں میں خاطر خواہ سرعت کے ساتھ تربیتی نہ ہو سکی۔ خود روم میں، جو اس قسم کے خیرات خانوں کا مرکز تھا، اس قسم کی پرورش گاہ تیرہویں صدی سے پیشتر نہ قائم ہو سکی۔ اور بارہویں صدی کے وسط میں میلان والوں پر یہ ایک سخت الزام عاید کیا گیا، کہ وہ متروک اولاد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس صدی کے خاتمہ پر مونٹ پیلیئر کے ایک راہب نے روح القدس کے نام پر ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد بچوں کو تعلیم و تربیت دینا تھا۔ اس انجمن کی پندرہویں صدی تک مختلف شاخیں، تمام یورپ میں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ابتدائی مقاصد میں اگرچہ صرف جائز شاہدوں کی تیم اولاد کو تعلیم دلانا داخل تھا اور ناجائز بچوں کو یہ اپنے یہاں داخل کرنا حرام جانی تھی، تاہم کچھ عرصہ میں متروک اولاد کی تربیت و پرداخت عملاً اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ یہاں تک کہ بے انتہار ذوق کے بعد سینٹ نسیٹ فی پال آٹھ کھڑا ہوا، جس نے اپنے زور و قوت سے اس قسم کی پرورش گاہوں کے استحسان کو اصولاً و باضابطہ ہی منوالیا۔ ان کارروائیوں کے اجراء کے وقت اُن کے جواز و عدم جواز پر بڑے بڑے معرکے الار مباحث رہے۔ ایک فریق یہ کہتا تھا کہ اس طرح کی سہولتیں ہم پہنچا دینے سے بدچلنی

وجہ عجمتی کو اور تحریک ہوتی ہے، دوسرا اگر وہ اُس کے جواب میں قتل انسانی کی معصیت شدیدہ کو پیش کرتا تھا۔ ان مباحث کی تفصیل بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ان کے ذکر سے ہمیں صرف دکمانا یہ ہے کہ مسیحیوں نے اس کے لئے کتنے سامان کئے تھے۔ اور خواہ اُن کی رائے غلط ہو یا صحیح، بہر حال اُنہوں نے نفس انسانی کی عظمت کا جو نخل دنیا کے سامنے پیش کیا، اور حقیر سے حقیر حیات انسانی کا خواہ وہ غلام کی ہو، یا بچہ کی ہو، یا سیاف کی ہو یا پھر کسی مفتوح وحشی کی ہو، جو استرام دلوں میں بٹھایا، وہاں تک قدما و کلا تر فکر بھی نہیں پہنچا تھا۔ چنانچہ آج دنیا کی مختلف جماعتوں اور قوموں میں نفس انسانی کا جو شرف و احترام مسلم ہے، یہ اسی تعلیم مسیحیت کا پرتو ہے۔

اسقاط و طفل کشی کے انداد میں مسیحیت نے جو کوششیں کیں اُن کا ذکر گزر چکا۔ ان مسیحیوں کا فخر بجا ہے، لیکن بعض مرتبہ وہ اس فخر کو مبالغہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ میرے نزدیک مسیحیت کا اصلی پُر فخر کارنامہ جس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں یہ ہے کہ اُس نے مناظر سیافی کا خاتمہ کر کے دنیا کے سامنے نفس انسانی کے احترام کا عملی نمونہ پیش کیا۔ حقیقت، جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ مناظر خونریزی کس طرح رومی زندگی و رومی تمدن کے اجزائے غیر منفک بن گئے تھے، اور کس طرح بہتر سے بہتر باشندگان رومہ اس کے متعلق چشم پوشی سے کام لیتے تھے جب جا کر کلیسا کی اصلاح کی پوری اہمیت گھلتی ہے اور پہر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر حکماء و مشرکین شاؤنا در کبھی ان رسوم کے خلاف آواز بلند کرتے بھی تھے، تو محض فلسفیانہ حیثیت سے اور صرف اس قدر کہ بنائے پر قانع ہو جاتے تھے کہ یہ تماشے اخلاق شکن، خلاف انسانیت و وحشیانہ ہیں بہ خلاف اس کے مسیحیوں نے اس کی روک تھام بالکل مذہبی پیرایہ میں کی۔ وہ صرف اسے غیر محمود کہنے پر قانع نہیں ہوئے، بلکہ اُنہوں نے اسے متعین طور پر قتل عمد کے درجہ میں رکھا جس کے لئے قاتل اور تاشائی دونوں روزِ مشر قابل مواخذہ ہوں گے۔ خیال کیجئے، تو یہ بہت بڑا فرق تھا۔

اس دستور کے انداد کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ مشرک حکومت کے دورِ آخر میں بڑی بڑی

عظیم الشان سببات گاہیں برابر تیار ہو رہی تھیں۔ بلکہ خود قسطنطین نے اپنے زمانہ تک بیسیوں جیوشی قیدیوں کو جھگی درندوں سے لڑنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ سب سے پہلے ۳۲۵ء میں نائیس کے پادریوں کے دارالشوریٰ کے اجلاس کے بعد، مسیحی فرماں روا کے حکم سے قلم در دومہ میں ستیانی کی مخالفت کا فرمان جاری ہوا۔ اول اول اس حکم کا نفاذ صرف بیروت (شام) بلکہ شاید اُسکے صوبہ فینیقیہ تک محدود رہا، اور یہاں ہی اس پر عمل درآمد واجبی ہی واجبی ہوا۔ اور معسرتی مالک میں تو یہ تماشے کھلم کھلا جاری رہے۔ ۳۳۵ء میں قسطنطین نے خدام محل شاہی کو سب ستیانیوں کی صف میں داخل ہونے سے منع کیا۔ ۳۳۶ء میں ولینٹینین نے یہ حکم نافذ کیا کہ کوئی مسیحی مجرم ستیانی پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہنوریس نے امراء کے غلاموں کو ستیانی کا ہمیشہ اختیار کرنے کی مخالفت کی گو اس سے اہل مدعا یہ تھا کہ ستیانی کو روکنا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ امراء کے پاس مسلح رفقانہ رہ سکیں۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ یہ دستور ابھی نئے دارالسلطنت قسطنطنیہ میں نہیں داخل ہوئے پایا۔ خاص شہر دومہ میں یہ رواج گو کم ہو چلا تھا، تاہم تا وقتیکہ قانون نے اس کا قطعی استیصال نہیں کر دیا، یہ رواج بالکل اٹھا نہیں۔ قدیم مشرکانہ تمدن کا روشن ترین پہلو، مذہبی آزادی و رواداری اور تاریک ترین رخ بھی شوق ستیانی تھا، لیکن انوس سے کمنا پڑے گا کہ مسیحی حکومت نے آتے ہی آتے روشن پہلو کو مٹایا، اور تاریک پہلو کو کچھ عرصہ تک برقرار رکھا، چنانچہ تھیوڈوسیوس عظمیٰ جو بالکل پادریوں کے ہاتھ میں تھا، اور جس نے مذہبی رواداری کا خاتمہ کر دیا تھا، اُسے مشرکوں میں مقبولیت محض اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ اُس نے وحشی قیدیوں کو ستیانی پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہے کہ ۳۳۵ء و ۳۳۶ء میں بلکہ ہنوریس کے زمانہ میں ہی ستیانی کی نمائشیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، اور قیدیوں کو اکھاڑے میں اتارنے کا دستور تو بہت بعد تک قائم رہا۔

لیکن اگرچہ خود دارالحکومت میں مناظر ستیانی کا سدباب، مسیحی حکومت کے ۴۰ سال تک نہیں ہوا، تاہم اس باب میں مسیحیت و مشرکیت کی جو تعلیمات تھیں، ان کے درمیان زمین آسمان

کافرق تھا۔ بت پرستوں کے بہتر سلاطین اور بڑے سے بڑے حکماء میں سے (بجز جولین کی استثنائی مثال کے) کبھی کسی نے اس سے تعرض نہ کیا، بہ خلافت اس کے مسیحوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے سیافوں کو بتسمہ دینے سے انکار کر دیا تھا، تاوقتیکہ وہ اپنے اس پیشہ سے توبہ نہ کریں، اور جو شخص مسیحی ہو کر اس کا تماشہ دیکھنے جاتا، وہ گر جا میں حصول تبرکات سے محروم کر دیا جاتا۔ اُن کے مصنفین و واعظین نے اس کے خلاف روز و رات سے جہاد شروع کر دیا تھا، اور پروڈنشیس شاعر نے براہ راست شہنشاہ کو مخاطب کر کے اس دستور کے انسداد کے لئے التجا کی مشرق میں یہ دستور شروع ہی سے کمزور تھا، اور تھوڈویس کے زمانہ میں بالکل بند ہو گیا اور اس کی جگہ گاڑی دوڑنے لے لی۔ مغرب میں اس دستور کی زندگی کی آخری تاریخ سنہ ۶۰۶ء تھا، اور جبکہ شہر روم میں تھویرس کے عہد میں یہ تماشہ ایک بار ہو رہا تھا، کہ ایک ایشیائی راہب دفعۃً اکھاڑہ میں کود پڑا اور فریقین کو چھڑانا چاہا، اس پر خلعت اتنی برفروختہ ہوئی کہ اُس نے راہب پر پتھر برسانا شروع کئے اور اسی پتھروں میں وہ غریب شہید ہو گیا۔ لیکن اس کی شہادت سے بعد کو لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ دستور ہی مٹ گیا۔ درندوں سے مقابلہ اب بھی جاری رہا، خصوصاً مشرق میں۔ لیکن افلاس اور درندوں کی کمیابی سے رفتہ رفتہ یہ دستور بھی مٹ گیا۔ اب اس کی جگہ کھیلوں اور بازیوں، ”لے لی“، جو گوجوانات کے لئے سخت ظالمانہ تھے، تاہم انسان کو ان سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر ساتویں صدی کے خاتمہ پر یہ ”بازیاں“ بھی موقوف کر دی گئیں۔ اٹلی میں مصنوعی جنگ کا جو خونی دستور تھا، اور جو قرون وسطیٰ میں برابرقائم رہا، اُس کی بنا بھی سیافانہ اکھاڑہ کی روایات پر تھی۔

غرض سیانی کا استیصال یقیناً ایک ایسا موضوع ہے، جس کا ذکر مسیحی اثرات کے ذیل میں، مورخ پورے فخر کے ساتھ کر سکتا ہے۔ نہایت نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اس قدر خونریزی کو مٹا دیا۔ بلکہ لوگوں کے دلوں سے بیدردی، شقاوت و قسادت کو نکال کر انسانیت کا معیار نہایت بلند کر دیا، اور یہ ایسی بڑی کامیابی تھی، جس کی توقع بہ داوید رخا واقعات نہ

مشرک نہ تمدن و شایستگی سے کی جاسکتی تھی، اور نہ مشرکانہ فلسفہ سے بلکہ اُس کی جڑ رومی سرزمین میں ایسی مضبوط ہو گئی تھی کہ اس زمانہ میں اگر شمال کے فاتحین اُٹلی پر حاکم ہو جاتے، تو وہ بھی اس دستور کو اختیار کر لیتے، پھر یہ دستور یورپ میں برابر قدون وسطیٰ میں قائم رہتا، اور اس طرح انسانیت و تمدن کی ترقی ایک مدت غیر محدود تک کی ہوئی رہتی۔ یہ صرف مسیحیت ہی میں قوت تھی کہ اُس نے راستہ سے اس بہاری پتھر کو ہٹا دیا، اس کا میابی کا سہرا مسیحیت اور صرف مسیحیت کے لئے لکھ کر مشرک اُمراء و رؤسا و اپنی وفات کے وقت بڑے بڑے ترکہ ستیا فوں کے لئے چھوڑ جاتے تھے، تاکہ اس سہرا یہ سے اُن کی یادگار میں ستیانی کے جشن منائے جائیں مسیحیت نے اگر یہ بتایا کہ ترکہ فقرا و مساکین دامل حاجت کے لئے ہے، اور اس طرح ہی ستیانی کے مٹانے میں بالواسطہ معین ہوئی اسی طرح دھمبہ کا مہینہ جو ان ظالمانہ تماشوں کے لئے مخصوص تھا، اُس میں مسیحیت نے بہ کمال دانشمندی ایک دوسرا جشن، یعنی ولادت مسیح، رکھ دیا۔

مسیحیت نے نجات انسانی کے شرف و احترام کا جو اعلیٰ ترین تخیل پیش کیا تھا، اس پر بعض دفعہ مسیحی اس تخیل سے عملدرآمد کرتے تھے کہ کبھی کبھی قوی آزادی دہلی قوانین سے ان کا خیال بالکل بکرا جاتا تھا ان کا اصل الاصول یہ تھا کہ کسی سچی کو دوسرے کی جان لینے میں معین نہ ہونا چاہئے، اور اس اصول نے مختلف تشکیلات اختیار کی تھیں، مثلاً یہ کہ کسی عیسائی کو فوج میں نہ داخل ہونا چاہئے یا یہ کہ جلاوی کا پیشہ نہ اختیار کرنا چاہئے۔ یا پھر یہ کہ کسی شخص پر ایسا جرم نہ عاید کرنا چاہئے جس کی سزا موت ہو۔ ان میں سے امر اول کی بابت کسی دوسری فصل میں ذکر آئیگا، البتہ امر دوم و سوم کی بابت یہاں دو لفظوں میں مختصراً بیان کئے دیتے ہیں، قتل خواہ وہ بالکل جائز و قانون کے حکم ہی سے کیوں نہ ہو، ہمیشہ سے معیوب سمجھا گیا ہے، اور جلاوی کا پیشہ ابتداء سے مذموم و ذلیل رہا، چنانچہ یونان و رومہ میں قانوناً جلاووں کو شہر کی چار دیواری سے باہر رہنے کا حکم تھا، اور روڈس میں انہیں شہر میں داخلہ کی ممانعت تھی۔ یہ خیال مسیحیت نے اپنی ابتدائی زندگی میں بالکل جذب کر لیا اور یہ حکم دیا کہ جو شخص اپنے ہاتھ خون میں رنگے گا، عام اس سے کہ وہ فرمانروا سے وقت ہی ہو،

جسے حمایت حق میں تو اڑکھینچی پڑی ہو، جب تک کفارہ نہ دے لیگا، گرجا کے حصول تبرکات سے محروم رکھا جائیگا۔ ابتدائی تین صدیوں تک مسیحی ملکی و سیاسی مصالح سے مستغنی، اس خیال پر بالکل بچے رہے، لیکن چوتھی صدی میں جب کلیسا کو دنیوی اقتدار بھی حاصل ہو چلا، تو اس خیال میں لامحالہ ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اگرچہ لیکٹینٹس اب تک تمام خونریزی کو ناجائز قرار دیتا رہا، تاہم یہ اسے بالافتاق قرار پاگئی کہ پادریوں و راہبوں کے لئے کسی پرہیزگارے موت کا جسم عاید کرنا جائز نہیں۔ پادریوں کی استثنائی حیثیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ ملزموں کے شفیع و سفارش کنندہ بن کر مختلف درباروں اور عدالتوں میں جاتے تھے اور جب کبھی ان کے شہریا قرب و جوار میں کسی جسم یا بغاوت کے انتقام میں سخت خونریزی کا احتمال ہوتا، تو اہل شہر ان سے سفارشیں اسواتے اگلے زمانہ میں سلاطین کے مجسمہ اور مشرکوں کے معابد خاص حرمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، یعنی جو ملزم ان سے جا کر چمٹ جاتا، وہ قانون کی گرفت سے بچ جاتا، اب یہی حرمت گرجوں کو بھی حاصل ہو گئی۔ ایسٹروغیرہ مسیحی ایام عید میں بھی ملزموں پر مقدمہ چلانا یا انہیں ہزارے موت دینا ناجائز ہو گیا۔ اور روایت ہے کہ ملزموں کی بے گناہی و معصومیت کی شہادت میں بارہا معجزات صادر ہوئے گو کسی ملزم کے ثبوت جرم میں کبھی کوئی معجزہ نہیں سرزد ہوا۔

اس صورت حال سے جو اثرات پیدا ہوئے، انہوں نے بڑی وسعت حاصل کی، اور بہت دوز دور تک پہلے۔ از آنجملہ یہ کہ

(۱) عام اذہان میں رحم دور گزر کے تصور نے ایک خاص تقدس و الوہیت کا مرتبہ حاصل کر لیا، اور حیات انسانی کے احترام میں روز بروز مبالغہ ہوتا گیا۔

(۲) پادری و اہل کلیسا، اپنی شدید قیدیوں کے زمانہ میں بھی خونریزی سے بھجکتے رہے۔ کفار و ملحدہ پر یہ اور ہر طسح کی سختیاں روا رکھتے تھے۔ جائداد ضبط کرتے تھے، قید میں رکھتے تھے، جلا وطن کراتے تھے، حرمت اسے کا بالکل سد باب کر دیا تھا یہ سب کچھ تھا، لیکن

قتل کی سزا دینے میں بے حد تامل و پس و پیش کرتے تھے۔ چنانچہ خود سینٹ آگسٹائن، سینٹ ایمروز، سینٹ مارٹن، جو اختلاف عقائد پر سخت سے سخت تشدد کو جائز رکھتے تھے، تاہم ان کو بھی کبھی سزا سے قتل کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ جن لوگوں نے ایسا کیا، ان پر انہوں نے سخت ملامت کی۔

(۳) ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جب پادریوں نے دیکھا کہ قتل و خونریزی کے بغیر کام نہیں چلتا، اور قتل جائز نہیں، تو گلے طرح کی حیلہ تراشی، تاویل بازی کرنے۔ مثلاً ایک حکم یہ دیا کہ ملاحہ کے خون کا قطرہ زمین پر بھی نہ گرنا چاہئے، لہذا انہیں زندہ جلادینا چاہئے! حیلہ تراشی کی یہ مثال دنیا کی تاریخ میں کچھ انوکھی نہیں۔ اس کی اور نظیریں بھی موجود ہیں، پلوٹارک نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں پاک کنواریوں پر جب بد چلنی کا جرم ثابت ہوتا تھا، تو چونکہ ان پر تلوار اٹھانا منع ہے اس لئے زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ یا ایک اور فرقہ ہوا ہے جسکے نزدیک تلوار کھینچنا ناجائز تھا، لہذا وہ لوگ بد عقیدگی کے مجرموں کو لوہے کے گرزوں سے مار ڈالتے تھے۔ قتل و خونریزی سے پادریوں کا اس زمانہ میں یہ تباہ، اگرچہ حیرت انگیز ہے، خصوصاً اس خیال سے کہ کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھ خوب ہی خون میں رنگے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس رحم و درافت، عفو و درگزر کے زمانہ میں ہی ملک کے ضابطہ تعزیرات میں کچھ اصلاح نہ ہوئی، قوانین مروجہ میں جو کچھ اصلاح ہوئی وہ روایت کے اثر سے مشرک مقنین کے زمانہ میں ہوئی، اور اس باب میں مسیحیت کا کوئی بھی کارنامہ واقع نہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تہود و وسوسہ بنسٹین کی زمانہ میں ضابطہ تعزیرات پر نظر ثانی ہوئی۔ اور انہیں زیادہ مضبوط بنایا گیا، لیکن عدالت و مساوات قانونی کے اصول اساسی سب ہیڈرین و اسکندر سورس کے عہد میں منقح ہو چکے تھے مسیحیوں نے اس میں کچھ اضافہ کر دیا، وہ بھی بہت قلیل و غیر اہم۔ درحقیقت فلسفہ روایت کے لئے یہ امر بس کرتا ہے کہ اُس نے جو کام چند سال میں انجام دیدیا، مسیحیت اپنی صدیوں کے اقتدار و عروج کے باوجود بھی اس کی برابر ہی نہ کر سکی۔ یہ سچ ہے، کہ قسطنطین نے اپنے زمانہ میں یہ قوانین نافذ

کے کہ مجرموں کے چہرہ کو داغانہ جائے، انہیں سستیانی کا پیشہ اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جائے اور انہیں سولی نہ دی جائے (سولی کی سزا اس زمانہ میں سخت ذلیل و حقیر آمیز خیال کی جاتی تھی) لیکن اس نرمی کی کسر مسیحی حکمرانوں کی اُس سختی نے نکال لی تھی جس کے ساتھ وہ طفل کشی، زنا، زنا بچہ وغیرہ کی سزائیں دیئے تھے۔ کس قدر فسوس کی بات ہے کہ تھیوڈوئیس کے نظام قانون میں جو دفعہ سب سے زیادہ قطعی طور پر رکھ دیا کے اثر سے رکھی گئی، وہ کوئی اصلاحی دفعہ نہیں، بلکہ وہ ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اہل کلیسا ایک مخصوص و محترم طائفہ غالبیہ ہیں اور جو شخص کتھیولک عقاید سے ذرا بھی منحرف ہے، وہ گردن زدنی اور مستحقِ صد ہزار تعزیر ہے۔

خیر۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ چوتھا اور سب سے آخری اور سب سے اہم نتیجہ، حیات بشری کے اس تقدس کا یہ ہوا کہ خود کشی، انتہائی ملامت کی مورد مستہار پائی۔ یہ ہم کہیں پہلے کہ آئے ہیں کہ مشرکوں کے یہاں جب کسی خود کشی کے خلاف صدا بلند ہوتی ہے، تو حسب ذیل اسباب اربعہ میں سے کسی کی بنا پر۔

(۱) قینا خورث و قلاطون کا مذہبی استدلال کہ تمام انسان خدا کے سپاہی ہیں۔ پس اپنی جگہ کو بغیر حکم بادی چھوڑ دینا گویا اس سے بغاوت کرنا ہے۔

(۲) ارسطو و یونانی و اصنعان قانون کا سیاسی استدلال کہ تمام انسان حکومت کے خدام ہوتے ہیں پس قتل نفس کے یہ معنی ہوئے ہیں کہ ہم نے اپنی خدمت اہل سے منہ موڑ لیا۔

(۳) پلوٹارک کا نفسیاتی استدلال کہ خود کشی بزدلی کا نتیجہ ہے، اور اس لئے انسان کی فطرت شجاعت کے شایان شان نہیں۔

دہم، اشرافین جدید کا فلسفیانہ استدلال کہ ہر طرح کی حرکت افساد روح کا باعث ہوتی ہے اور خود کشی ہی ایک حرکت ہے۔

قدما کے استدلال کا خلاصہ تمام تر یہ تھا۔ ان میں سے آخر الذکر کی تو مسیحیت میں گنجائش ہی نہیں مل سکتی تھی۔ استدلال (۳) کی بنا انسان کی فطری مردانگی و شجاعت پر تھی اور یہ مسیحیت

کے اس تخیل سے ٹکرانی تھی جو اُس نے انسان کے انکسار و فروتنی سے مطلق قایم کیا تھا گو کہا یہ بھی جاتا تھا کہ تخیل شاید اپنے تئیں ہلاک کر لینے سے زیادہ مردانگی کا مظہر ہے۔ رہا استدلال (۲) سو وہ بھی ایک بڑی حد تک مسیحیت کے منافی تھا۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو راہبانہ زندگی خاک میں ملی جاتی تھی، حالانکہ اس زمانہ میں مسیحیت کی جان رہبانیت تھی۔ پھر اس کے معنی یہ بھی تھے کہ انسان میں وطنیت پیدا ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ اسے مسیحیت روا نہیں رکھ سکتی تھی موجودہ حکماء اخلاق کے پاس خود کشی کی مبالغت میں بڑی مضبوط دلیل یہ ہے کہ اس سے نظام خاندان کی برہمی کا اندیشہ ہے۔ لیکن اس زمانہ کے مسیحین و مشرکین دونوں اس اصول سے نا آشنا تھے۔ مسیحی تو اس لئے کہ ان کے اخلاق و فلسفہ اخلاق کی بنیاد کبیر عالم آخرت کی جزا و سزا پر تھی اور کسی دنیوی محرک کو ان کے نظام اخلاق میں دخل نہ تھا اور مشرک اس لئے کہ وہ افسر خاندان کو صرف حاکم سمجھتے تھے اور اس کے ذمہ فرائض مطلق نہیں قرار دیتے تھے۔ اب صرف فینا غورث و فلاطون کا استدلال (۱) باقی رہا۔ یہ البتہ مسیحی معتقدات سے بالکل مل جل گیا اپنی تکالیف میں خدا سے استعانت کرنا، مصائب میں اسی کی ذات کا بھروسہ رکھنا، یہ خیال ایسا تھا جو مسیحی دماغ کو خاص طور پر پسند ہوا۔ خود کشی میں ایک بات یہ بھی ہے کہ گونہ شدت معصیت میں اور معاصی اس سے بڑھ چڑھ کے ہوں تاہم خدا پر بے اعتمادی و بے اطمینانی جیسی اس فعل سے ظاہر ہوتی ہے اور کسی سے نہیں ہوتی۔

اس عام محرک کے علاوہ اساطین مسیحیت نے اپنی تعلیمات میں ترغیب و ترہیب کے چند اور عناصر کا بھی اضافہ کر دیا، جنہوں نے خود کشی کی طرف سے نفس بشری کو اور روک دیا، انہوں نے ایک طرف تو یہ کیا کہ انسان کو خود کشی پر اُسی قدر مجرم قرار دیا جس قدر کہ کسی دوسرے کے قتل پر۔ اور خود کشی کرنے والے شخص کی روح کو طرح طرح کے عذاب کی وعیدوں سے ڈرایا اور دوسری طرف خدا پر اعتماد و اطمینان اور رضا و توکل کے جذبہ کو انتہائی قوت دی۔ آخرت میں صابرین و شاکرین کو طرح طرح کے انعام کی چاٹ دلائی اور دنیوی تکالیف کو گناہوں کا کفارہ

بتایا۔ ان سب کا مجموعی اثر یہ پڑا کہ یاس و فطوط کی وہ کیفیت جو انسان کے آنکھوں میں دنیا تار کیا کر دیتی ہے اور اُسے خود کشی پر آمادہ کر دیتی ہے، بڑے سے بڑے مصیبت زدہ شخص کے دل سے بھی مٹا دی۔ قدیم فلسفہ کی یہ کرامت تھی کہ اُس نے تکلیف کی مذمومت و قباحیت کو دلوں سے مٹا دیا تھا، لیکن مسیحیت کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے تکلیف کو انسان کے لئے خونگوار بنا دیا۔

مگر مسیحیت کا یہ عام کلیہ بھی استثناء سے خالی نہ تھا۔ کلیسا نے خود کشی کو دو صورتوں میں جائز رکھا، یا کم از کم ان کے متعلق سکوت سے کام لیا۔ پہلی صورت تو شہداء سے متعلق تھی۔ اس عقیدہ کے جوش میں کہ شہادت فوراً تمام پچھلے گناہوں کو دھو دیتی ہے، بخود ہو کر صدا پر جوش مسیحی مشرک حکام کے سامنے دوڑ جاتے تھے اور ان سے التجا کر کر کے اپنے تئیں شہید کر لیتے تھے اور بعض بزرگان کلیسا نے اس طرز عمل کا امتحان کیا ہے۔ ایک صورت جواز خود کشی کی یہ ہوئی۔ دوسری صورت اس سے زیادہ اہم و بحث طلب یہ تھی کہ دوشیزہ مسیحی لڑکیوں کی عصمت پر جب دھبہ آنے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟ بے عصمتی کو گوارا کرنا چاہئے یا اپنی جان دیدنا چاہئے؟ سینٹ پلیمیا ایک پانزدہ سالہ لڑکی تھی جس کی تعریف میں سینٹ ایمبروز سینٹ کریزوٹم طب اللسان ہیں اُسے ایک مرتبہ سپاہیوں نے پکڑ کر اپنی شہوت رانی کا آلہ بنا چاہا۔ اُس وقت اُس نے کہا کہ ”میں اپنے کمرہ میں جا کر اچھی طرح پوشاک پہن لوں، تب آتی ہوں“ یہ لکھو وہ گئی اور مکان کی چھت سے اپنے تئیں نیچے گرا کر ہلاک کر ڈالا۔ اسی طرح انطیوخ میں ایک مسیحی خاتون ڈومینیا نامی رہتی تھی جس کی دو لڑکیاں نہایت حسین و نہایت باعصمت تھیں۔ وہ ڈیول کلیٹن کے زمانہ تعدی میں گرفتار ہوئیں اور جس وقت انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ ان کی عصمت خطرہ میں ہے ان تینوں نے راستہ میں دریا میں گر کے جان دیدی۔ یا پھر اسی طرح ظالم و جابر میکرتینس، بروم کے اسقف اعظم کی حسین بوی پر عاشق ہو گیا اور جب اور سب تدبیریں ناکام رہیں تو زبردستی کرنا چاہی۔ خدام شاہی اُسے اس کے مکان سے اڑا لائے۔ اُس وقت اُس نے ایک علیحدہ کمرہ میں ایک منٹ کے جانے کی مہلت مانگی اور وہاں جا کر بہ کمال مردانگی اپنے سینہ میں خنجر

بھونک لیا۔ آج کل کے مناظرہ پسند پادری جو کچھ کہیں واقعہ یہ ہے کہ قدیم مورخین کلیسا ان حالات کو انتہائی ملح و ستایش کے ساتھ لکھتے ہیں۔

کلیسا کے ابتدائی دور میں کسی حد تک صریح طور پر خود کشی کی اسی صورت کو جواز کا فتویٰ ملا تھا۔ چنانچہ سینٹ ایمر دز نے دینی زبان سے اور سینٹ جیروم نے کلمہ لکھا اس کی ملح سزائی کی ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس مسئلہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی اس کا جواز مشتبہ ہونے لگا تا آنکہ سینٹ آگسٹائن نے اپنے مبسوط رسالہ میں یہ فیصلہ کر دیا کہ حفظ عصمت کے لئے جان دیدینا ہے تو بے شبہ بڑی ہمت و جواغروی کا کام، تاہم اس سے اس کی مجرا حیثیت زایل نہیں ہو جاتی۔ اس قول فضیل کو تقریباً سارے کیتھولک کلیسا نے تسلیم کر لیا اور اس پر اجماع ہو گیا کہ پتھریا و ڈومینیا کے افعال کسی خاص الامام کی تعمیل میں تھے غرض کلیسا کے دور ابتدائی میں اصول اگر خود کشی کی کوئی صورت جائز تھی تو وہ صرف یہی تھی اور اس کے سوا تمام صورتیں قطعاً ناجائز تھیں لیکن انسان بھی عجب متناقض الخیال ہستی ہے۔ ایک طرف تو براہ راست و فوری خود کشی پر یہ لعنت ملاست تھی اور دوسری طرف اس طرز زندگی پر جو آہستہ آہستہ خود کشی کی طرف لہجائی ہے چاروں طرف سے تحین و آفرین ہوتی تھی۔ سینٹ جیروم نے اس سلسلہ میں ایک نوعمر راہبہ بنیکسلا کی عجیب داستان بیان کی ہے۔ یہ خاتون اس جرم کی مرتکب ہوئی جسے چوتھی صدی عیسوی میں لوگ تعیش سے موسوم کرتے تھے یعنی اس نے اپنی شادی کر لی۔ مگر سات ہی مہینہ کے بعد بیوہ ہو گئی اور اس طرح بقول اہل کلیسا کے ”دوشیزگی کے ثواب اور ازدواج کی لذت دونوں سے محروم ہو گئی“ اسی زمانہ میں ہیماہ پری اور ہباری نے اس میں مذہبیت کا غیر معمولی جوش پیدا کر دیا اپنی عمر کے بیسویں سال ایک خانقاہ میں بیٹھ کر اُس نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی اور مذہبیت میں اسے استغذر غلو حاصل کیا کہ اب اسے جو کچھ رنج و صدمہ تباہ و شوہر کی وفات کا نہ تھا بلکہ اس امر کا تھا کہ اس کی دوشیزگی غارت ہو گئی۔ کثرت و وزہ داری و فاقہ کشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ نوجوانی ہی میں زندگی حسم ہو گئی۔ اہل شہر کو جب اس کی موت کے پہلی سبب کی اطلاع ہوئی اور اس

کی ماں کا ناقابل برداشت صدمہ دیکھا تو اہل شہر سخت برہم و متاسف ہوئے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے جنازہ پرجوم کر کے چلانا شروع کر دیا کہ ”مردود را ہوں کا گروہ یا شہر خالی کر دے یا اسے سنگسار یا غرق کر دیا جائے“ یہ خیال عوام کا تھا مگر اہل کلیسا کا نہ تھا۔ وہ اس تیرجی و غیر محسوس خودکشی پر اظہار نیرازی کرنا کیسا اس سے اور خوش ہوتے تھے اور قرون اولیٰ و وسطیٰ کے راہبوں کی بابت جو روایات مشہور ہیں اگر ان کا عشر عشر ہی صحیح مان لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے شمار انسانوں نے اپنے ہاتھ اپنی زندگیوں کا یوں خاتمہ کر لیا تھا سینٹ فرانسس ایسیسی جو اسی رہبانیت کا شہید ہے اس کی بابت یہ منقول ہے کہ اُس نے اپنی موت کے قریب اپنے لاغر جسم کی طرف دیکھ کر کہا کہ ”میں نے حقوق العباد میں اپنے ہی جیسے بندے گدھے کے ساتھ ادا سے حق میں کمی کی ہے“ اس کے بعد اس پر حالت کشف طاری ہوئی جس میں اُس نے دیکھا کہ وہ شب کی نماز میں مشغول ہے اور ہاتھ غیب اُس سے کہہ رہا ہے کہ ”فرانسس دنیا میں کوئی گنہگار ایسا نہیں ہے جسے مسیح پر ایمان لے آئے کے بعد خدا نہ بخشے گا۔ البتہ وہ شخص جو اپنے تئیں استہلاک ریاضت میں گرفتار رکھتا ہے عذاب دائمی کا مستحق ہوگا“ فرانسس جب چوکا تو اس نے کہا کہ یہ صداے ربانی نہ تھی صداے شیطانی تھی۔

اس تیرجی خودکشی کو تو انسان کی تناقض خیالی نے جائز رکھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ کلیسا نے خودکشی کے صریح طریقوں کا اپنے حدود کے اندر بالکل سدباب کر دیا۔ لیکن اہل اعتزال نے اسے جائز رکھا اور نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس پر عمل درآمد بھی کرتے رہے مثلاً چوتھی صدی میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس کے افراد جو جوق مشرکوں کے معابد و مجالس میں جا جا کر قصد ان کی توہین کرتے اور اس کی پاداش میں قتل پر قتل ہوتے چلے جاتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ہزاروں پر چڑھ کر نیچے کودتے اور ان مرنے والوں کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی کہ تشیب کی دادیاں خون سے سرخ ہو جاتیں۔ اس سے صدیوں بعد ایک فرقہ اوزکلا جس کا اصول یہ تھا کہ مملک امراض میں گرفتار ہو کر یہ لوگ فاقہ کشی کر کر کے یا فصد کھلا کھلا کر

موت کے بلائے میں عجلت کرتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں یہود نے کیتھولک عیسائیوں کے
 مظالم سے تنگ آکر جو خودکشی شروع کر دی اُن کا شمار سب سے زیادہ ہے۔ فرانس میں
 ۱۹۹۵ء میں ہزار یہود نے مسیحی عقوبتوں سے بچنے کے لئے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا۔ صرف
 بمقام بایگ ایک موقع پر ۵۰۰ یہود خود اپنے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اسی طرح ۱۳۳۷ء میں بھی ایک
 محاصرہ کے موقع پر اُن کے خودکشیوں کی تعداد اتنی ہی تھی۔ اس باب میں مشرکوں کا جو قدیم قانون
 نامہ تو یہود و مسیحین کے قانون میں بہستور قائم رہا۔ البتہ پانچویں صدی میں پادریوں کی
 کونسل نے یہ فیصلہ شائع کیا کہ خودکشی ایک شیطانی عمل ہے۔ چھٹی صدی میں دوسری کونسل نے یہ
 فتویٰ صادر کیا کہ خودکشی کرنے والا حرام موت مرتا ہے اس کی لاشیں پر نہ نماز جنازہ جائز ہے اور
 نہ اس کی قبر پر فاتحہ خوانی۔ یہ اور اسی طرح کے اور فیصلے جو متعدد کونسلین کے بعد دیئے گئے
 ہیں بالآخر شارلین اور وحشی فاتحین کے ضابطہ تفریبات کا جزو بن گئے۔ سینٹ لوئس نے یہ بات
 نکالی کہ حرام موت مرنے والے کی ساری املاک جایداوسرکار میں ضبط ہونا چاہئے۔ رفتہ رفتہ ایسے
 شخص کی نفس کی بے حرمتی ہونے لگی۔ کہیں لوگ اُسے گلی گلی گھسیٹتے پھرتے تھے، کہیں اُسے اُلٹا
 لٹکا دیتے تھے، کہیں اُسے فریڈبول و برازیں ڈال دیتے تھے اور کہیں اُس میں آگ لگا دیتی تھی۔
 ان یہودہ و نفرت انگیز طریقوں پر زور دینے کا اور خصوصاً اس نا انصافی کا کہ مرنے والے
 کے ورثہ اربے بقصور جا بجا دوسے محروم کر دیے جاتے تھے، لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارہویں صدی میں
 رد عمل کا آغاز زوروں سے ہوا۔ خودکشی کی اخلاقی حیثیت سے ایک معصیت کبیرہ ہونے میں تو
 کوئی شبہ ہی نہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایسا جرم نہیں جس میں سرکار کی مداخلت جائز ہو خصوصاً
 وہ حکومتیں جو اپنی رعایا کو اس کی پوری آزادی دیے ہوئے ہیں کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر جس ملک
 میں چاہیں جا کر آباد ہو جائیں، کیا حق رکھتی ہیں کسی شخص کو ترک دنیا سے روکنے کا؟ بائیں ہمہ میرے
 نزدیک یہ قول صحیح نہیں کہ قرون وسطیٰ کے قوانین مذکورہ بالا نفرت انگیز ہونے کے ساتھ ناکام ہی
 رہے۔ ناکام وہ ہرگز نہیں رہے۔ خودکشی کے مرکب عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عقل ضعیف

اور تخیلہ قوی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں کہ ان پر دہشت و ہیبت طاری کر دی جائے۔ باقی کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو خوب سوچ سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کو بھی اس سے باز رکھنے کا یہ نہایت پُر اثر طریقہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے اعتقاد و پس ماندگان کو ہر طرح کی ذلت اور مالی و جسمانی نقصانات کا سامنا کرنا ہوگا۔ قانون کے نفاذ کے جاری رہنے سے یہ تصور معلوم ہوتا ہے کہ خود کشیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا تاہم اس میں شبہ نہیں کہ کیتھولک دائرہ کے اندر اس کا ارتکاب صدیوں تک شاذ و نادر الوقوع رہا۔ البتہ اسپین میں گو تھک سلطنت کے آخری و پُر آشوب زمانہ میں اس کا زور ہوا علیٰ ہذا انگلستان میں ساتویں و چودھویں صدی میں جب دبا و طاعون پھیلی ہے یا پھر اسی طرح جب ہندوستان نے ہزار ہا بیویوں کو ان کے راہب شوہروں سے علیحدہ کر دیا ہے تو ان میں سے بھی بہتوں نے اپنے ہاتھوں اپنے تئیں حسم کر ڈالا۔ طبقہ اُناتھ میں خود کشی اور ہی شاذ تھی۔ بلکہ ایک فاضل مورخ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بجز انڈس کی ایک نو عمر خاتون کے جو اپنے شوہر سے عرصہ دراز سے جدا تھی اور جو اپنی طبیعت کو اب قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی اور اس خیال سے خود کشی کر لی تھی، کئی صدیوں تک اور کوئی مثال خود کشی کی نہیں ملتی۔ خائفانہوں میں خود کشی کا ایک محرک بھی ہوتا تھا کہ اکثر راہب جب یہ دیکھتے تھے کہ لڑاؤ دینوی اب ان کے ترک کئے نہیں ترک ہوتے ہیں یا جذبات و شہوات پر انہیں قابو نہیں چل ہوتا یا وہ سادس شیطانی سے نجات نہیں لیتی تو ان سب حالتوں میں مایوسی کا علاج وہ خود کشی ہی کو قرار دیتے تھے بعض مثالیں گو وہ اب شاذ ہیں اس کی بھی ہیں کہ محبت میں ناکامی یا شدت رہبانیت کا پیدائشہ احتمال اس بھی خود کشی کا باعث ہوا ہے۔ لیکن یہ جنسیت مجموعی یہ کہنا بالکل قرین صحت ہے کہ خائفانہوں نے مایوسیوں اور شکستہ خاطرہوں کو اپنے سایہ عاطفت میں پناہ دے کر زیادہ جانیں بچائیں، بہ مقابلہ اس کے کہ لیں کلیسا کی اس تعلیم کی اس کی دیگر تعلیمات کی طرح، اسلام نے بھی تعلیم کی، اور نہ صرف تعلیم کی بلکہ اس میں خاص غور سے کام لیا۔ چنانچہ خود کشی کی صریح ممانعت کا حکم انجیل میں نہیں بلکہ

قرآن میں ہے اور مسیحیت نے جو توکل و رضا کی تعلیم دی تھی اُسے اسلام نے مبالغہ کر کے جبریت و تقہیر پرستی تک پہنچا دیا اسلام و مسیحیت کی متحدہ کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ متمدن و شایستہ دنیا میں صدیوں تک کسی نے خود کشی کا نام بھی نہیں سنا جب ہم مسیحیت کے اس کارنامہ کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ یاد کرتے ہیں کہ یونان و رومہ کی دنیا سے متمدن میں یہ رواج کس قدر عام تھا، اور دھماکے سے لیکر اسپین تک کے غیر متمدن قبائل میں یہ وبا کس قدر عالمگیر تھی تو بے شبہ ہم اس کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسیحیت کا اثر تاریخ اخلاق پر کیسا عمیق و وسیع و مفید پڑا ہے۔

اس افسوسناک رواج کی تیاری کے آخری ابواب ابھی ذکر کرنے سے رہ گئے۔ جہلا کینسہ کی تحریک سے یورپ میں خود کشیوں کی تعداد میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ اب کیتھولک و پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں میں وہ مذہبی جذبات پوری طرح پیدا ہو گئے تھے جو خود کشی کے موافق ثابت ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس کا زور یورپ میں نہیں بلکہ امریکا میں متاوجہ ابھی نیا دریافت ہوا تاسپین والوں نے یہاں کو باشندوں کو فوج کر کے یہ کیا کہ ان کو اپنا غلام بنانے لگے اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑنا شروع کئے۔ اس پرفتوحوں نے ہی انتہائے مظلومیت میں خود کشی کا طریقہ اختیار کیا کہ اس سے کم از کم وہ عقوبتوں سے توبہ جحائیں گے۔ ہزار ہا امریکی باشندے اس طرح خود اپنے ملک الموت ثابت ہوئے تا آنکہ اسپین والوں نے اپنی چالاکی سے انہیں یہ یقین دلایا کہ انہیں مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہیں ملے گی کیونکہ یہی اپنی آقا آسمان پر بھی موجود ہونگے اور وہاں بھی انہیں غلامی پر مجبور کریں گے۔ یورپ میں اس زمانہ میں اگر یہ دستور کسی فرقہ میں رائج نہ تھا تو جادوگرانیوں میں۔ یہ بد نصیب لاغر اندام و ضعیف العقل عورتیں جن کی ساری عمر عموماً نکاح لیلیف و مصائب میں گزرتی اور جنہیں نہ آخرت میں کسی چین و آرام کی توقع ہوتی اکثر ہجوم یاس و قنوط میں اپنے تئیں ہلاک کر ڈالتیں۔ ایک فریج جج کا بیان ہے کہ صرف اس کے علم میں ایک سال کے اندر پندرہ سارہ عورتوں نے خود کشی کی۔ اس طرح کے واقعات کے اسباب عموماً خوف و دہشت و انتقام حواس ملتے ہیں لیکن اکثر ایسا بھی ہوا کیا ہے کہ خون

خودکشی کی دباہوئی ہے حال میں ماریٹلز و آئیونس کی عورتوں میں اور قدیم زمانہ میں فلسطین کی عورتوں میں دفعہ اس دباکا پھوٹنا اسی کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح پندرہویں صدی کے خاتمہ سے لیکر سترہویں صدی کے خاتمہ تک بعض ضلع میں یہ جنون جاری رہا کہ ہزار ہا آدمی سمندر کی طرف جوق جوق جاتے تھے اور دُور سے اُس کی لہریں دیکھ کر دفعہ بے اختیار اس کی طرف فرما سرت سے گاتے ہوئے دوڑتے اور جا کر اُس میں کود پڑتے۔ خیر ان واقعات کا ذکر تو ہم نے یونہی ہی پیش کیا تھا۔ ان کی اصل جگہ تاریخ امراض دماغی ہے۔ تاریخ اخلاق نہیں۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ بعض نو مسلم ایسے ہی جمع ہو گئے۔ جنہوں نے اس بخونانہ خودکشی کی میں بلکہ دیدہ و دانستہ خودکشی کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ یونانی و رومی لٹریچر کی طرف جو تازہ توجہ ہوئی اُس نے اس مبحث کو خصوصیت کے ساتھ منظر عام پر لا کر اُکھایا۔ اب کیتھولک مونائیں اور ان کے بعد گروتھس و ہینڈلوف کے اتباع نے یہ کمنا شروع کر دیا کہ خودکشی بعض صورتوں میں جائز ہے مثلاً گناہ یا غش سے بچنے کے لئے، اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے یا اس قیدی کو جو جانا ہو کہ اسے سخت عقوبتوں سے ہلاک کیا جائے گا۔ یا پھر اس قیدی کے لئے جو جانا ہے کہ جو ننگ دہاڑا رہا ہے اُس میں خود اُس کی جان جانا یقینی ہے۔ اس زمانہ کی خودکشیوں میں مشرکانہ خودکشیوں کے اثر کی جھلک صاف نظر آرہی ہے۔ چنانچہ فلپ اسٹروزی پر جب الگنڈراؤل کے قتل کا جرم عاید ہوا ہے تو اس خوف سے کہ کہیں تشدد و عقوبت کی تاب نہ لا کر وہ اپنے رفقاء کا نام ظاہر کر دے۔ اُس نے خودکشی کر لی اور ایک خط اس مضمون کا لکھ کر پھوڑے گیا کہ میں اپنی روح خدا کے سپرد کر رہا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر میرا مرتبہ اور زیادہ بلند نہ ہو تو کم از کم وہ درجہ تو ضرور عطا ہو جو کیتھو و دیگر قدیم خودکشیوں کو عطا ہوا تھا۔ یہ حال تو عام یورپ کا تھا۔ خود انگلستان میں یہ رواج سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی کے ابتدا میں نسبتاً اور زیادہ عام تھا بلکہ اس کی تائید میں رسالہ تک لکھے گئے۔ سرتاس مور نے اپنی کتاب میں جہاں ایک بے عیب جمہوریت کا موقع کھینچا ہے، وہاں ایک منظر یہ دکھایا ہے کہ لاعلاج مریضوں کو حکام دیادری بہ خوشی خودکشی

کی اجازت دے رہے ہیں البتہ جو لوگ بغیر حصول اجازت اپنے تئیں ہلاک کر رہے ہیں ان کی تجویز و تکفین ناجائز ہے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ڈون نے بھی جو سینٹ پال کے گرجا کے متولی تھے، ایک عالمانہ مگر مغلق رسالہ خود کشی کی تائید میں لکھا اور مرتے وقت اپنے بیٹے سے یہ وصیت کی کہ اسے بچنبہ اسی حالت پر رہنے دیا جائے اور نہ شائع کیا جائے نہ ضائع کیا جائے۔ لیکن بیٹے نے باپ کی وصیت کے ایک ٹکڑے کو نہ مانا اور رسالہ شائع کر دیا۔ دو تین انگریز خود کشوں نے بھی اپنے پیچھے اپنے فعل کی حمایت میں رسالے چھوڑے علیٰ ہذا ایک باشندہ سویڈن نے جس کا نام روبک تھا رسالہ میں اپنے تئیں غرق کر کے جان دی اور آئندہ سال خود کشی کی تائید میں اس کا رسالہ شائع ہوا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن ان سب سے بڑھ چڑھ کر اور سب سے زیادہ موثر فریج حکماء انقلابین کی تحریریں ثابت ہوئیں۔ مانیٹن اصولاً تو خود کشی کو جائز نہیں ٹھہراتا، البتہ قدیم خود کشوں کی طرح و تائیس میں نہایت رطب اللسان نظر آتا ہے۔ مانشکیو نے اپنی نو عمری میں ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اس کی پر زور حمایت کی۔ روشو کا طرز عمل اس باب میں درحقیقت عجیب و غریب رہا ہے اُس نے دو رسالہ اس موضوع پر لکھے ہیں پہلے میں خود سے خود کشی کی تائید کی ہے اور دوسرے میں خود ہی اپنے سابقہ دلائل کی تردید کی ہے، انہیں پر فریب بتایا ہے اس عمل کو فرض شناسی کے نقطہ خیال سے انتہائی غدارانہ و خود غرضی کا نمونہ بتایا ہے اور جو لوگ اس کی طرف میلان رکھتے ہیں انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ رفاہ عام کے کسی کام میں اپنی طبیعت کو مشغول کر لیں۔ والٹیر اپنے بہترین کلام میں مخصوص حالات میں اسے جائز سمجھتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ملاحظہ میں بہت مقبول ہوا اور ہو لیک و ڈمی لینڈس اس کی تائید پر زور دے کر بے لگتہ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ کچھ تو اخطا طہ بہت کے اثر سے کچھ طبائع میں عموماً نرمی و لینت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر کچھ اس باعث بھی کہ لوگوں کو اب قانونی مداخلت کے صحیح حد و نظر آنے لگے تھے خود کشی کے خلاف جو سخت قوانین نافذ تھے ان کی مخالفت میں عمل

شروع ہوا اگر دشمن نے ان کی تائید کی تھی۔ نائیکو نے ان کی پُر زور تردید کی گواہی میں مل سکا یہ جوش کسی قدر مدہم ہو گیا تھا۔ بیکار یا نے جسے جماعت حامیان رد عمل کا اہلی نہایت کہنا چاہتے۔ ان قوانین کی دو باتوں کی بنا پر مخالفت کی ایک تو اس لئے کہ یہ بے تصور اعتقاد و پس ماندگان کے حق میں نامنصفانہ ہیں، دوسرے اس لئے کہ جو شخص خود کشی کا تہیہ کر چکا ہو یہ اُسے اس قصد سے باز رکھنے کے لئے بالکل ناکافی ہوتے ہیں یہ جماعت فوراً کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ ہم پاتے ہیں کہ مسلمانوں میں جبکہ یہ جماعت اپنے شباب پر تھی خاص پیرس کی گلیوں میں ایک خود کش بوریٹر کی لاش بہ کمال بے حرمتی کھینچی گئی۔ اور پُرانے قوانین برابر جاری رہے تا آنکہ مسلمانوں میں انقلاب عظیم برپا ہوا جس نے ان قوانین کو منسوخ کر دیا اور جس نے جہاں رعایا کو اور ہر قسم کی آزادی دلائی وہاں اسے حریت موت بھی عطا کی۔ انقلاب کے زمانہ میں جہاں اور شے میں ہیجان و تلاطم برپا ہو گیا وہاں خود کشی کرنے والوں کی تعداد بھی کئی گنی بڑھ گئی اور جوں جوں اس عام طوفان میں سکون پیدا ہوتا گیا خود کشیوں کی رفتار بھی اپنے معمولی درجہ پر آگئی لیکن وہ قوانین جو ایک مرتبہ منسوخ ہو گئے تھے پھر دوبارہ نافذ نہ ہو سکے۔ چنانچہ فرانس میں اب تک اس بارہ میں کوئی قانون نہیں۔ دوسرے ممالک میں جہاں ایسے قوانین ہیں ان کا مقصد ہی محض اس قدر ہے کہ حرام موت مرنے والے کی لاش پر مذہبی مراسم نہ ادا کئے جائیں۔ خود انگلستان میں لاش کی بے حرمتی و تذلیل کے قوانین جاریہ چارم کے عہد میں منسوخ ہوئے۔ لیکن یہ ظالمانہ و فحش اب تک یہاں کے قانون میں درج ہے کہ خود کشی کرنے والے کی ساری جائیداد سرکار میں ضبط ہو جائے گی۔ گو یہ ضرور ہے کہ جمہور کا رجحان عام اس قانون پر عمل درآمد بالکل نہیں ہونے دیتا۔

مسیحی دنیا کے احساس عام نے البتہ اس نقطہ نظر کا کسی قدر کفارہ کر دیا ہے جس سے متعلین مسیحیت اس فعل کو دیکھتے تھے، گو اسی کے ساتھ اُس نے قدیم سختیوں کو نرم کر دیا ہے اور قدیم طرز استہلال کو متروک کر دیا ہے۔ اس میدان میں ایک خاص کارنامہ میڈوم ڈی اسٹیل

کا ہے۔ اس فریخ ادیبہ نے اپنی ایک ابتدائی تصنیف متعلق بہ جذبات میں خودکشی کے فعل کو سراہا تھا۔ لیکن آگے چلکر اس نے اس خاص موضوع پر ایک نہایت فلسفیانہ سنجیدہ و عمیق رسالہ لکھا جس نے انقلاب کی پیدا کردہ تحریک اخلاق کی ایک تعمیری شکل پیدا کر دی۔ اس نے ان تمام قدیم مسئلہ کو ترک کر دیا کہ خودکشی ایک طرح کا قتلِ عمدہ ہے یا یہ کہ یہ اہم اجر ایم ہے یا یہ کہ نامردی و بزدلی کی دلیل ہے۔ اُس نے مذہبی تخیلیت و ترہیب اور عالمِ آخرت کی وعیدوں سے بھی بالکل قطع نظر کر کے یہ بتایا ہے کہ ایک بااخلاق شخص کو کن شرائط کا جامع ہونا چاہئے۔ اور یہ شرائط کیونکر اُسے خودکشی سے مانع ثابت ہوں گے۔ اُس نے نہایت موثر و دل نشین پیرایہ میں یہ دکھایا ہے کہ انسان جن چیزوں کو مصائب و آلام سمجھتا ہے وہ درحقیقت اس کی اصلاح سیرت و تزکیہ طلاق میں نہایت معین ہوتے ہیں نیز یہ کہ تسلیم و رضا کی خود انا اور شدید پر تحمل و صبر کرنا انسان کا بزرگ ترین منصب اور لازمہ اصلاح اخلاق ہے۔ اس کے بعد وہ تفصیل کے ساتھ انجیل کی تعلیمات پر نظر کر کے بتاتی ہے کہ انسان کی عظمت و شرافت کا اہلی معیار اس کی عدم خود غرضی اور دوسروں کی بھی خواہی ہے۔ شہادت و خودکشی میں موازنہ کر کے وہ دکھاتی ہے کہ اول الذکر نام ہر فرض کی قربان گاہ پر جان دینے کا اور آخر الذکر کہتے ہیں حالات غیر مساعد کے مقابلہ سے اکتا کر جان سے گزر جانے کو اور اس بنا پر وہ کیٹو کی خودکشی کو خودکشی کے مخالفین و موافقین دونوں کے علی الرغم شہادت سے تعبیر کرتی ہے کہ اس سے مقصود دوسروں کی بھلائی تھی۔ پس ایک نیک بااخلاق و پاکباز شخص کا مطمح نظر دوسروں کی نفع رسانی ہونا چاہئے، اسی غرض کے لئے اُسے زندہ رہنا چاہئے اس مقصد کے پیچھے اُسے اپنی ہر طرح کی لذات و مسرت میں ایثار سے کام لینا چاہئے اور اسی خاطر اُسے زندگی کے بار کو برداشت کرتے رہنا چاہئے خواہ وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس طرح کے جذباتِ مسیحیت کی وساطت سے یورپ میں معاشرت کے خمیر میں داخل ہو گئے ہیں اور ہمارے زمانہ میں خودکشی تمام تر نتیجہ رہ گئی ہے یا تو جنون کا یا اور ایسے دماغی امراض

کا جن سے انسان کا توازن ذہنی قائم نہیں رہتا اور یا پھر یاس و فطو طے اُس جھوم کا جس میں اُمید بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر میرے نزدیک اُن لوگوں کی مسرت زیادہ حق بجانب نہیں جو واقعات خود کشی کی کمی پر مسرور ہو رہے ہیں کیونکہ اعدا و کی شہادت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جو اقوام علمی و تمدنی حیثیت سے جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں سببیت و ان میں خود کشیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ ایک آدھ جگہ شدید مذہبیت نے اسے ذرا دبائے رکھا ہے لیکن مختلف ممالک، مختلف اقوام، مختلف ازمہ اور ایک ملک کے مختلف ضلعوں اور ایک ہی ضلع کے شہر و دیہات کی حالات کے موازنہ سے اس کلمہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کے اسباب میرے نزدیک متعدد ہیں۔ مثلاً یہ کہ

- (۱) دماغی مشاغل عموماً جنون و امراض دماغی کی پیدائش میں معین ہوتے ہیں۔
- (۲) متمدن ملکوں میں خود کشی کے ہر واقعہ کو جو شہرت دی جاتی ہے۔ اس سے ضعیف الدماغ افراد میں خواہ مخواہ ریس اور تقلید کی تحریک ہوتی ہے۔
- (۳) متمدن ممالک میں جس طرح دولت و ثروت کی فراوانی ہوتی ہے۔ اسی طرح افلاس و فلاکت کی بھی شدت ہوتی ہے۔ تجارتی کشمکش، کاروباری مقابلہ و مسابقت جس طرح دفعۃً پست کو بلند کرتا ہے۔ اُسی طرح ایک بیک بلند کو پست بھی کر دیتا ہے۔
- (۴) پہلے جو چیزیں تکلف و آرائش میں شامل ہوتی ہیں، تمدن انہیں ضروریات میں داخل کر دیتا ہے اور اس لئے انسان اُن کے فقدان کا صدمہ دل سے محسوس کریتا ہے۔
- (۵) مختلف سہولتیں اور نرا کتیں پیدا ہو جانے سے متمدن قوم کا ہر فرد ایسی ایسی خیالی و فرضی تکالیف کا شکار رہتا ہے جن کی طرف غیر متمدن افراد کا وہم و گمان ہی نہیں جاتا۔
- (۶) مذہبی بے اعتنائی، تشکیک و دہریت کے پھیل جانے سے دل سے وہ دہشت مٹ جاتی ہے جو خود کشی کی بڑی روک رہتی ہے۔

(۷) رشک و مبالغت ترفع و تحریت اور عدم قناعت کے جذبات جو لوازم تمدن ہیں رضا و تسلیم کے دشمن ہیں اور اس لئے قدرتی طور پر خود کشی کی تحریک میں معین ہوتے ہیں۔

فصل (۳)

مسیحیت کا دوسرا سبق: اخوت انسانی

مسیحیت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے حیات بشری کا احترام قائم کیا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ نوع انسان میں مساوات و اخوت پہیلانی۔ پہلے کا ذکر پہلی فصل میں گزر چکا دوسرا کا بیان اب کرتے ہیں اور اس سلسلہ کا آغاز عنوان غلامی سے کرتے ہیں۔

مشرکوں کے زمانہ میں غلاموں کی جو حالت تھی اُس سے ناظرین روشناس ہو چکے ہیں مختصر یہ کہ غلامی اس وقت پوری طرح جائز تھی گو سینکا و دیگر حکماء اخلاق نے شد و مد سے مساوات انسانی کی تعلیم دی تھی اور یہ آواز بلند کیا تھا کہ آقا و غلام کی تفریق محض سطحی و غیر حقیقی ہے۔ اور آقا کو غلام کے ساتھ پوری انسانیت سے پیش آتے رہنا چاہئے یہ تو نظری تلقین تھی، عملی زندگی میں ظلم و ثقاوت اور رحم و راحت دونوں کی کافی نظیریں ملتی ہیں۔ منظام کے انسداد کے لئے ہمدیرین، انطونیوں، اور الگز نڈر سیورس کے زمانہ میں قوانین پاس ہوئے تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ آقا کو غلام کی جان پر کوئی اختیار نہیں اور غلام کشی اسی قدر قابل نفرت ہے جتنا کہ قتل عمد ہوتا ہے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ مقنن پارٹی نے اس میں یہ شاخ نکال کے کہ جرم قتل عمد کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہلاکت کی نیت ہی ہو اور اس لئے غلام اگر سزا پانے کے دو چار روز بعد مرے تو مالک سے باز پرس نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی نیت ہلاکت کی نہیں ثابت ہوئی۔ آقاؤں کو بڑی آزادی دے دی تھی، لیکن اس آزادی کی تحدید ان قوانین سے ہو گئی تھی جن کا منشاء غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور ضلالتی زندگیوں کی ممانعت تھی۔

قانونی حیثیت سے اس باب میں قسطنطین کے قبول مسیحیت سے دو سو سال تک رفتار اصلاح بہت ہی سست رہی مسیحی فرماں رواؤں نے دو مرتبہ یعنی ۱۱۱۸ء و ۱۱۷۹ء میں اس طرف توجہ کی، لیکن قدامت جو کچھ کہہ کئے گئے تھے، اُس سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے قوانین کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آقا فلاں فلاں طریقہ پر تعذیب کرے اور اُس میں غلام مر جائے تو آقا پر قتلِ عام کا جرم عاید ہوتا ہے لیکن اگر سزا دی کا مقصد محض تادیب و تنبیہ ہو اور تعزیر معمولی قسم کی جو جس سے غلام مر جائے تو اس میں آقا بالکل بے قصور ہے اور اس پر کسی طرح کا جرم نہیں عاید ہوتا۔ بعض شارحین اس قانون کا یہ منشا سمجھتے ہیں کہ صرف مناسب و تادیبی سزاؤں کی اجازت تھی مثلاً سزائے تازیانہ، یا سزائے قید، لیکن میرے نزدیک اس قانون کی تعبیر صحیح نہیں حقیقت اس میں تا وقتیکہ غلام ہلاک نہ ہو جائے کسی طریقہ تعذیب و عقوبت کی ممانعت نہ تھی اور نہ آقا پر کسی طرح کی گرفت تھی۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کو یہودیوں کے اس قانون سے پورا توار دو توافق حاصل ہے کہ غلام اگر آقا کی تعذیب سے فوراً نہ مرے بلکہ دو ایک دن کے وقفہ کے بعد مرے تو آقا سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں ہو سکتا۔

غلامی کا دستور جس زمانہ میں بت پرستی سے منتقل ہو کر مسیحیت میں آیا ہے اس میں یہ دو نقائص انتہا درجہ کے شدید تھے، ایک یہ کہ غلاموں کے ازدواج کا کوئی قانونی جواز نہ تھا، دوسرے یہ کہ آقا کو اب تک تعذیب و عقوبت کا پورا حق حاصل تھا جیستینین سے قبل مسیحی سلطان نے ان نقائص کے دور کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی اور زمانہ کاری کی روک تھام کے لئے جو کارروائیاں جاری تھیں غلام ان سے اس بنا پر محروم رکھے گئے کہ "ان کی سبقت انہیں حدود قانون کے اندر لانے کی روا دار نہیں ہو سکتی" البتہ ایک قانون کی رو سے غلاموں کو سولی دینے اور قسطنطین کے ایک رجیمانہ قانون کی مطابق اُن کے اہل خاندان کے کچا نہ رکھنے کا دستور اٹھ گیا تھا۔ ایک اور قانون ان سے زیادہ اہم یہ منظور ہوا کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک کارِ ثواب ہے اور توار کے روزِ گر جائیں پورے رسمِ ادا کی جا سکتی ہے۔ بعض احکام ایسے

بھی جاری کئے گئے جن کی بنا پر یہودی آقاؤں کے مسیحی غلاموں کو آزادی حاصل ہو گئی اور دو چار بار غلاموں کو بطور رشوت کے آزادی دی گئی تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے جرائم کی تجزیر کریں۔ غلاموں اور آزادوں کے درمیان ازدواج قطعاً ممنوع تھا۔ اور اگر کسی آزاد عورت اور غلام سے آشنائی پائی جاتی تو عورت قتل کر ڈالی جاتی اور غلام زندہ جلادیا جاتا مشرکانہ قوانین میں عورت کا مرتبہ غلاموں کے مساوی تھا اور غلامان مغرور کے لئے بڑی سخت سزائیں تھیں۔

مسیحی قانون نے بت پرستوں کے قانون پر شروع شروع کچھ اصلاح ضرور کی، لیکن یہ ایسی اصلاح ایسی نہ تھی جیسی بعض متاخرین مسیحی مصنفین مبالغہ آمیزی سے بیان کرتے ہیں۔ مسیحیت نے اپنے وجود کے دو سو سال بعد تک جو کچھ اصلاحیں کی اُن کا حاصل یہ تھا کہ تعین و عقوبت میں کسی قدر نرمی کر دی گئی اور غلاموں کو آزادی دلانے میں کچھ سہولتیں پیدا کر دی گئیں۔ لیکن انہیں کے پہلو بہ پہلو اس باب میں بہت سخت قوانین نافذ کر دیے گئے کہ کوئی غلام اپنے آقا کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکے۔ بلکہ گریشٹین کے زمانہ میں تو یہ قانون پاس ہو گیا کہ جو غلام جبراً کسی غدار یا بغاوت کے اور کسی قسم کا استفادہ اپنے آقا کے خلاف عدالت میں لایا گیا وہ بلا اس استفادہ کی تحقیقات کے زندہ جلادیا جاوے گا۔

یہ حالت دو صدیوں تک رہی۔ اس کے بعد جینیٹین کے زمانہ میں البتہ نئے اور اہم قوانین پاس ہوئے اور یہ بے شبہ اصلاحات سے صحیح طور پر موسوم کئے جاسکتے ہیں۔ اس کی اصلاحات تین عنوانات کے تحت میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں جینیٹین رکاوٹیں تھیں اُس نے انہیں دور کر دیا۔ بلکہ لوگوں کو اس کا ثواب کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا اور کلیسا کو اس باب میں خاص اختیارات دیے۔ دوسرے یہ کہ آزاد شدہ غلاموں کو پورے وہی حقوق دیدیے جو معمولاً آزاد شہریوں کو حاصل تھے یہ درحقیقت بہت بڑی اصلاح تھی۔ اس کے بموجب یہ ایک مغرور خاتون کے لئے بالکل جائز ہو گیا کہ آج ایک غلام کو

آزاد کرے اور کل ہی اس کے ساتھ شادی کر لے۔ وقس علیٰ ہذا۔ تیسرے یہ کہ اب غلام کے لئے بالکل جائز قرار پایا کہ وہ اپنے آقا کی اجازت سے کسی آزاد عورت سے شادی کر سکتا ہے اور اس کی غلامی کے زمانہ کی جو اولاد ہو وہ اس کی آزاد ہی پا جائے پراس کی وارث جائز ہو سکتی ہے۔ لونڈیوں کے ساتھ زنا کاری بھی اب ویسا ہی جرم قرار پائی جیسا کہ آزاد عورتوں کے ساتھ یعنی دونوں کی سزا سزا سے موت ہو گئی۔

یہ اصلاحات قانونی اگرچہ بجائے خود نہایت اہم تھیں تاہم مسیحیت کا اصلی کارنامہ اس باب میں ان قانونی اصلاحات کے اندر تھیں، کیونکہ یہودیوں کے ہاں غلامی سرے سے ممنوع تھی اور بعض رواق حکماء نے موروثی غلامی کو بالکل ناجائز قرار دیا تھا۔ یہ خلاف اس کے مسیحیت کے ہاں غلامی بالکل جائز تھی بلکہ اس نے سرشت انسانی میں اطاعت کیشی و غلامی کا مادہ اور زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ یہی پادریوں کی یہ تعلیم کہ کل انسان آپس میں بھائی ہیں تو یہ تعلیم تو رواقیہ بہت پیشتر دے چکے تھے غرض اس حیثیت سے غلاموں پر مسیحیت کا کوئی خاص احسان نہیں۔ اس کے اہلی احسانات یہ تین تھے۔

(۱) اس نے انسانی اخوت و مساوات کا ایک نیا تخیل پیش کیا جس نے ذات پات اور درجہ بندی کی تعریف کو مٹایا۔

(۲) اس نے غلاموں کی اخلاقی عظمت قائم کر دی۔

(۳) اس نے غلاموں کو آزادی دلانے کی خاص تحریک کی۔

ذیل میں ہم ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) پہلا مقصد مسیحیت نے اس طرح پر حال کیا کہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں آقا و غلام کی تفریق کو مٹا دیا۔ اصطلاح لینے یا تبرکات حاصل کرنے نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے میں دونوں برابر وہم درجہ تھے۔ جبرائیم کی سزا جیسی ایک کو ملتی، ویسی ہی دوسرے کو۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ قانون ہی آقا و غلام میں منبہق کرتا تھا، لیکن مسیحیت نے مجرم و مستغنی کی حیثیت سے قانون

کی نظر میں دونوں کو ایک کر دیا۔ جن آقاؤں کی سڑے بازیاں سے غلام مر جاتے تھے وہ ہمیشہ کے لئے گرجا میں حصول تبرکات سے محروم کر دیے جاتے تھے۔ لوٹڈیوں کی عصمت پیشتر ایک ناقابل لحاظ شے تھی۔ مگر جانے اسے خاص اہمیت دی۔ اور غلاموں کے لئے یہ بالکل جائز ہو گیا کہ آزادی حاصل کر کر کے پادری ہو جائیں۔ چنانچہ یہ بارہا دیکھنے میں آیا کہ ایک آقا نزع کے وقت اپنے آزاد شدہ غلام کے جواب پادری ہو گیا ہے، قدیوں پر سر رکھے اپنے لئے دعائے مغفرت کرا رہا ہے۔

(۲) دوسرا مقصد مسیحیت نے یوں حاصل کیا کہ اُس نے انہیں خصوصیات کو اخلاقی عظمت دیدی جو غلاموں میں پائے جاتے ہیں۔ مشرکوں کے ہاں غلامانہ زندگی مراد فتنی تحقیر و تذلیل کی اور ایسا ہونا بالکل سچا تھا۔ کیونکہ قدماے روم کے نزدیک جو معیار اخلاق تھا اس میں وہی خصوصیات شامل تھیں جو غلامانہ زندگی کی بالکل منافی اور آزاد زندگی کے لازم ہیں مثلاً بلند نظری، خود داری، خود اعتمادی، مہیا کی اہمیت و اقدام وغیرہ۔ مسیحیت نے جو معیار اخلاق قائم کیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کے نزدیک اُس کے عناصر ترکیبی وہ تھے جن کے آئینہ غلامانہ زندگی سے بالکل ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثلاً انکسار، فروتنی، اطاعت کشی، صبر، تسلیم و رضا۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ پہلے جس تحقیر و تذلیل کا غلامی کے ساتھ تلامزم تھا وہ اب مٹ جائے۔ میرے نزدیک مسیحیت کا یہ اثر انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم رومی معیار اخلاق کے پھیلنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ گو عروج و امن کی حالت میں اہل روم اپنے اعلیٰ اخلاق کا پورا ثبوت دیتے لیکن مصیبت و شورش کے وقت وہ ضبط و تحمل سے کام نہ لے سکتے۔ مسیحی معیار اخلاق کے رائج ہوجانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ تحمل و صبر کی مثالیں کثرت سے پائی جانے لگیں۔ چنانچہ غلاموں نے یہ دیکھ کر مسیحی معیار اخلاق اُن کی طرز زندگی کے عین مطابق ہے مسیحیت میں جوق جوق داخل ہونا شروع کر دیا رہاں تک کہ آزادگان رومہ یہ طنز کرنے لگے کہ مسیحیت تو غلاموں کا مذہب ہے، اور اُس وقت کے شہدائے مسیحیت کی فہرست میں ایک آدمہ نہیں متعذر

غلاموں کے نام نظر آتے ہیں۔ اور اٹلی میں بازنطینی طرز کی جو بہترین و اولین عمارت ہے یعنی سینٹ وینال کا گرجا وہ ایک غلام شہید کی یادگار میں بنا ہے۔

(۳) تیسرے مقصد کے حصول کی یہ صورت ہوئی کہ قسطنطین نے غلاموں کی آزادی کیلئے کو بولکیا کے تعلق کر دیا اور اس راستہ میں ہر طرح کی سہولیتیں پیدا کر دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس رسم نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر لی۔ مذہبی عقیدتوں اور تہواروں کے موقع پر یہ رسم خصوصیت کے ساتھ ادا کی جانے لگی اور گناہوں کے کفارہ کا یہ ایک نہایت عمدہ طریقہ قرار پا گیا۔ اب جس کثرت سے غلام آزاد کئے جانے لگے اُس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے سینٹ یلینا نے ۸۰۰۰ غلام آزاد کئے۔ سینٹ اوڈیس نے ۵۰۰۰، کروتھیس نے ۴۰۰۰، آپس نے ۱۲۰۰، اور سینٹ اگسٹائن متعدد اشخاص نے بھی بہت کثرت سے محض حصول ثواب کی غرض سے۔ رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا پھیل گیا کہ شادی وغیرہ کی ہر تقریب میں اس سے کام لیا جانے لگا۔ کوئی بیلادی سے اچھا ہو گا ایک بردہ آزاد کرے گا۔ کسی کے گھر میں ولادت ہونے والی ہے وہ ایک بردہ آزاد کرے گا۔ کسی کی شادی ہوئی ہے وہ ایک بردہ آزاد کرے گا۔ کوئی حالت نزع میں ہے وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرے گا۔ قرون وسطیٰ کے بہت سے وصیت نامہ ملے ہیں جن میں یہ صاف لکھا ہے کہ ”بغرض ایصال ثواب لئے غلام آزاد کئے جائیں“ اس رسم کا یہاں تک گہرا اثر پڑا کہ تیرہویں صدی میں جب فرانس میں کوئی غلام آزادی کے لئے باقی نہیں رہ گیا تو لوگ ایسی مذہبی تقریبات کے موقع پر پرندوں کو قرض سے رہا کرنے لگے۔

قسطنطین کے بعد غلامی یورپ میں ۸۰۰ سال تک رہی۔ اس مدت میں گو غلاموں کی تعداد بہت کم رہی لیکن ان کے مرتبہ حیثیت کی نوعیت میں کسی قدر فرق ہو گیا۔ پہلے غلام محض غلام ہوتے تھے۔ مگر اب وہ زیادہ تر کاشتکاری کے کام پر لگائے جانے لگے اور ان کی حیثیت محض غلام کی نہیں رہی بلکہ مزدوروں کی سی ہو گئی۔ مغرب میں اس کے دو سبب ہوئے۔ ایک طرف یہ ہوا کہ وحشی اسیران جنگ کی آندڑی گئی۔ بڑے بڑے امیر خاندان مفلوک الحال ہو گئے

شہری زندگی کی پہل پہل کم ہو گئی اور وحشی فاقہ میں زیادہ غلاموں اور خادموں کے عادی نہیں ہے دوسری طرف خود کاشتکاروں نے شدت افلاس سے اپنے نہیں بڑے زمینداروں کے ہاتھ کاشتکاری کے کام کے لئے فروخت کرنا شروع کیا ان دونوں اثرات سے مغرب میں قدیم طرز کی غلامی کا رواج از خود کم ہو گیا۔ مشرق میں یہ صورت پیش آئی کہ بڑے خاندانوں نے اپنی تنگ دستی دیکھ کر کچھ تو خود غلاموں کی تعداد میں تقلیل شروع کی اور کچھ ملک میں زراعت زیادہ پھیلانے کے لئے سرکاری طور پر بہت سے غلام کاشتکاری کے کام پر لگا دیے گئے غرض عربی و مشرقی دونوں حکومتوں میں اب غلامی محض کی جگہ کاشتکارانہ غلامی نے لے لی۔ رفتہ رفتہ ایسے ہی اقتصادى تغیرات پیش آتے گئے جنہوں نے غلامانہ کاشتکاری پر آزادانہ کاشتکاری کو ترجیح دیدی ایک طرف یہ ہوا دوسری طرف جو ایصالِ ثواب کے لئے بکثرت غلاموں کو آزادی مل رہی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کی تعداد در زبر روز گھٹنے لگی، تاہم آٹھ بارہویں صدی میں یورپ میں گنتی کے چند غلام رہ گئے اور چودہویں صدی میں تو غلام ایک ایسا اسم رہ گیا جس کا اسمی اور پ بھر میں گویا ایک ہی نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ ذکر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہو گا کہ غلاموں کو آزادی دینے کے علاوہ قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑانے میں مسیحیت کا جو احسان ہے اسے بھی دنیا نہیں بھول سکتی۔ ایسے وقت میں جبکہ وحشیوں کے متواتر حملوں سے ساری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ جبکہ بڑے بڑے شازارو پر رونق شہروں میں دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا جاتا تھا جبکہ اٹلی کی نئی نسل یا نڈر شمشیر ہو رہی تھی اور پاپا یا زنجیر پادریوں کی کوشش ہمہ وقت یہ رہتی تھی کہ اسیروں کو راحت پہنچائیں اور انہیں رہائی دلائیں سینٹ ایمبروز نے ایک بار تمام اہل کلیسا کے علی الرغم یہ کیا کہ جب حملہ آوروں کو گتھ نے بہت سے اسیران جنگ گرفتار کر لئے تو اس نے میلان کے شاندار گرفتار کا تمام سامان آراہش فروخت کر کے ان قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیا۔ اُس وقت تو اس کے اس فعل پر بڑی شورش ہوئی لیکن جب سے سینٹ گری گوری نے اس پر اپنی منظوری کی مگر لگا دی کسی کو مجال

اعتراض نہ رہی اور یہ دستور عام ہو گیا۔ اس طرح جب رومی فوج نے ... ایرانی گرفتار کئے اور ان کے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں کیا تو باوجودیکہ اہل ایران مسیحیت کے جانی دشمن تھے آمیزا کے پادری اُنکیتس نے یہ کہہ کر کہ ”خدا زیوراست سے مستغنی ہے“ اپنے کلیسا کا تمام ساز و سامان فروخت کر ڈالا اور اُس کے فذیہ سے ان قیدیوں کو رہائی دلا کر انہیں چھپرہ ان کے ملک میں بغیر و خوبی واپس کر دیا۔ اس کے بعد سے پھر تو بیسیوں مثالیں ملتی ہیں ڈیوگرٹس، سینٹ آگسٹائن، سینٹ گریگوری، سینٹ قیصرکس، سینٹ اکسوپریس، سینٹ یسیرک، سینٹ ریچی، سینٹ سایبرین، سینٹ اینینیس، سینٹ اومیٹس، سینٹ ایلیجس، سینٹ یالینس، غرض کوئی کہاں تک نام گنائے۔ ان سب نے اپنا طرز عمل ہی رکھا۔ مدت دراز کی بعد جب سلمان حملہ آوروں کے ہاتھ میں ہزار باقیدی پڑنے لگا تو پھر پادریوں کے اسی فیاضانہ جذبہ کو تحریک ہوئی اور وہ اسی سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے۔ بارہویں صدی میں جان آف مائتا اور تیرہویں صدی میں پیٹر لوئسکو کی زیر صدارت خاص اسی مقصد کے لئے انجمنیں قائم ہوئیں۔

مسیحی احسانات کی فہرست کا آخری عنوان خیرات ہے صفحات بالا میں ضنائیں کہیں کہیں اس کا ذکر آچکا ہے لیکن اب اسی پر ہم مستقل طور سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مشرکانہ و مسیحیانہ طرز خیرات میں عظیم الشان فرق تھا خیرات وسیع پیمانہ پر صرف وہیں جاری ہو سکتی ہے، جہاں ایک بڑی جماعت غفلت و بیکار موجود ہو۔ رومہ میں جتنے غفلت تھے وہ سب کے سب غلام تھے، یارٹیسوں کے طفیلیوں میں ہوتے تھے۔ غرض بیکار کوئی ہی نہ تھا۔ اس بنا پر اس زمانہ میں خیرات خانوں کے اجراء کا کوئی محل نہ تھا اور ان کی تعداد کی بنا پر مسیحی و مشرکانہ خیرات کا موازنہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ البتہ قدامت کے نزدیک یہ امر فرائض سلطنت میں داخل تھا کہ اہل ملک کی کفالت کی جائے۔ یونان نے اس بارہ میں جو کچھ کیا اس سے قطع نظر کیجئے۔ خود رومہ کے غفلتوں کی حالت دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ صدیوں تک ہزار ہا لکھوں مخلوق کو سہ کار کی طرف سے مفت غلہ تقسیم ہوتا رہا۔ یہ دستور یوں تو رومہ میں شروع سے موجود تھا لیکن رومی سال کے

سلسلہ میں یہ قانون باضابطہ منظور ہوا کہ ناداروں کو برائے نام قیمت پر غلہ دیا جایا کرے۔ دوسال کے بعد امرائے جوڑ توڑ کر کے اسے منسوخ کر دیا لیکن سلسلہ میں یہ بالآخر از سر نو جاری ہوا۔ ۹۱ سلسلہ میں اسے اور وسعت دی گئی۔ ۹۵ سلسلہ میں کلوڈیس پلچر نے برائے نام قیمت کو بھی اڑا دیا، اور تقسیم کو جو ماہوار ہوتی تھی بالکل مفت کر دیا جو تیس سیزر کے زمانہ میں ان خیرات پانے والوں کا شمار ۳۲۰۰۰ تھا۔ اور گواس نے ان کی تعداد نصف کر دی لیکن آگستس کے وقت میں وہ پھر بڑھ کر ۴۰۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ اس تاجدار نے تقسیم کو بجائے ماہوار کے سہ ماہی کر دینا چاہا! لیکن عام رائے کے سامنے اسے اپنی تجویز کو مغلوب کر دینا پڑا۔ رفتہ رفتہ یہ دستور رومی زندگی کا ایک جزو اہم بن گیا۔ اور متعدد عمدہ داروں کا ایک خاص حکمہ اس کے لئے قائم کر دیا گیا۔ انٹونائیس کے زمانہ میں خیرات پانے والوں کا شمار ۵۰۰۰۰ سے بھی متجاوز ہو گیا۔ سیزر نے غلہ کے ساتھ روغن کا بھی اضافہ کر دیا آریلیکن نے ماہانہ تقسیم غلہ کے بجائے روزانہ روٹی اور سور کے گوشت کی تقسیم جاری کی۔ رفتہ رفتہ روم کے علاوہ قسطنطنیہ، اسکندریہ، النبطیخ اور غالباً اور اکثر شہروں میں بھی یہ دستور رائج ہو گیا۔

غرض رومہ قدیم میں خیرات کے وجود سے انکار نہیں اس کا وجود تھا اور بہ افراط تھا لیکن ناظرین کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ شے معین ہوئی رومی اخلاق کے اغماط میں خیرات خواہ کیسی ہی بے محل و مفلس نہ عمل ہو مگر عموماً اس کا اثر یہ ضرور ہوتا ہے کہ کم از کم خیرات دینے والے پر اس کا اچھا اثر ضرور پڑتا ہے۔ مگر رومہ میں تقسیم غلہ سے چونکہ خیرات مطلقاً ہی مقصود نہ تھی بلکہ اس کی غایت محض سیاسی اثر و اقتدار تھی اس لئے نتیجہ بھی یہی نکلا۔ خیرات پانے کے لئے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی کڑا آدمی کام کے قابل نہ ہو بلکہ محض رومی ہونا اس کے لئے کافی تھا اور یہ صاف کاہلی اور اربابچ پن کی تعلیم دینا تھا۔ جب ہر شخص کو کھانے بھر کو بلا ہاتھ پیر ہلائے مل جاتا تھا اور ضرورت سے زیادہ تفریح و تماشہ کے مناظر ہر وقت سامنے رہتے تھے تو کون ایسا احمق تھا جو خواہ مخواہ محنت کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کاروباری زندگی پر مردنی چھا گئی۔ زراعت کی طرف سے

لوگ غافل ہو گئے، تجارت و صنعت و حرفت کی طرف سے بے اعتنائی پھیل گئی اور جب کبھی اتفاقاً سے تقسیم میں دیر ہو جاتی تو شہر پر قیامت گزر جاتی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگوں نے جب دیکھا کہ اُن کے حصّہ میں اولاد بھی شریک ہو اچاہتی ہے تو اسقاطِ حمل، طفل کشی وغیرہ مختلف طریقوں سے اولاد کی تعداد محدود کرنا شروع کر دی۔

رومہ کی کل آبادی ۵۰۰۰۰۰ سے زائد نہ تھی۔ ان میں سے غریب اہل شہر کی ایک تعداد کثیر غلاموں میں شامل تھی۔ اُن کا بھی حصّہ نکال ڈالنے کے بعد اگر ۲۰۰۰۰ شخص محض خیرات پانے والے تھے، تو کوئی شخص قدامے روم پر خیرات کا الزام نہیں عاید کر سکتا۔ لیکن ان کے فیاضیاں صرف تقسیمِ غلّہ تک محدود نہ تھیں بلکہ خیرات کے اور طریقہ بھی رایج تھے۔ مثلاً نمک کی قیمت برائے نام لی جاتی تھی۔ زمین کو جو تیس سیز، یازد، و سیورس نے خرید کر رعایا کو مفت تقسیم کیا تھا۔ جو تیس سیز آگکس وغیرہ نے رعایا کے لئے بڑے بڑے ترکہ چھوڑے۔ تھے اور مختلف تقریبات کے موقع پر خوب خیرات کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے حمام وقف عام تھے جن میں بعض بالکل مفت تھے اور بعض میں برائے نام اجرت لی جاتی تھی۔ و سپسین نے تعلیم عام کا ڈھنگ ڈالا اتھونانیس نے اسے اور زیادہ وسعت دی اور بچوں کی تربیت کا انتظام جس کام میں بیشتر ذکر کر چکا ہوں بہت وسیع پیمانے پر ہو گیا۔ اسے سب سے پہلے آگکس نے شروع کیا تھا۔ لیکن یہ اس کی ایک ذاتی دہنگامی فیاضی تھی۔ اس کی ایک مستقل و باضابطہ شکل سب سے پہلے بڑو نے قائم کی۔ اُس نے نہ صرف روم بلکہ اٹلی کے تمام شہروں میں نادار بچوں کی کفالت کے لئے حکم جاری کیا۔ بڑو جن نے اُسے اور وسعت دی۔ اُس کے زمانہ میں اکیسے شہر روم میں ۷۰۰ بچے سرکاری خرچ سے پرورش پاتے تھے اور یہی طریقہ افریقہ و اٹلی میں ہر جگہ جاری تھا جن کی تفصیل کا ہم کو علم نہیں۔ ویلیا ایک حقیر قصبہ تھا، صرف اس میں ۲۰۰ بچوں کی پرورش کا سرکاری انتظام بڑو جن کے زمانہ میں تھا سرکاری فیاضیوں کے علاوہ غامگی طور پر انخاص کی ذاتی فیاضیوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آج گو ہم ان کی مفصل تاریخ نہیں لکھ سکتے، تاہم مختلف کتبات سے اُن کا وجود تو قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے

پابندی نے علاوہ مدارس و مکاتب کے ایک زبردست سرپرست ہونے کے اپنے شہر میں نادار
بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا تھا جس کے لئے اپنی جائیداد وقف کر دی تھی جس توں
سیلیامیکر نیا نے ٹرکینا میں ۱۰۰ بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کھولا تھا۔ ہیڈرین نے ان
خیرات خانوں کو جو امدادی رستم ملتی تھی اس میں اضافہ کر دیا اور نادار عورتوں کے ساتھ
جو جو سلوک کرتا تھا وہ آج تک مشہور ہیں۔ انٹونیس ۱۶ فی صدی کی شرح پر غریب کو قرض دیتا
تھا جو اس وقت کی عام شرح سود کو دیکھتے ہوئے بہت ہی خفیف تھی۔ انٹونیس و مارکس آریلیس
دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کی یادگار میں لڑکیوں کے لئے پرورش گاہیں قائم کیں۔ اسی طرح
الگزینڈر سیوریس نے اپنی والدہ کی یادگار بچوں کے لئے ایک خیرات خانہ کی مکمل میں بنوائی
عام شفا خانوں اور اسپتالوں کا رواج تو یورپ میں مسیحیت سے قبل غالباً نہ تھا۔ مگر اس کے
ثبوت موجود ہیں کہ غریب کو دو ایسے مفت تقسیم ہوتی تھیں، معطل العینو غلاموں کے لئے محتاج خانہ
قائم تھے اور غالباً جنگی اسپتالوں کا بھی وجود تھا۔ قحط، سیلاب، زلزلہ وغیرہ کے موقع پر
سرمہ کار کی طرف سے رعایا کو امداد ملتی تھی اور رؤساء اپنی جائیدادیں رفاه عام کے لئے ترکہ میں
چھوڑ جاتے تھے۔

یہ تمام مثالیں بجائے خود کیا کم ہیں لیکن ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ یہ واقعات
و حالات کی مکمل فہرست ہرگز نہیں۔ صد ہا کتبہ ایسے ہوں گے جو آج مٹ گئے ہیں ہزار ہا
یادگاریں ایسی ہوں گی جن کے آج نشان تک نہیں پائے جاتے۔ پھر خیرات و فیاضی کی تاریخ
میں کوئی ایسی عجیب و غریب بات ہی نہ تھی جو ہمارے مورخین اسے خصوصیت کے ساتھ
قلب بند کرتے۔ خود ہمارے معاصر مورخین کب اپنے مجلدات میں اس طرح کے واقعات کو لکھتے
ہیں؟ اور آج سے دو چار ہزار سال کے بعد کوئی آج کل کی تصانیف سے موجودہ فیاضیوں
کی تاریخ لکھنا چاہے گا، تو اس کے سامنے کس قدر ناقص، نامکمل اور اہوار مواد ہوگا لیکن ان
اعترافات کے باوجود بھی ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ مسیحیت نے خیرات کا جو درجہ

مقرر کیا جس پر اسے پھیلا یا جس اسلوب پر اسے چلایا، ان میں سے کسی لحاظ سے قدامان کی ہمہری نہیں کر سکتے۔ اس وقت خیرات تقریباً تین سو ایک سو کاری کا رروائی ہوتی تھی جس کا مقصد رفاہ خلق نہیں بلکہ سیاسی حکمت عملی ہوتی تھی۔ اور جس کثرت سے ملک میں قحط پڑا کرتے تھے یا جس تعداد میں غربا سیٹانی کا ہمیشہ اختیار کرتے تھے اور جس افراط سے لوگ اپنی اولاد کو خست کر ڈالتے تھے ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کا کس قدر کثیر حصہ خیرات سے مستفید ہوتا تھا، اور کس قدر مزید فیاضیوں کی ضرورت باقی تھی۔ بے شبہ چند مشرک فیاضوں کے واقعات ہم تک پہنچے ہیں۔ مثلاً یونانیوں میں ایپیمینڈس قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑاتا تھا اور نادار لڑکیوں کو جہیز کا سامان دیتا تھا، یمن غربا کی کھانے کی پٹے سے کفالت کرتا تھا، بایں، مسینا کی گرفتار شدہ لڑکیوں میں خرید کر کے اور جہیز کا سامان دے کر آزاد کر دیتا تھا۔ اسی طرح کی مثالیں رومہ میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ اور یہاں مہماں نوازی کی تو خاص طور پر تقسیم دی جاتی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اشخاص کی خانگی فیاضیاں افراد کی ذاتی خیراتیں جو سبھی جماعات کی ہر ملک و ہر زمانہ میں اجزاء غیر منفک رہی ہیں ان کا قدامت کے یہاں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور ان کے حکماء اخلاق میں، بجز دو ایک کے اور کسی نے ان کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ ان دو ایک میں سب سے زیادہ قابل ذکر کسٹروس ہے۔ اس نے اس موضوع پر پورے دو باب لکھے ہیں، جن میں کثرت نظر سے کام لیا ہے لیکن گرجوشی کا کہیں پتہ نہیں وہ کہتا ہے کہ انسان کی کوئی اخلاص سخاوت سے بہتر نہیں لیکن شریط ذیل کے ساتھ:-

(۱) جس شخص کو ہم اپنی فیاضی کا مورد بننا ہے ہیں وہ واقعہ اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

(۲) ہم اپنی چادر سے باہر تو پاؤں نہیں پھیلا رہے ہیں۔

(۳) وہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کر رہا ہے، سیرنگی طرح ناجائز ذرائع سے تو نہیں آئی ہے۔

(۴) اس کا مقصد رفاہ و بہبود خلق ہو، اپنی نمود و نمائش نہ ہو۔

(۵) اور خیرات پانے والے کی ضروریات و حیثیت کا پورا لحاظ کر لیا گیا ہو۔

دنیا میں سب سے اول با مسیحیت نے یہ بتایا کہ سخاوت انسان کے فرائض اخلاق میں داخل ہے اور تمام علمین مسیحیت اس تعلیم کو زور کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اس سے بھی زیادہ پُر اثر طریقہ مسیحیت نے یہ اختیار کیا کہ خود مسیح کو فقر و مسکنت کا مجسمہ مسترار دیا اور اس لئے جو لوگ فقر و مسکین کی امداد کرتے تھے وہ گویا خود مسیح کی خدمت کرتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سخاوت دنیا میں مسیحیت کا جزو غیر منفک ہو گئی جس سے مسیحی کسی وقت اور کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ خود تقدیروں کے پُر آشوب زمانہ میں ہر توار کو فقر و اس کے لئے چندہ جمع کرنا ضروری تھا۔ مسیحی روزہ رکھتے تھے مگر مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو کچھ کھانا بچے محتاجوں کی نذر ہو۔ خیرات کا ایک بڑا وسیع نظام جس کے صدر پیادری لوگ تھے اور جس کی باگ استغون کے ہاتھ میں تھی اپنی صد با شاخوں کے ساتھ مستایم ہوا اور کلیسا کے دور دراز مکرٹوں کے درمیان خیرات و فیاضی کا رشتہ اتحاد قرار پایا۔ قسطنطنیہ کے زمانہ سے بہت پیشتر کا واقعہ ہے کہ مسیحیوں کی فوق الحد فیاضیوں کو دیکھ کر صد ہا منافقین ان کے گروہ میں شریک ہونے لگے اور حسیبت کو پورا تسلط ہو گیا ہو گیا۔ تب تو اس کی فیاضیوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہا۔ دنیا میں سب سے پہلا شفا خانہ ایک رومی خاتون فیسیولا کے ہاتھوں چوتھی صدی میں مستایم ہوا۔ اور اس کی تقلید عام طور پر ہونے لگی۔ چند روز میں متعدد شفا خانہ اور اسپتال جگہ جگہ کھل گئے۔ اسیں اور ہمان خانہ جو بننے لگے۔ وہ علیحدہ۔ نائیس کی انجن کلیسا نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر شہر میں ایک ایک سر تعمیر ہونا چاہئے۔ سینٹ گریزوسٹم کے زمانہ میں اکیسے انطیوخ کے گرجا سے علاوہ مریضوں و مسافروں کے ۳۰۰۰ بیواؤں اور کنوازیوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں لوگ عام طور پر اپنی بڑی بڑی جائیدادیں غربا و مساکین کے لئے وقف کرنے لگے۔ اندھوں، برص و جذام کے مریضوں و قحط زدوں کے علاج و پرورش کے لئے متعدد راہبوں (مثلاً سینٹ افریم و تھیلیسیس وغیرہ) نے شفا خانہ و محتج خانہ کھول دیے اور ایک تاجر اپولوئیس نے خود راہبوں کے لئے

ایک اسپتال جاری کر دیا۔ ہر عیسائی پر یہ واجب تھا کہ اپنی آمدنی کا کم از کم ۱۰ حصہ ضرور اہل حاجت کے لئے وقف رکھے اور آج کل کے اشتراکین کا سا خیال اس وقت بالعموم مسیحوں میں شائع ہو گیا تھا کہ زمین پرستہ رتہ تمام انسانوں کو برابر و جبر کا حق حاصل ہے اور جو لوگ امیر و زمیندار ہیں وہ محض اس لئے کہ اپنی دولت و زمین میں دوسروں کو شریک کریں۔ وہ گویا اپنے آبائے جنس کے امین ہیں اور اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

مسیحوں کے اس جوشِ ایثار و سخاوت نے بت پرستوں کو خاص طور پر متاثر کیا جنہوں نے اپنے یہاں بھی اس کی تقلید کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوئی۔ ۱۸۲۰ء میں جب قرطاجنہ میں یاگیلینیس و میکزیمن کے عہد حکومت میں جب اسکندریہ میں ویاپہلی ہے اور جبکہ فرط اضطراب سے بت پرستوں کی تمام دنیا میں نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی، یہ ہمت و پامردی صرف عیسائیوں میں تھی کہ وہ اپنے پادریوں کی زیر سرکردگی، امریضوں کی آخر وقت تک دوا و علاج و تیمارداری کرتے انہیں تسلی و تسفی دیتے اور جب وہ مر جاتے تو ان کی تجہیز و تکفین کرتے۔ غلاموں کے بہ کثرت آزاد ہونے سے جب ملک میں گداگروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس پر دہشتی حملہ آوروں کے حملہ اور مستزاد ہوئے تو اس وقت بھی گرجانے اپنی فیاضیوں کا انتہائی ثبوت دیا جنسیرک نے جب افریقہ کو مسخر کر لیا تو اٹلی میں غلہ کی درآمد موقوف ہو گئی اور بڑا سخت قحط پڑ گیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک تباہی و بربادی پھیل رہی تھی۔ ہزار ہا شخص دبا کا شکار ہو رہا تھا آباد و پررونق شہروں کی اینٹ سے اینٹ بچ رہی تھی۔ اور ہر جگہ میں قحط زدوں کی لاشیں اور فاقہ کشوں کی صورتیں نظر آتی تھیں لیکن اس عام ہٹل اس عام محشر اضطراب کے درمیان گرجا کے خادموں کی پرسکون سکھیں

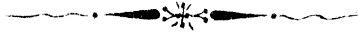
دکھائی دیتی تھیں جو یا تو حملہ آوروں کے قہر و غضب کو ٹھنڈا کرتی ہوتی تھیں یا پھر مصیبت زدوں کی دستگیری میں مشغول نظر آتی تھیں۔ آلا رگ کی فوج نے جب روم پر قابض ہو کر قتل و غارت کی گرم بازاری شروع کر دی تو صرف میسوں کا گر جا ایک ایسا ماں و لمبا تھا جو حملہ آوروں کی دست درازیوں سے ہر طرح پر محفوظ تھا پھر جب شہر کو آلا رگ سے بھی زیادہ مہیب دشمن اٹلیا کا سامنا ہوا اور اس کے قہر کے آگے سارا شہر لرزہ بر اندام تھا اس وقت پاپاے اعظم سینٹ لیو اپنے اپنے مقدس لباس میں اپنے ہموطنوں کی حفاظت کے لئے باہر نکلا۔ مہیب فاتح پر پاپا کی ہیبت چھا گئی اور شہر دست درازیوں سے محفوظ رہ گیا۔ دو برس بعد جنتبرک کا حملہ ہوا اور اُس وقت بھی پاپاے موصوف کی سفارش سے قتل و غارت میں بہت تخفیف کر دی گئی۔ اسی طرح ٹوٹیلہ پر حملہ کے وقت پہلا گیس کی ٹروس پر حملہ کے وقت سینٹ لوپس کی، آرکینس پر حملہ کے وقت سینٹ ایگنان کی اور انگلستان پر قوم بکت کے حملہ کے وقت سینٹ جرین کی سفارشیں کام آئیں۔

فاتحین و حملہ آوروں کے علاوہ حالت امن میں خود حکام و رعایا کے درمیان پادریوں کی وساطت سے بارہا مصالحت ہوتی ہے۔ شہر اظیوخ کو جب بغاوت کے جرم میں تھیوڈوسیسی نے سزا دینی چاہی تو تمام خادمان کلیسا اپنے اپنے خلوتکدوں سے نکل نکل کر وزراے سلطنت کی خدمت میں عرض و معروض کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور خود آج بشپ فیلپوین پادشاہ کے پاس التجاے استرحام کے لئے گیا ہے اسی تھیوڈوسیسی نے جب تھیا لونیکا میں خوزیری کی ہے تو سینٹ ایمبروز نے اسے مجبور کیا کہ اپنے اس گناہ کا کفارہ دے متعدد مثالیں اس کی بھی ملتی ہیں کہ جو حکام و اُمرا رعایا پر جبر و تشدد کرتے تھے وہ گر جا کی برادری سے خارج کر دیے جاتے تھے تا آنکہ کفارہ دیکر وہ دوبارہ اپنے تئیں اس کی شرکت کے قابل بنائیں

آخر کار جب پادریوں اور راہبوں کے اثر کی یہ حالت پہنچ گئی کہ وہ بارہا مجرموں کو چھڑا لائے اور اس سے ملک کی سیاست متاثر ہونے لگی تو اُن کے لئے کچھ مخصوص قوانین کا نفاذ کرنا پڑا۔ یتیموں اور راندوں کی دستگیری کرنا گر جا کا مذہبی مندرض تھا اور دنیوی حکام کے لئے اُن پر بغیر پادریوں کی صلاح و مشورہ کے مقدمہ چلانا ایک گناہ مسترار پا گیا۔ پانچویں صدی میں کلیسا کی ایک کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ جو حکام غربا کے ساتھ بد سلوکی سے پیش آئیں گے، یا پادریوں کی سفارشوں سے بے اعتنائی کریں گے وہ گر جا کی برادری سے خارج کر دیے جائیں گے۔ پادریوں کے دولت و متول کا سبب یہ تھا کہ اُمرائے ترکہ انہیں کے پاس چوڑ جاتے کہ یہ اُس کے مصرف صحیح کے امین رہیں۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ اُمراء ان پادریوں سے ڈرتے تھے غربا انہیں اپنا دستگیر جانتے تھے، مجرم انہیں اپنا شفیع سمجھتے تھے، مریض انہیں اپنا علاج و تیمار دار یقین رکھتے تھے اور مسافران کے مکانات کو مہمان سرا تصور کرتے تھے اور ان کے علاوہ خیرات کے اور جتنے مظاہر ممکن تھے یہ سب پر عمل کرتے تھے مثلاً ایک راہب نے اپنے ذمہ یہ کام لیا تھا کہ کشتی کھیتا تھا اور بلا محصول مسافروں کو دریا پار اُتار کرتا تھا۔ یا پھر اسی طرح جب یورپ میں جذام کا نفرت انگیز مرض پھیلا اور اُس نے وبائی شکل اختیار کر لی، اور لوگ گھروں کو چوڑ چوڑ کر بھاگنے لگے۔ نہ صرف اس خیال سے کہ یہ مرض متعدی ہے، بلکہ اس خیال سے کہ یہ ایک شیطانی عذاب ہے تو نئے نئے اسپتالوں میں مریضوں کی خدمت و تیمار داری کرنے والے اگر کوئی ہوتے تو یہی راہب ہوتے تھے۔

آج یہ مسیحی فیاضیوں کے مورخ کے لئے اس سے زیادہ افسوسناک کوئی واقعہ نہیں کہ اُسے جن چیزوں کی سب سے زیادہ تلاش ہے انہیں میں اس کے پیشروں نے سب سے زیادہ بخل سے کام لیا ہے۔ حکومتوں کے انقلاب فاشیوں کے حملے

جنگ و جدل کے کارنامہ، محاربات کے واقعات ان کی تصویر کا ایک ایک خط و
 خال تاریخ کے مرقع میں محفوظ ہے اور کیوں نہ ہوتا؟ یہ چیزیں ہی ایسی ہیں جو متحلیہ کو
 متاثر کرتی ہیں۔ بہ غلات اس کے کہتے لوگ ایسے ہیں جو بیاروں کی آہوں، رانڈوں
 کے بین، یتیموں کے نالہ، اور بیسواؤں کی فریاد پر توجہ کرتے ہیں؟ پھر ان کی تاریخ
 جمع ہوتی تو کیونکر؟ دنیا کے حقیقی اور شان دار ترین کام شاید ہمیشہ غیر مکتوب
 رہ گئے ہیں اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسیحیت کا روشن ترین کارنامہ یہی
 ان کی سخاوت و فیاضی کی تسلیم و عمل ہے۔ یہ اُسی کا کام تھا کہ اُس نے اس مذہب
 کا جزو بنایا اخلاق کی بنیاد ہی پر رکھی، سطح ارض پر سخاوت و خیرات کا ایک سیلاب
 بہا دیا اور اس کا انتظام اپنے مقتدایان مذہب کے فرائض مذہبی میں داخل کر دیا۔



فصل (۴)

مناقب بالاکا تاریک پہلو

مسیحی فیاضیاں، گونہایت وسیع پیمانہ پر تھیں تاہم غیر محدود نہ تھیں۔ کوئی کلیہ استثناء سے خالی نہیں ہوتا، اور اس فیاضی کے کلیہ سے ایک خاص طبقہ کے مجاہدین مستثنیٰ تھے۔ یہ خیال بہت قدیم سے چلا آتا ہے کہ دیوانگی کوئی عام و معمولی بیماری نہیں بلکہ کسی مافوق الفطرت قوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ مسیحی دنیا میں دیوانے فہشتہ نظروں سے دیکھے جائیں یہ سبب بجائے خود کافی تھا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بھوت، پریت، جن، دلید سحر و جادو کا اعتقاد کتب یہود میں مسلم تھا۔ اور تمام سیحیوں کو ان کے وجود پر پورا یقین تھا۔ ان میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اس کے گرد و پیش ایک غیر مرئی دنیا ہے، جس میں یہ شیطاں چلتے پھرتے رہتے اور بستے ہیں۔ اب اگر کسی کے دماغی توازن میں ذرا بھی اختلال ہوتا۔ اُس کے لمبی یا اتالی القباس جو اس سے یہ غیر مرئی ہستیاں، مرئی ہو جاتیں خصوصاً وہ لوگ جو تنہائی میں میٹھکے عبادت میں مصروف رہتے تھے، یا زاویوں اور غاروں میں چلہ باندھ کر ریاضتوں میں لگے رہتے اور تمام لذائذ و نایم دنیوی سے دست بردار ہو کر اپنی جہانی صحت خراب کر چکے ہوتے، وہ لوگ زیادہ اس القباس جو اس کے شکار ہوتے۔ چنانچہ صد ہا زاہدان مرتاض کو یہ خواب بیداری نظر آتے رہتے کہ شیطاں کا اُن کے گرد حلقہ ہے اور وہ ان کی عبادت و ریاضت میں دوسو اندازی کر رہے ہیں۔ یہ کیفیت جنوبی حبیب تک مذہب کی تعلیمات سے مقصاد منہ ہوتی اُس وقت تک تو کوئی ہرج نہیں ہوتا تھا لیکن جب یہ مذہب کے کسی جزو سے آکر ٹکراتی تھی تو غریب دیوانہ کو اپنی دیوانگی کے جُرمِ نامہ میں اپنی جان نذر کر دینا پڑتی تھی مسئلہ میں ایک لڑکی کی، جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ روح القدس نے مجھ میں جنم لیا ہے تاکہ میں جنسِ اناث کو نجات

ولاؤں، لاش کھود کر نکالی گئی اور جلانی لگئی اور دو اور عورتوں کو جو اُس کے دعوے پر ایمان لے آئی تھیں قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح ۳۵۹ مسلمانوں کے ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ میں میکائیل فرشتہ کا بھائی ہوں اور معلم الملکوت کا جو عمدہ کتاب اُس پر میراقرر ہونے والا ہے۔ میں روزانہ جنت و فرج کی سیر کرتا ہوں۔ قیامت غمگین آیا جا رہی ہے اور اُس وقت میں تنہا وصال سے مقابلہ کروں گا۔ غریب جنوں ٹولیدو کے پادری کے ہاتھ میں پڑ گیا اور ان کلمات کفر کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا بعض مرتبہ یہ جنوں وحی والہام کی شکل میں ظاہر ہوتا اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔ یعنی زندہ آگ میں جلا دیا جاتا، جیسا کہ جون آف آرک کا واقعہ شاہد ہے۔ سولہویں صدی میں اسپن کے ایک مشہور طبیب و عالم کو یہ خط سوار ہوا کہ ایک فرشتہ اُس کی مصاحبت میں رہتا ہے۔ خیر یہ خود تو توبہ و استغفار کر کے اور کفارہ دے کر جان بچائے گیا لیکن اسی نوعیت کا ایک دوسرا جھوٹی جو لیمیا میں علم فقہ کا پروفیسر تھا، زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح صد ہزار باغریب بیوائیں ضعیف و ناچار عورتیں جن کے حواس صحیح نہیں رہے تھے جو کبرسنی کی باعث طرح طرح کے توہمات کی شکار ہو جاتی تھیں اور جن کو گر جاسے ہر طرح کی اعانت و دستگیری کی توقع تھی، اسی جرم جنون میں مدتوں مختلف تعذیبات بھیلی تھیں اور پھر آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔

یہ مجانین کے متعلق عام طرز عمل تھا۔ بعض صورتیں جنوں کی داخل امراض سمجھی جاتی تھیں اور ان کی بابت یہ یقین تھا کہ اطباء کے علاج و معالجہ سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان بد نصیبوں کے ساتھ بھی وہ ہمدردانہ برتاؤ مفقود تھا جس کے یہ مستحق تھے، اور جن کی سیمانہ فیاضیوں سے بالکل بجا طور پر توقع رکھی جاسکتی تھی۔ قدامت کے ہاں مجانین، معابد میں بیکار رکھے جاتے تھے۔ اور جھاڑ پھونک، دُعا توہید سے ان کا علاج کیا جاتا تھا۔ یونانی اطباء نے اس میں شبہ نہیں کیا۔ طبی حیثیت سے اس موضوع پر نہایت محققانہ رسائل و مقالات چھوڑے ہیں۔ لیکن علی طور پر پانچواں وغیرہ کی تعمیر انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ راہبوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی صرف ایک نظیر

ملتی ہے۔ وہ یہ کہ جب صحرا نشین زاہدوں کی تعداد کثیر مجنون ہونے لگی، تو ان کے واسطے
 بیت المقدس میں ایک علیحدہ مکان بنادیا گیا۔ بس اس ایک مثال کے سوا جو ایک محدود عبادت
 سے متعلق تھی اور مسیحی تاریخ میں اس کی شہادت پندرہویں صدی تک نہیں ملتی۔ اصل یہ ہے
 کہ اس باب خاص میں مسلمان مسیحیوں پر سبقت لے گئے۔ بنجرن آف ٹوڈیلا جس نے بغداد کی باہر
 صدی میں سیاحت کی تھی، لکھتا ہے کہ اس شہر میں ایک خاص محل ”دارالرحم“ کے نام سے موسوم
 ہے، جس میں تمام ملک کے مجاہدین پابہ زنجیر رکھے جاتے ہیں ہر مہینے ان کا معائنہ ہوتا ہے
 اور جو شفا یاب ہوتے جاتے ہیں، رہائی پاتے جاتے ہیں۔ قاہرہ میں مسلمانوں نے پاگلخانہ
 ۱۲۳۱ء میں تعمیر کرایا۔ لیوا فریکس لکھتا ہے کہ سوٹھویں صدی کی ابتدا میں شہر فیض میں بھی ایک
 پاگلخانہ موجود تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اُس وقت دیوانوں اور پاگلخانوں کی نگہداشت
 کرنا تمام اسلامی ممالک میں رائج تھا۔ نو مسیحیوں میں یہ دستور اول انھیں ممالک میں پھیلا
 جو اسلامی ممالک کے متصل تھے۔ گو اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے یہ دستور
 مسلمانوں ہی سے لیا۔ اہل مالٹا کی اس باب میں خاص شہرت ہے کہ وہ اپنے اسپتالوں میں
 مجاہدین کو داخل کرتے تھے، لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں کہ ۱۲۰۹ء سے پیشتر مسیحی ممالک میں
 کیس علیحدہ پاگلخانہ کا بھی وجود تھا۔ مسیحی دنیا میں سب سے پہلا پاگلخانہ اسپین میں ایک راہب
 جون گیلیب ٹوٹو فرے نے پاگلوں کو گلی گلی در دناک حالت میں پھرتے دیکھ کر قائم کیا۔ یہ شہر
 ولینشیا میں قائم ہوا، اور پھر اس کی تقلید اور شہروں میں ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۲۲۵ء، ۱۲۳۱ء،
 ۱۲۸۲ء میں اسپین کے مختلف صوبوں میں دارالمجاہدین قائم ہو گئے اور اُس وقت تک مسیحی دنیا
 کے اور تمام حصے اس کے نام تک سے نا آشنا تھے۔ اہل اسپین اپنے جائز فخر پر ان دو واقعات
 کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کہ خود حوالی رومہ میں پہلا پاگلخانہ انھیں نے ۱۲۸۵ء میں تعمیر کرایا۔ دوسرے
 یہ کہ ان کا برتاؤ مجاہدین کے ساتھ نہایت دانشمندانہ و ہمدردانہ رہا ہے، جیسا کہ نپل فیٹارحوں
 صدی کے خاتمہ پر اعتراف کیا ہے۔

اپسین کو مستثنیٰ کرنے کے بعد اور تمام مسیحی ممالک میں مجانین کی حالت نہایت ہی اتر چکی
 ہزار ہا انشخص تو ساحری کے الزام میں زندہ جلادے گئے۔ باقی جن کی بابت یہ سٹے ہی ہو گیا کہ
 وہ واقعی مجنون ہیں ان کا بھی قید و زندان، مار پیٹ، اور قصد کے ذریعہ سے علاج کیا جاتا تھا
 شفقت بھداری کا کیا ذکر ہے، سیکڑوں کو اپنی عمریں تنگ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر قید
 تنہائی میں گزار دینا پڑیں۔ اور اس برتاؤ سے ظاہر ہے کہ مرض گھٹنے کی جگہ اور ترقی پکڑا تا تھا۔
 یہ حالت اٹھارھویں صدی تک قائم رہی۔ اٹھارھویں صدی میں جب ایک طرف نش
 درویش نیالی پھیلنے لگی، اور دوسری طرف سحر و جادو وغیرہ کے توہمات دلوں سے مٹنے
 لگے۔ تب جا کر کیں اٹلی میں مورگینی، اسکاٹ لینڈ میں کوٹن، اور فرانس میں پیل کی کوششوں
 سے اس باب میں اصلاح ہوئی۔

غرض مسیحی فیاضیوں کی غیر محدود روح و ثنائیں ہمیں جو رکاوٹ ہوتی ہے، اُس کا ایک سبب
 تو یہی تھا، دوسرا سبب جو اس سے زیادہ اہم و وسیع ہے یہ ہے کہ خیرات اپنے مصرف صحیح میں
 نہیں صرف کی جاتی تھی۔ خیرات کے جاوید بجا ہونے کے متعلق یوں تو دنیا میں بہت طویل فصل
 مباحث موجود ہیں، لیکن اقتصادیات کا جو علم ہے اُس سے ہم کو ہدایات ذیل حاصل ہوتے ہیں۔
 (الف) اُس نے بیکار و باکار صرف میں تفریق کر کے بتایا ہے کہ اول الذکر سے صرف کرنے
 والے کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ جس شے کو وہ روکنا چاہتا ہے اُسی کو اور ترقی ہوتی ہے۔
 مثلاً جہاں بے روزگاروں کی اعانت کی جاتی ہے وہاں بے روزگاری اور پھلتی ہے۔ جہاں
 ہر شخص کو ضعیف العمری میں پنشن ملنے کی توقع ہوتی ہے وہاں کوئی شخص خچ میں ہتھیاط
 کفایت شعاری سے کام نہیں لیتا۔ و قس علی ہذا

(ب) تعیش و تفریح میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ بھی اس لئے بیکار جاتا ہے کہ اُس میں
 زیادتی نہیں ہوتی بلکہ وہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

(ج) البتہ باکار صرف وہ ہوتا ہے جس سے سرمایہ برابر بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً کلوں اور کارخانوں

کے قائم کرنے، یا آبپاشی و زراعت وغیرہ میں جو کچھ صرف ہوتا ہے اُس سے برابر منافع کا سلسلہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔

(۵) پس ملک میں افزائش ثروت کا یہی ایک طریقہ ہے کہ سرمایہ صرف باکار مصارف میں لگایا جائے۔

ان حقایق سے بعض حضرات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خیرات سرے سے ایک فضول بلکہ مضرت ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال دو دھوں سے باطل ہے۔ اول یہ کہ خیرات کی ہر صورت صرف بیکار کی نہیں ہوتی بلکہ بہت سی طریقہ ایسے بھی ہیں جن سے اصل سرمایہ میں اضافہ کی توقع رکھنا بالکل درست ہوتی ہے مثلاً بلا فیس تعلیم عامہ کے لئے مدارس کھولنا، سیونگ بنک اور بحیرہ کی کمپنیاں قائم کرنا، قلعے و مائیں میں عمارت کا کام جاری کر دینا کہ ایک طرف یہ سب خیرات کی مسئلہ صورتیں ہیں اور دوسری طرف ان سے ملک میں افزائش ثروت بھی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خیرات کا مقصد اصلی انسان کی راحت و مسرت میں اضافہ کرنا ہے، اور ہر ایسی خیرات جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہو۔ بالکل جائز و مناسب ہے عام اس سے کہ کاروباری حیثیت سے اس کی افزائش ثروت ہوتی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خیرات مروجہ کی بعض شکلیں ایسی ہیں جن سے مسرت انسانی میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے گو ملک کی دولت میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ایسے لوگوں کی امداد کرنا جو محض اتفاق سے لنگر پڑے، اندھے، یا اور کسی طرح پر پابج ہو گئے ہیں یا جنھیں قحط، سیلاب و با، جنگ وغیرہ نے مفلوک الحال بنا دیا ہے۔ یا مثلاً اسپتال جاری کرنا کہ ان سے ایک طرف تو مریضوں کو علاج میں سہولت ہوگی اور دوسری طرف ان کے امراض ملک میں متعدی نہ ہونے پائیں گے۔ غرض خیرات مروجہ کے ایسے متعدد طریقے ہیں جو خواہ غیر اقتصادوی ہوں، لیکن اخلاقی حیثیت سے یقیناً محمود و لائق ستائش ہیں۔ خیرات کا یہ طریقہ بے شبہ مضرت ہے کہ ایک متمول شخص جو روپیہ کی افزائش سے اکتا رہا ہے اُسے بے موقع و بے محل داد و بخش میں لٹا رہا ہے اور یوں اپنی حاجت کو کاہل بنا رہا ہے۔ لیکن اس میں اور اس شخص میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو

اخلاس تشکدستی و پریشانی کو ان کے بلوں میں ڈھونڈتا ہو اور جب تک انھیں دُور نہ کر لیے ہیں نہیں لیتا۔ اقتصادیات نے اس میں شک نہیں اس موضوع پر بہت کاوش و تحقیق سے نظر کی ہے لیکن ہم تو اس سارے دفتر سے انھیں حقایق کی صدائے بازگشت سُنانی دیتی ہے جنہیں دو ہزار سال گزسے میروستلم بند کر چکا ہو۔

میرے نزدیک خیرات کے مفید ہونے کے لئے اصلی ضروری شرط صرف یہ ہے کہ دینے والے کے ذہن میں فی الواقع لینے والے کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ مسیحی سخاوت و فیاضیوں میں بھی عنصر غائب رہا ہے۔ مسیحیت نے خیرات کے مفہوم کو حقوق العباد میں نہیں بلکہ حقوق اللہ میں رکھا، اُس نے اس کی غایت رفقاء خلق نہیں رکھی بلکہ حصول ثواب رکھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اس طرف سے بالکل غافل ہو گئے کہ کون مستحق اعانت ہو اور کون غیر مستحق۔ ان کے لئے صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ ہمیں نیت کا ثواب بہر حال ملے گا۔ اس لئے مستحق کی تلاش ایک محنت بے سود ہو۔ خیرات کفارہ معاصی کا تو بہر صورت کام دے گی۔

اس طرز خیرات کے اثرات کا وجہ و گو شروع ہی سے تھا، البتہ وہ نمایاں چند صدیوں بعد ہوئے۔ تقسیم غلہ کا رومی دستور اقتصادوی نقطہ خیال سے ہر طرح میوب محتاج کے مقابلہ میں مسیحوں کا طریق خیرات بہت غنیمت معلوم ہوا۔ محنت و مشقت کی یہی پادری لوگ تعلیم دیتے تھے بلکہ آخر زمانہ میں تو بہت سے راہبوں نے اس کی ذلت کو لوگوں کے دلوں سے مٹانے کے لئے نو و محنت مزدوری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ با اس ہمہ گر جا کی ان مسرفانہ فیاضیوں کا یہ نتیجہ بغیر ظاہر ہونے نہ رہ سکا کہ جو گیوں، مصنوعی فقیروں اور پیشہ ور گدا گروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا، اور راہبوں کی بے شغلی و کاہلی ایک شہرت عام کی شے ہو گئی۔ ہر مخیر شخص کی تعریف کے جانے کا حشر یہ ہوا کہ ہزاروں موٹے تانے سنڈے گدا اگر گلی گوچہ میں دکھائی دیں گے اور خانقاہوں کے اجراء نے ان کی تعداد کو اور بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ ویلینٹیائی ان ایک سخت قانون بنانے پر مجبور ہوا کہ مضبوط و توانا گدا گروں کی سرغلامی ہے۔ اب مقتدایان کلیسیا نے

یہ چاہا کہ گداگری کے دامن سے اس ذات کے دھبہ کو دور کریں چنانچہ خود ہزار ہا رہبوں نے گداگری کا پیشہ اختیار کر لیا تاکہ اُس سے روپیہ لے کر غریب کو تقسیم کریں۔ اس طرز عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ جن ممالک میں خانقاہوں کی تعداد زیادہ تھی وہاں کی دولت و ثروت کو انھوں نے گویا بالکل چوس لیا۔ جس ملک کے ہزار ہا مضبوط و توانا جوان کاروباری زندگی کی طرف سے بے التفات ہاتھ پیر نہ ہلانے اور مصنف کی روٹیاں کھانے کے غور ہوں وہاں تمدن اور مادی ترقیوں کا کیونکر گزر ہو سکتا ہے؟ مسرفانہ فیاضی و حقیقت ملک میں متول نہیں بلکہ افلاس پھیلاتی ہے۔ انگلستان سے خانقاہوں کا استیصال اگرچہ بالکل بے موقع و بیجا طور پر ہوا تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اشخاص کے لئے خیانت و قلب کے مواقع بہت کم ہو گئے اور ملک کے افلاس میں نمایاں کمی ہو گئی۔ غرض کلیسا کی خدمت خلائق میں جو عظیم الشان کارنامہ ہیں اگرچہ ان کا پورا اعتراف ہر اور دنیا کی آرام رسانی و رفع تکلیف میں اُس کا جواہر حصہ ہے گو اس کا پورا احساس ہر تاہم یہ حقیقت بھی بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اس نے دنیا میں افلاس متول سے زیادہ پھیلا یا۔

بائیں ہمہ اس میں شک نہیں کہ خیرات پانے والے کے حق میں مفید ہو یا نہ ہو۔ مینے والے کے لئے بہر صورت ہوتی ہے۔ اس کا مصرف خواہ کتنا ہی بیجا ہو مگر اُس کے اخلاق پر یقیناً اس کا ایک بہتر و لطیف اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت قرون وسطیٰ کی پُر آشوب تاریخ میں میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ شقاوت، جہالت، تعصب و توحش کا دور دورہ تھا اگر جاکی یہ سخاوت ہر شعبہ میں اپنی تاثیر دکھا رہی تھی۔ گریگوری آف ٹورس کی تاریخ سے بڑھ کر ظلم و توحش کے واقعات کا تسلسل اور کہاں ملے گا؟ لیکن اس دفتر نظام کے شاید ہر صفحہ میں چند سطریں ایسے سلاطین و امراء و دولت کے ذکر کی ضرورت ملتی ہیں جنہوں نے فقر کی دیکھ کر کرنا اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا تھا۔ خود محاربات صلیبی سے زیادہ پُر آشوب زمانہ اور کون ہوگا لیکن ظلم و شقاوت غلو و تعصب نفس پرستی و درندگی کی اس گرم بازاری میں بھی مسیحی دُنیا میں

خیرات کے مصارف بدستور اعلیٰ پایہ پر جاری تھے جن میں سے ایک اسپتالوں کا وجوہ تھا جن میں
برص و جذام کا خاص طور پر علاج ہوتا تھا۔ سینٹ پیٹر نو اسکو شخصاً ظلم و شقاوت میں کسی سے
کم نہ تھے۔ تاہم قیدیوں کی طرف سے خدیہ دینے میں سب آگے آگے تھے جیسا کہ پیشتر بھی ذکر
آچکا ہے، اسی طرح شین اوئیل، آئر لینڈ کے مشہور سفاک امیر کی بابت مشہور ہے کہ بایں سفاک
و خون آشامی، جب وہ کھانے پر بیٹھتا تو اپنے منہ میں لقمہ رکھنے کے قبل کھانے میں سے کچھ
حصہ خیرات کے نام سے ضرور نکال دیتا اور دروازہ پر جو سایل بھی کھڑا ہوتا اُس پر پہلے بھجوا کر
خود کھانا شروع کرتا۔

مُسرفانہ فیاضیوں کے نقصانات جب زیادہ پھیلنے لگے اور پیشہ ور گروں کی تعداد
جب روز بروز بڑھنے لگی تو حکومت کو بار بار ان کی روک تھام کے لئے وضع قوانین کی
ضرورت پیش آئی۔ سب سے پہلے کنولس آف پرفورڈ نے غیر مستحق گروں کے خلاف آواز بلند کی
اور اصلاح کنیس کے قبل ہی ان کے السداد کی کچھ کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں اس کے بعد
انگلستان میں نہایت ظالمانہ قوانین باضابطہ طور پر پاس ہونے لگے کہ شاید ان کے خوف سے
گداگری کا رواج کم ہو۔ ہنری ہشتم کے زمانہ میں پارلیمنٹ نے یہ قانون بنایا کہ خیرات کا ایک
باقاعدہ نظام قائم ہے اُس سلسلہ سے الگ ہو کر جو کوئی متفرق طور پر گداگری کو کچھ دے گا اُس پر
اُس شے کا دس گنا جرمانہ ہوگا اور مضبوط و توانا گداگروں کی سزا پہلی بار یہ ہوگی کہ اُن پر تازیانہ
لگائے جائیں گے۔ دوسری بار یہ کہ تازیانہ بازی کے علاوہ ان کے بنا گوش کاٹ لی جائیگی
اور سہ بارہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ایڈورڈ ششم کے زمانہ میں ایک قانون جو اگرچہ کچھ ہی
عرصہ میں منسوخ بھی ہو گیا یہ پاس ہوا کہ ہر توانا گداگر جو روز گاریں لگنے سے بھاگے گا اُس کے
پیشانی پر داغ لگایا جائے گا۔ اور جو شخص اس کی اطلاع دے گا اُس کی دو برس تک اُسے
غلامی کرنا پڑے گی۔ اور اگر اس درمیان میں وہ مفور ہونا چاہے تو پہلی مرتبہ کی سزا دہائی غلامی
ہے اور دوسری مرتبہ کی سزا موت۔ اس اثنا میں بالک اس کا پورا اجاز ہوگا کہ اُس کے گلیں

طوق آہنی ڈالے اسے پایہ زنجیر رکھے اور اُس کے کوڑے لگائے۔ ایک مرتبہ کے بعد میں پہلے
 یہ قانون نافذ ہوا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کا جو مضبوط شخص گداگری کرتا ہوا پایا جاوے اُسے
 تیسری مرتبہ کے جرم میں سزائے موت ملے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس قانون میں یہ ترمیم کی گئی
 کہ اس کی سزا بجائے قتل کے دائمی غلامی یا جلا وطنی ہوگی، البتہ اگر وہ بھاگے یا واپس آنے
 کی کوشش کرے تو سزائے موت ملے گی۔ اسی ملک کے زمانہ میں قانون مخلصان پر نظر ثانی ہوئی
 گو جیسا کہ انھیں نے بعد میں ثابت کیا اس کا اثر کچھ یومیں سامعید پڑا۔ انگلستان کے علاوہ اورو
 ممالک میں بھی گداگری کے اعداد کے لئے سخت سخت قوانین پاس ہونے لگے میکس سیم
 نے جس سے بڑھکر پاپایان روم میں کوئی مُدبر نہیں ہوا ہر اپنے شہر میں اس کے روکنے کی
 خاص طور پر کوششیں کیں۔ چارلس پنجم نے سولہویں صدی کے گداگروں کے خلاف ایک سخت قانون
 نافذ کیا۔ اسی طرح لوئی چہارم نے فرانس کے لئے بھی سخت قوانین جاری کئے۔ لیکن عجیب
 بات ہر کہ ضوابط و قوانین کی مدد سے اس کی روک تھام کی تو بہت کوشش کی گئی۔ لیکن اٹھارویں
 صدی سے پیشتر کسی نے فلسفیانہ حیثیت سے اس کے اسباب پر غور کرنے کی کوشش نہ کی۔ سب سے
 پہلے انگلستان میں لاک اور آئرلینڈ میں برکلی نے اس پر اجمال نظر ڈالی۔ اُس کے بعد سولہویں
 صدی میں ڈیفونے اس موضوع پر رسالہ لکھا کہ محض خیر و خیرات کوئی فیاضی نہیں جس میں اس نے
 یہ دکھایا کہ انگلستان میں گداگروں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے۔ حالانکہ یورپ کے دوسرے
 ممالک میں مزدوری یہاں سے زیادہ گراں ہے۔ اور سولہویں صدی میں ایک اور کتاب اس سے بہتر
 روسی نامی کسی مصنف نے بہ مقام نمونہ شائع کی جس میں اُس نے نہایت تفصیل سے یہ دکھایا
 کہ اٹلی میں گداگری کا پیشہ صد سے زیادہ پھیلا ہوا ہے اور اس کی علت خیرات بے محل ہے جو
 مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اس سے بہت پیشتر لحد مینڈیوبل نے خیر و خیرات اور انعامات
 غریب کے دستور پر اعتراضات کی بارش کر دی تھی۔ اس کے بعد مائیکس کی تحریروں سے موضوع
 پر خوب خوب موثر گفتگیاں ہوئیں۔ لیکن زیر سے نزدیک مسیحیت پر کوئی اور نیا اعتراض وارد نہ ہوا۔

بجز ان اعتراضات کے جن کا ذکر اوپر گزر چکا۔

غربا کے ساتھ مسیحیت کے حُسنِ سلوک کی تاریخ نام تمام رہ جائے گی اگر اس میں اُس سوز و گداز کا ذکر نہ کیا جائے جس سے کلیسا نے انسانی تنہید کو متاثر کیا۔ ہماری اخلاقی زندگی پر بے زیادہ اثر ہمارے افعال و مشاغل کا ہوتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد ہی تخیل کا درجہ ہے۔ تخیل کا اثر اخلاق پر عقاید امتدالات سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے غربا کی تخیل کو صحیح اصول پر نشو و نما پہنچانا ان کا ایک لسانِ عظیم کرنا ہے۔ ان پرٹھ و دیہاتوں کی مفلس جماعت جن کی نہ سوسائٹی وسیع ہوتی ہے نہ جن کی نظر بلند ہوتی ہے اور جو بیچارہ کو لٹو کے پل کی طرح ہمیشہ ایک محدود دائرہ میں چکر لگاتے پر مجبور رہتے ہیں اور جن کے سامنے کوئی مستقبل اپنی خوش آئند توقعات کے ساتھ موجود نہیں ہوتا ان کی تخیل کو وسیع کرنے اور ان کے دل کو خوش رکھنے کا مذہب بے ہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ان بد نصیبوں کو اگر کہیں راحت و تسکین نصیب ہو سکتی ہے تو مذہبی خوش اعتقادیوں اور وہم آرائیوں سے اس نکتہ سے مقتدایانِ ملت شرک بھی غافل نہ تھے۔ ان کے یہاں بھی ہر دھقان کا یہ اعتقاد تھا کہ فصل و موسم، بارش و پیداوار غرض اس کی کھیتی سے متعلق ہر چیز کا ایک مخصوص دیوتا ہے اور وہ تمام دن ان دیوتاؤں کی معیت میں رہتا ہے۔ مسیحیت اس میں اتنی اصلاح کی کہ تخیل میں سوز و گداز پیدا کر دیا تاکہ ساتھ ساتھ اخلاقی زندگی کی بھی ذرستی ہوتی جائے۔ خود اپنی بانی یعنی مسیح کی مظلومیت، مریم کی زندگی کی دلگدازی۔ اور اور انبیاء، اولیاء کی مظلومیت و یکسی پر جو کتب مقدسہ میں بار بار زور دیا گیا، اُس کا منشا صرف یہ تھا کہ مظلومیت و تحمل شہید کی تصاویر مسیحی زندگی کی ہرز بن جائیں اور غربا اپنی حالت پر مطمئن اور ان سے صبر حاصل کرتے ہیں۔ گر جا کے اندر نماز و عبادت کے وقت شادی کی تقریب پر بھین و تدفین کے موقع پر قبرستان میں نظروں کے سامنے پہاڑ و سمندر کے سفر میں جلوت و خلوت میں، غرض غربا کو ہر جگہ جب اپنے سامنے اور گرد پیش مظلومیت و یکسی کی مقدس تصویریں نظر آتی ہیں تو لازمی طور پر ان کے تقدس و احترام کا نقش ان کے دلوں میں پر بیٹھ گیا اور انھیں بجائے تخلیق کے اپنی مصیبتوں سے

تسکین و تسفی حاصل ہوتی تھی۔

یورپ کی تاریخ اخلاقی پر کلیسا کی فیاضیوں کے جو اثرات پڑے انھیں کافی تفصیل سے دکھایا جا چکا۔ جہاں جہاں اثرات مضر ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے اغماض نہیں کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہیں یہ کہتے ہیں مطلق تامل نہیں کہ گرجا کے احسانات کا پلہ بہت ہی دینی رہا ہے۔ قلوب میں حیات بشری کا تقدس و احترام، طفل کشی و اسقاط کے دستور کی بجائے غلاموں کے مرتبہ کی بلندی، اور بالآخر ان کی آزادی سیانی کے خونریز مناظر کا استیصال خیرات کا ایک اعلیٰ و وسیع سپانہ پر انہماک، غرباء کے تحفل کی اصلاح و تقویت، یہ تمام کارنامے ایسے ہیں کہ قدامت ان سے بڑھ کر کیا، ان کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ انھوں نے دنیا کی مسرت و راحت میں غیر معمولی اضافہ کیا اور شاید اس سے بھی زیادہ پاکیزگی اخلاق میں کیا اخلاق کے جن شعبوں کا تعلق گدا زور و راحت و ہمدردی سے ہو وہ تو گویا تمام تر مسیحی معیار اخلاق ہی کی تخلیق ہیں۔ قرون اولیٰ میں مسیحیت کی یہ خصوصیت بدرجہ اتم قائم رہی۔ لیکن تیسری صدی سے جبکہ رہبانیت کا زور ہوا، اس میں کافی فرق پڑ گیا اور اب اس کی توجہ دوسری چیزوں کی طرف بٹ چلی۔

فصل (۵) رہبانیت کی تاریخ

ٹرولین دوسری صدی عیسوی میں لکھتا ہے کہ ہم لوگوں کا طرز معاشرت ہندوستان کے جوگیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ وہ لوگ دنیا سے الگ تھلک جنگل و بیابان میں تنہا رہا کرتے ہیں ہم لوگ برابر دنیا کے کاروبار میں شریک اور مشرکوں تک سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ ٹرولین کے یہ الفاظ اگرچہ بیان واقعہ کے لحاظ سے صحیح ہیں کیونکہ مسیح کے دو سو سال بعد تک کلیسیا میں

کوئی راہب نہ تھے، تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ جو جذبہ راہبانہ زندگی کو اختیار کرنے کا محرک ہوتا ہے۔ اس کا تخم اس سرزمین میں شروع ہی سے موجود تھا۔ رہبانیت کے اصل الاصول یہ دو ہیں۔ عورت سے ہم بستری نہ کی جائے۔ دنیا کے تعلقات کو ترک کیا جائے۔ اب غور کرو کہ ان میں سے کون خیال ایسا ہے جو ابتدا ہی سے کلیسا کی زندگی میں موجود نہ تھا؟ دوشیزگی کا اترام غفلت و تقدس روزِ ازل سے مسیحیت کی گمنی میں پڑا تھا۔ اور یہ صاف رہبانیت کے پہلے اصول کی تائید تھی۔ رہا دوسرا اصول سو اس بارہ میں بھی مسیحیوں کو شروع ہی سے تاکید تھی کہ اپنے گرد و پیش ملک و وطن کے غیر مسیحیوں سے علیحدہ رہیں۔ اس بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ کچھ لوگوں نے اپنی امتیازی حیثیت کو قائم کرنے کے لئے مسیحیت کے عروج و رجحان کے زمانہ میں بھی اپنی علیحدگی و خلوت پسندی کو جو ابتداً عام طرز معاشرت تھی برقرار رکھا۔ یہ سبب بجا خود کافی تھا۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ رہبانیت کی جو اس وقت ساری دنیا پر محیط ہو رہی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی ایک خاص جماعت اس عام دبا کے اثرات سے غیر متاثر رہے۔ خود یہودیوں میں حالانکہ ان کی شریعت اس کے بالکل مخالف تھی ایک فرقہ ایسا موجود تھا جو بالکل خانقاہ نشین تھا، اور تہجد و ترک تعلق کی زندگی بسر کرتا تھا۔ رومہ کا یہ حال تھا کہ گواصولاً وہ رہبانیت کا بالکل مخالف تھا تاہم اس کے حکماء متاخرین اپنا رجحان اسی طرف ظاہر کرنے لگے تھے بلکہ کلیہً تو علانیہ ترک دنیا کی تعلیم دینے لگے تھے۔ مصری فلسفہ جو چند روز میں یورپ پر حاوی ہو گیا تھا۔ یونانی فلسفہ سے ابھی زیادہ اسی زاہدانہ طرز زندگی کا موید تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد فرقہ جن کے عقائد کے ڈانڈے مسیحی عقائد سے ملے ہوئے تھے اسی طرز زندگی کی تائید کر رہے تھے غرض دنیا رہبانیت کے استقبال کر لئے ہمدرد تیار تھی اور مسیحیت میں یہ استعداد تو شروع ہی سے موجود تھی صرف قوت سے فعل میں منتقل ہونے کی ضرورت تھی اور یہ انتقال ڈیلسین تقدیوں کے زمانہ میں واقع ہو گیا۔ روایت ہے کہ سب سے پہلے راہب پال نے صحرا میں جا کر ساکت اختیار کی، اس کی تقلید

انٹونی نے کی اور پھر تو کچھ روز صبر میں اچھی خاصی آبادی قائم ہو گئی بشرطہ کہ تعداد یوں کا مسیحی نفوس بہ ایک اشریہ بھی پڑا کہ جو شخص مذہب کے لئے بعتی زیادہ تکالیف اٹھاتا ہے اُسی قدر اُسے ثواب ملتا ہے۔ پس تعدیوں کے خاتمہ پر جب مظالم برداشت کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا تو خوش اعتقاد ہمسیتوں نے جنگل میں جا جا کر طرح طرح کی تکالیف پہنے لئے پیدا کیں۔ لوگوں کی تخیل کو اس طرز زندگی سے خاص طور پر کوشش کر کے متاثر کیا گیا۔ نئے لوگ اس میں اہتمام سے بھرتی کئے جانے لگے اور اس داخلہ میں عورتوں نے پوری سرگرمی سے کوشش مشغ کی عورت پر جب مذہب کا رنگ غالب آ جاتا ہے تو وہ کسی محبت کسی رشتہ کا لحاظ نہیں کرتی۔ کسی گزشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بُت پرست شوہروں کی مسیحی بیویاں اپنے شوہروں سے چھپا چھپا کر مسیحوں سے رابطہ رکھتی تھیں۔ یہی صورت اب بھی پیش آئی۔ راہبوں نے اپنا جادو عورتوں پر ڈالا اور انہیں چرا چرا کر اپنی اولاد کو راہبانہ زندگی کے لئے تیار کرنے لگیں۔ باپ اپنی اولاد کو کسی ملکی سیاسی یا جنگی خدمت کے لئے تجویز کرتا ہی رہ جاتا تھا اور اُدھر ماں سب ٹھیک ٹھاک کر کے اُس کا ہاتھ کسی راہب کو پکڑا دیتی تھی۔ بیسیوں راہب مغللوں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے۔ جمہور پر اب خطیبوں کے بجائے واعظوں کا اثر تھا اور ایسے ایسے ذی اثر واعظین جیسے۔ ایملہ وز، انگٹابن، کریڈوسٹم، میسل، و گری گوری تمام تر رہبانیت کی حمایت میں وعظ کرتے تھے۔ پھر ہر عمل کے لئے ردِ عمل بھی ضروری ہوتا ہے ملک کے عام تعیش و انہماک دنیا داری کے خلاف ردِ عمل ہونا لازمی تھا اور وہ یوں ہوا کہ صد ہا افراد شہر کی زندگی سے اُلٹا کر جنگل میں جا کر بس گئے۔ بہت غلام و مجرمین بھی قانونی گرفتوں سے بچنے کے لئے وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ چند روز کے بعد رہبانیت کے وجوب و استحسان پر پستی استدلالات بھی قائم ہونے لگے۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ ”خود مسیح تو تارک الدنیا نہ تھے۔ بلکہ اچھی خاصی طرح اسی دنیا کے کاروبار میں رہتے تھے، ان کے بعض اتباع مخصوص میں عورتیں تھیں اور خود حضرت نے اپنے فرض تبلیغ و ارشاد کی ابتدا را ایک شادی کی تقریب کے ہی ”موئیدان

رہبانیت مسیح کے بحر و مہم کے کنولہ پر، اور نوجوان امرا کو مسیح جو خاص طور پر پسند و نصیب کرتے تھے، ان چیزوں کو سند آپیش کرتے تھے۔ حواریان اعظم میں سینٹ پیٹر (پطرس) کا جو درجہ ہوا ہے وہ مخفی نہیں، حالانکہ وہ متاثر تھے۔ اس اعتراض کی تاویل یوں کی جاتی تھی کہ وہ شرف حواریت حاصل کرنے کے بعد کبھی اپنی بیوی سے ہم بستر نہیں ہوئے، بلکہ دیگر حواریوں کی طرح ہمیشہ ہم بستری سے محترز رہے۔ سینٹ پال خود بھی غالباً مجروح تھے اور بحر و کی تائید میں عجیب و غریب دلائل پیش کرتے تھے۔ اس طرز استدلال کی ایک دلچسپ مثال سینٹ جروم کے الفاظ میں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کشتی فوج پر پاک جانور جو سات سات کی تعداد میں سوار کئے گئے اور ناپاک جانوروں کے جوڑے لئے گئے، اس کے ذریعہ سفید نے بحر و کی افضلیت دکھا دی۔ پھر جو جانور جفت عدد دیں لئے گئے ان کا بھی ایک ہی ایک جوڑا رکھا گیا تاکہ انود واج کمر کی مصیبت کیونکہ کبھی ارتکاب نہ ہو سکے اس زمانہ سے تمام دنیا کو سمجھ گئے اُسوہ سنہ سینٹ جیمس کلابود قرار پایا جس کی ذات میں تمام فضائل انسانی مجتمع تھے اور جو رحم مادری سے مقدس و مہلک پیدا ہوا تھا اس کے اوصاف یہ تھے کہ

”وہ شراب مسکرات و لحم جو انات سے محترز تھا۔ اُس کے سر پر کبھی استرہ نہیں لگادہ نہ کبھی حمام میں گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا، اُس نے ہمیشہ سونے کپڑے پہنے، اُن کی پوشاک کبھی نیس نہ بنی۔ گرجا کے اندر وہ روز تنہا جا یا کرتا۔ اور گھنٹوں کے بل جھک کر گھنڈیا خلقت کی منفرت کی ذمائی کیا کرتا۔ اس عمل کی مزاحمت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُس کے گھنڈیوں کے گھنٹوں کی طرح سخت ہو گئے۔“

اس تحریک رہبانیت کی اشاعت۔ لیکن نے خوب کہا ہے کہ اسی قدر تیز یا اسی قدر مست تھی، جتنی خود تحریک مسیحیت کی تھی۔ اُس وقت کے کل زاہدوں کا مجموعی شمار ظاہر ہے کہ مورنین کے اخلاف بیان کے باعث قطعی طور پر نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم اس کا اندازہ اعداد و ذیل سے ہو سکتا ہے۔ سینٹ بیکو میں کے زیر تربیت (۷۰۰)، راہب تھے سینٹ جروم کے زمانہ میں ایلیٹر کی تقریب پر

تقریباً.... ۵۰۰ راہبوں کا مجمع ہوتا تھا۔ چوتھی صدی میں اکیلے صحراے نیٹریا میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں ۵۰۰۰ راہب تھے۔ مصر کے ایک شہر کی ساری آبادی انھیں لوگوں کی ماتحتی اور ان کی تعداد.... ۱۰۰۰ راہبوں اور ۲۰۰۰ کنواریوں کی تھی۔ سینٹ سرہین کی ماتحتی میں ۱۰۰۰۰ راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاهدوں و راہبوں کی تھی۔ مصر رہبانیت کا وطن اصلی تھا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت میں یہ ہوا تمام مسیحی ممالک میں چل گئی۔ سینٹ زینو، بونٹینس نے اسے اٹلی میں روشناس کیا اور پھر سینٹ جروم نے اسے یہاں خوب ترقی دی۔ سینٹ ہیرن نے اس کی تخم ریزی فلسطین میں کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہزار ہا شخص اس حلقہ میں داخل ہو گیا اور اس کا دائرہ سیارہ تک وسیع ہو گیا۔ آرمینیا اور اس کی مضافات میں اسے سینٹ بونٹینس نے پھیلا یا اور دریائے یوگسین کے کنارہ سینٹ میل نے گال میں اس کی بنائے۔ سینٹ مارٹن کے ہاتھوں پڑی اور جب انھوں نے وفات پائی تو ۲۰۰۰ راہبوں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور صد ہا نامعلوم الاسم مشنریوں نے اسے حبش، جزائر بحر روم، آئرلینڈ و دیس میں رواج دیا۔

اسی سلسلہ میں حیرت انگیز صرف ان تارکان دنیا کا شمار ہی نہیں۔ بلکہ اس سے عجیب تر یہ کہ جو لوگ اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے اس طریق زندگی کے دشمن شدید تھے وہ تک ان لوگوں کا احترام و اکرام کرتے تھے۔ سینٹ آگسٹین جو بجز کے خطرات و نقصانات سے پوری طرح واقف تھا، سینٹ ایلمبروز جو ایک ذوراندیش مذہب تھا، سینٹ جروم و سینٹ میل جو عالم مبتحر تھے، سینٹ کریزوسٹم جو جمہور روم پر ایک زبردست خطیبانہ اثر رکھتا تھا، یہ سب سب اس راہبانہ طریق زندگی کے پرجوش وکیل ہوئے ہیں۔ اور سینٹ آرسینس جو بدلتوں شاہ اریکیہ کے دربار میں رہ چکا تھا، خود ایک زبردست زاہد و متاوض ہو گیا۔ ہزار ہا زائرین ان بزرگان صحرا کے شوق زیارت میں بیاباں نور دی کرتے پھرتے اور لوٹ کر ان کے خوارق حادث

کرامات و معجزات کی عجیب عجیب داستانیں ملک میں پھیلاتے۔

فصل (۶)

راہبان صحرا

دنیا کی تباہ اخلاق میں شاید اس وباؤ بہانیت زیادہ پردہ و پُراثر کوئی داستان نہیں غصیب ہو کہ وہ قومیں جو قلاطون و سرور کے خم کدہ سے سرشار تھیں اور جن کی نظروں کے سامنے سقراط و کیٹو کی پاک و محترم سیرتیں موجود تھیں اب ان کا طمع نظر ان کا نصب العین ایک ایسا حیر و ذی و فرومایہ حراتی وجود رہ گیا تھا جو جہالت کا پتلا، خب و طن سے معرا اور لطائف خلقی سے بے بہرہ ہو جس کی زندگی تمام تر ظالمانہ خود آزاریوں کے لئے وقف اور جسے شدت دہم و جنوں سے خود اپنے سایہ پر دیو چن کا لگان ہوتا ہو۔ دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کشی منتائے اخلاق سمجھی جاتی رہی سینٹ جروم کس مزہ سے بیان فرماتے ہیں کہ ایک راہب صاحب نے ۳۰ سال تک صرف نان جو میں اور خاک الود پانی پر بسر کی تھی۔ ایک اور بزرگ مدۃ العمر ایک تنگ تاریک غار میں رہا کئے اور کبھی روزانہ غذا میں پانچ انجیروں سے زیادہ نہ کھایا۔ ایک تیسرے بزرگوار ان سے بھی بڑھ چڑھ تھے۔ یہ حضرت سال بھر میں صرف ایک بار ایسٹر کے دن اپنی حجامت بنواتے تھے۔ کبھی کپڑے دھوئے تھے اہد نہ کبھی لباس بدلتے تھے، تا وقتیکہ وہ خود ہی پارہ پارہ ہو کر جسم سے علیحدہ نہ ہو جائے آنکھوں کی بصارت نے شدت فاقہ کشی سے جواب دید یا تھا اور جسم کی جلد مثل پتھر کے سخت اور کھڑکھڑی ہو گئی تھی۔ اسی طرح سینٹ میکس اسکندر رومی کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کئے تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی کھنکیاں ڈلیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوسہ کا وزن اپنے اوپر لا دے رہتے تھے۔ ان کے

مریدینٹ یوسپس اس سے بھی باڑی لے گئے تھے کہ یہ حضرت ہمیشہ تقریباً دو من بوجہ کا وزن لاوے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے۔ سینٹ سبین ہمیشہ وہ غلہ استعمال کرتے تھے جو ایک مہینہ تک پانی میں پڑے پڑے سڑ گیا ہو۔ سینٹ میکس نے چالیس شبانہ روز خاردار جھاڑیوں کے اندر گزارے اور چالیس سال تک سونے کے وقت کبھی لیٹے نہیں۔ سینٹ پیکو میں بھی پندرہ سال تک اس ریاضت پر عامل ہے۔ بعض حضرات نے سینٹ مارکین کی طرح یہ عادت ڈال لی تھی کہ رات دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور وہ بھی صرف اس مقدار میں کہ رشتہ حیات منقطع نہ ہونے پاؤ۔ چنانچہ اسی جماعت کے ایک رکن کی بابت منقول ہے کہ دن کی روزانہ غذا صرف ۳ چھانک روٹی اور چند جڑی بوٹیاں تھیں وہ کبھی بستر یا چٹائی پر نہیں سوئے بلکہ کبھی استراحت کے طریقہ پر لیٹے تک نہیں یہاں تک کہ اکثر فطربیداری سے یہ حالت ہوتی کہ کھانا کھاتے کھاتے نہیں نیند کا جھونکا آجاتا اور منہ سے نوالہ بے اختیار گر جاتا۔ بعض حضرات ایک دن ناغہ دے کر کھانا کھاتے۔ بلکہ ایک گروہ کی بابت تو یہاں تک مشہور ہے کہ ایک ایک ہفتہ تک وہ منہ میں دانہ نہیں ڈالتے تھے۔ چنانچہ سینٹ بیکر کی بابت روایت ہے کہ وہ ہفتہ بھر فاقہ کتے تھے اور اتوار کے دن چند کچی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے اسی طرح ایک اور مشہور راہب یوننا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے بلکہ سب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے اور ہفتہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتے اور وہ کھانا کیا ہوتا؟ صرف وہ تبرکات جو اگرچہ اتوار کے روز لاٹے جاتے تھے۔ راہبوں کے ممکن علی العموم اُس وقت مکانات میں ہوتے تھے۔ بلکہ وحشی و زندان کے غار خشک کنوئیں یا قبرستان۔ بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے۔ ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے۔ عراق و شام میں ایک اور طایفہ اہل مذہب کا رہتا تھا جس کا مسلک

یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ کھلے میدانوں میں پہاڑوں کی وادیوں میں رہتے تھے اور گوشت یا روٹی کے بجائے صرف گھاس کھاتے تھے۔ جسم کی طہارت، روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو زائد مرتبہ زہد میں مبتلی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے۔ اسی قدر وہ مجسمہ عنفوت و غلاظت ہوتے جاتے تھے۔ سینٹ ایٹینس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انٹونی، بہ ایں کبیر سنی، کبھی مدۃ العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا ترک نہیں ہوا۔ سینٹ پیمنس میں اس قدر استقلال تھا اُس سے آخر عمر میں ایک باریہ گناہ سرزد ہو گیا تھا اور جب اپنی بریت میں اُس نے یہ کہا کہ میرا مقصود جسم کشی نہیں بلکہ جذبات کشی ہے تو زاهدین و راہبین کی جماعت فرط حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ سینٹ ابراہام جن کی بابت خوش عقیدہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ حسن و جمال میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے اور ان کے چہرہ سے نور باطن ٹپکتا تھا اپنی وضع کے ایسے پکے تھے کہ چہاہ سالہ میسی زندگی میں انھوں نے اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی کبھی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ سینٹ امین نے کبھی اپنے تئیں برہنہ نہیں دیکھا۔ پیلو یا ایک مشہور دوشیزہ ہوئی ہیں۔ ان کا سن شبیر لیف ساٹھ سال تک پہنچ گیا تھا اور بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئیں لیکن کبھی بجز اپنی انگلیوں کے اور کسی حصہ جسم میں پانی نہیں لگنے دیا۔ سینٹ بوفریکیا ۳۰ کنواریوں کی ایک جماعت میں شریک ہوئی جن کا اصول یہ تھا کہ یہ کبھی اپنے پیر نہیں دھوتی تھیں اور غسل کے نام سے تو لہرز اٹھتی تھیں۔ ایک زائد صاحب ایک بار رستہ میں چلے جاتے تھے کہ حضرت کی نظر اپنے عکس پر پڑی تو یہ دیکھا کہ جنگل میں ان کے آگے آگے ایک تنگا دھڑنگا مرد جس کا سارا جسم شدت کثافت و غلاظت سے سیاہ پڑ گیا ہے چلا جا رہا ہے مگر خوش عقیدگی کا بھلا ہو کہ حضرت اسے بجائے اپنا عکس سمجھنے کے یہ سمجھے کہ کوئی شیطان و وسوسہ اندازی کے لئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ مصر کی سینٹ میری اپنے زمانہ میں ایک بہت حسین عورت تھی اس نے اپنے گناہوں کا کفارہ یوں کیا کہ پورے ۷۷ سال تک کبھی اپنے کسی حصہ جسم کو نہیں دھویا۔ بعض زائد کبھی جرات کر کے صفائی جسم پر اگر کبھی توجہ کرنے بھی لگتے تو ان پر سخت لعن طعن ہوتی۔ راہب الگوندز کس تاسف و تحیر سے

فرماتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ و صونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک صحرانے خانقاہ نشین زاہدوں کو پانی کی سخت تکلیف تھی۔ یقیناً وہیں نے جناب باری میں اس کی فریاد کی۔ دعا قبول ہوئی اور ایک چشمہ جاری ہو گیا۔ پانی دیکھ کر زاہدوں کے دل میں لہر آئی اور وہ اس میں غسل کرنے لگے۔ ابھی ایک ہی بار غسل کیا تھا کہ غضب الہی نازل ہوئی چشمہ بند ہو گیا تو یہ دستغفار کفارہ دروزہ شروع ہوئے۔ لیکن سال بھر تک یہ تمام چیزیں بے اثر رہیں۔ آخر کار جب حمام مہار کر دیا گیا تب چشمہ دوبارہ رواں ہوا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی روایات منقول ہیں۔ مگر شاید سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ تھہ سینٹ سیمو کا ہے جس کے متعلق یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر غلاظت و نجاست کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ حضرت نے اپنے جسم کے اگر داگر و ایک رسی اس قدر مضبوط اور کس کر کے باندھی تھی کہ وہ گوشت کے اندر پوسٹ ہو گئی تھی اور سارا گوشت سر گیا تھا۔ یہ سزا خدا اس قدر تیز تھی کہ پاس بیٹھنے والے ناک نہیں دے سکتے تھے اور زخموں میں سے کینرے برابر پٹکا کرتے تھے۔ بعض دفعہ آپ خانقاہ کا قیام چھوڑ کر ایک خشک کنوئیں میں جو شیاطین کی لہتی سمجھا جاتا تھا سکونت اختیار فرماتے تھے۔ حضرت نے تین منارہ بنوائے تھے جن میں سے ایک ۶۰ فٹ بلند اور صرف ۲ گز کے دور کا تھا آپ اس کے اوپر ۳۰ سال تک سکونت گزریں رہے اور اکثر اس تیزی سے سجدہ کرتے رہے کہ ایک شخص نے جب ان سجدوں کو شمار کرنا چاہا تو اس نے ۴۴۴ تک شمار کیا تھا کہ تھک گیا۔ یہی بزرگ پورے سال بھر تک صرف ایک پیر کے بل کھڑے رہے اور دوسرا پیر زخموں اور ناسوروں سے چور ہو گیا تھا لیکن ایک مرید کو جو ہر وقت پاس ہی رہتا تھا یہ حکم تھا کہ جوں ہی اس زخم سے کوئی کیڑا نکل کر آگے آئے پھر اٹھا کر اسی جگہ پر رکھ دے اور خود اس کیڑے سے فراتے جاتے تھے

کہ خُذْ لَنَا مِنْهُ جُزْءًا مِمَّا رَزَقْنَاهُ ۖ اِنَّ اِلٰهَنَا غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ان حالات کو مَن مَن کر صد ہزار مَن دُور دراز ممالک سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور جب ان کا وصال ہو گیا تو زاہدین و رہبرین کے ایک بجم غفیر فی خانہ کی مشابعت کی۔ ان کے تمیز کردہ ستون کے اوپر ایک ستارہ و خوشا طالع ہوا۔ سب نے انھیں اِیْتٌ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰهِ قرار دیا اور صد ہار مہین ان کے نقش قدم کی پیروی پر کمر بستہ ہو گئے۔

راہبوں کے سوانح زندگی یہاں جو تفصیل سے بیان کئے گئے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے نزدیک درجہ خلاق پر جتنی ان سے روشنی پڑتی ہے اتنی کسی اور شخص سے نہیں پڑتی۔ خالص تاریخی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ کچھ بھی اہم نہ ہوں۔ لیکن اخلاقی حالت کا سراغ لگانے کے لئے سجد اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے یہ بے شبہ نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے اعمال و افعال کیسے تھے۔ تاہم ان کی اندرونی زندگی کا اگر تہہ چل سکتا ہے تو اسی ذریعہ سے پادریوں کی تصانیف گرجا کے فرامین اور اور تحریروں سے صرف ظاہری معلوم ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اہل کلیسا اپنی تین دنیا کے سانئو کس رنگ میں ظاہر کرنا پسند کرتے تھے لیکن اس امر پر کہ وہ فی الواقع کیسے تھے اگر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے تو صرف ان کی سوانح عمریوں پر نظر کرنے سے ان کے اعمال و دست و زبان کا سراغ اور طریقوں سے بھی چل سکتا ہے لیکن اعمال دل و دماغ کا صرف اسی ایک طریقہ سے اور اس ذریعہ سے جو کچھ حالات ہم تک چشم دید گواہوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں گو ان کی جزئیات و تفصیلات میں رنگ آمیزیوں سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم ہمیں یہ کہنے میں ذلتا مل نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ بالکل صحیح و مطابق واقعہ ہیں۔ خود آزار دیوں کی چند مثالیں جو اوپر درج کی گئی ہیں انھیں صرف مشتے نمونہ اور زور سمجھنا چاہیے۔ ورنہ اس قسم کے واقعات اگر ہم تفصیل سے درج کرنا چاہیں تو کسی ضخیم جلد میں تیار ہو جائیں اور ہو جائیں کیا معنی، واقعہ تیار ہوئی ہیں سینٹ بندیکٹا کے وقت تک یہ معیار اخلاق تمام دنیا سے مسیحیت پر مستطرب رہا کہ جو جتنا زیادہ جسم کو مبتلائے آزار و تکلیف رکھے گا

اسی قدر روحانی ترقی حاصل کرے گا۔ مغرب کی آب و ہوا ایسی نہ تھی کہ وہاں کے رہسین
 علماء مصری راہبوں کا زہد و ریاضات میں مقابلہ کر سکتے۔ تاہم معیار اخلاق ان کا بھی یہی تھا
 اور وہ عملی زندگی میں اپنے ریاضتوں کی کمی کی تلافی، معجزات و کرامات میں افراط کے ذریعہ
 سے پوری کر دیتے تھے۔ سینٹ جروم اور اس کے بعض رفقاء نے زہد و ریاضات کی ان
 ناقابل برداشت سختیوں کو کسی قدر ہلکا کرنا چاہا جن کے نتائج جنون خود کشی کی شکل میں ظاہر
 ہونے لگے تھے۔ اور جن کے باعث بیسیوں راہب گرجائی حکومت سے آزاد ہو کر ادھر ادھر
 اب مانگتے پھرتے تھے۔ لیکن ان مصلحین کی کوششیں کچھ زیادہ چلنے نہ پائیں۔ اکثر راہبوں
 تارکے پتوں کی چٹائیاں بنانے کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا لیکن بادیہ نشینی نے ان کی
 ضروریات زندگی تو کچھ رکھی ہی نہ تھیں اس لئے رُفقا رُفقا انھوں نے یہ پیشہ بھی ترک کر دیا۔
 اور اب سب سے زیادہ تقدس و احترام کا حقدار وہ سمجھا جانے لگا جو سب سے زیادہ خود آزاریوں
 کا عادی ہو۔ لیکن اس اخلاقی معیار کی بحیثیت دیکر نگلی کے باوجود اختلاف طبائع بھی اپنا
 اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔ مثلاً بعض جاہل، کابل، اپانج و کندہ نائراش راہب ایسے بھی ہوتے
 تھے جو دنیا کی جدوجہد سے رہبانیت کی پناہ میں آجانا غنیمت جانتے تھے اور اپانج پن کی
 زندگی پرٹسے پرٹسے گزارا کرتے تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو خوشنما کیا رہا
 اور چمن وغیرہ کے بنانے میں مشغول رہتے تھے، سینٹ سیراپین کے متبعین کا شکاری
 میں مصروف رہتے تھے اور غربا کے لئے غلہ کی کثیر مقدار مفت روانہ کیا کرتے تھے۔ ایک
 راہب زندہ دلی میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگ اُس کی صورت دیکھتے ہی اپنے غم و حزن کو
 بھول جاتے تھے۔ لیکن یہ ایک استثنائی مثال تھی۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ راہب کا جوہ
 ایک دہشت کہہ رہا کرتا تھا۔ شیاطین کے وسوسہ نڈازی کا خوف عالم آخرت کی دہشت
 آہ و اشکباری، نالہ و فریاد، یہ ان زاہدون کا اور عتاب چھوٹا تھا۔ علم و تعلیم کے تذکرہ گویا بالکل
 ممنوع تھے۔ سینٹ جروم کا مقولہ تھا کہ راہب کا فرض تعلیم دینا نہیں بلکہ روناؤ لانا ہے۔

ایک بڑی بات یہ تھی کہ التباس جو اس کے اثر سے دیو و شیاطین کی خیالی صورتوں کا
 نظر آتا برگزیدگی و تقدس کی سبب بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور چونکہ تعلیم یافتہ دماغوں پر
 یہ اثر کم ہوتا تھا۔ اس لئے راہبین کی جماعت میں جہلاً اور جہالت کو خاص فروغ حاصل تھا
 سینٹ انٹونی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں محض اس بنا پر پڑھنا چھوڑ دیا تھا کہ پڑھنے
 کھنے میں دوسرے طالب علموں کا ساتھ ہو گا اور ان سے مکالمات و مجالست کرنا بڑے گی
 سینٹ جروم ایک زمانہ میں سسرو کے بڑے معترف تھے۔ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک
 روز شب کے وقت انھیں فرشتہ آسمان پر مسیح کے سامنے اٹھائے گئے اور وہاں یہ فرد جرم
 عاید کی گئی کہ یہ مسیح کے بجائے سسرو کے کلام کو پڑھتا ہے۔ چنانچہ اس جرم پر فرشتوں نے
 اچھی طرح ان کی تازیانہ بازی کی۔ ان کے اوپر ان کے رُفقا کی طرف سے بھی ایک خاص اعتراض
 یہ ہوتا تھا کہ وہ مشرک مصنفوں سسرو، ورجل وغیرہ کو پڑھتے اور ان کی تعلیم دیتے ہیں۔
 بعض راہبوں کا کتب خانہ تمام تر انجیلوں پر مشتمل ہوتا تھا، جسے وہ فروخت کر کے غربا کی امداد
 کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک راہب نے کسی دوسرے راہب کے پاس چند کتابیں رکھی ہوئی دیکھ لیں
 اور اس پر وہ نہایت برہم ہوا۔ ایک اور راہب کی بابت روایت ہے کہ وہ علم اللسان کا بڑا ماہر
 تھا۔ راہب ہو کر اُس نے اس گناہ کا کفارہ یوں کیا کہ سال تک سکوت مطلق اختیار کر دیا۔
 یہ طرز معاشرت و زندگی رکھنے والوں کے لئے معجزات و کرامات میں کوئی استقبالیہ
 باقی ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ اور التباس جو اس کے جتنے عناصر ہیں وہ سب کے سب اگر اس طرز معاشرت
 میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ جہالت و ہم پرستی، خلوت نشینی، استہلاک زہد و ریاضت اور دیو و شیاطین
 کے وجود پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد و ان سب چیزوں کے مجموعہ کا قدر تا یہ اثر پڑتا تھا کہ خیالی
 صورتیں حقیقی نظر آنے لگتی تھیں۔ پھر قبرستانوں میں لاشوں کے انبار کے درمیان سکونت
 اختیار کر سنبے اور شب تار میں نینان و لوق و دوق صبح میں تنہا ریاضت کرتے وقت جبکہ
 کان میں صرف وحشی درندوں کی آواز ہر طرف سے آتی ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں اکثر ان

عابدوں کا واہمہ یہاں تک زور پکرتا تھا کہ شہوت انگیز یا دہشت ناک مناظر متکفل ہو ہو کر انکی آنکھوں کے آگے چلتے پھرتے نظر آنے لگتے تھے۔ متخیلہ پر فوق الحد بار ڈالنے اور جسم کو بیحد کمزور و ناتوان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف و متضاد جذبات مثلاً اضطراب و فزع و دفعۃ تیزی کے ساتھ ان عابدوں کے نفوس پر مسلط ہو جا یا کرتے تھے اور یہ انھیں کسی فوق الفطرت قوت کی کرشمہ سازیوں کا خیال کرتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس تہائی اور سناٹے میں جبکہ یہ اہل تقویٰ اپنی توجہ کی یکسوئی و استغراق کی کوششوں میں مصروف ہوتے تھے۔ یک بیک ان کے ذہن میں پچھلی مسرتوں کی یاد آ جاتی۔ کبھی یہ یاد ان پیاری صورتوں کی ہوتی جن پر ایک زمانہ میں ان کی نگاہ محبت پڑا کرتی تھی کبھی اُن نعمت ہائے شیریں کی ہوتی جن کی آواز کو ایک وقت میں یہ جان کے برابر عزیز رکھتے تھے اور کبھی یہ عباد یہ خواب بیداری دیکھتے کہ گویا تانی کے اکھاڑے میں موجود ہیں۔ اور سامنے بوڑھیں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف خفیت و خیف امر کا انتساب شیطانی مداخلت کی طرف کیا جاتا تھا۔ ایک راہب کی بابت روایت ہے کہ جب وہ جنگل میں چلتے چلتے بہت خستہ ہو گیا تو اُس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اس تازہ شہد کہیں مل جاتا تو طبیعت کو کیسی تفریح ہو جاتی۔ اتنے میں اس کی نگاہ سامنے کی چٹان پر پڑی تو دیکھا کہ واقعی کھینولہ کا چھتا لگا ہوا ہے۔ یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن راہب پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ وہ اسے قطعاً شیطان کی دوسرہ اندازی سمجھا اور ردِ سحر کی دعائیں پڑھتا ہوا بھاگا۔ اس طرح کی بیسیوں روایات ہیں مگر ان سب میں زیادہ دردناک روایات نوجوان راہبوں کی ہیں۔ ان غریبوں کے خون میں بدستور وحدت ہوتی تھی طبیعت میں بدستور اُمنگ و جوش ہوتا تھا اور اوایل عمر میں پری جالوں کی ہم صحبتی و ناز برداری کی خو پڑ چکی ہوتی تھی ایسے لوگوں کے لئے محال تھا کہ فطرت کے بقوت جذبات کو اکبار کی مٹا دیں۔ یہ جذبات بڑے بڑے جتنوں سے دبائے جاتے۔ لیکن رہ رہ کر

ابھرتے اور اس زور سے ابھرتے کہ عابدان شب زندہ وار کے نظام دماغی کو تخیل اور ان کی
 جمعیت جو اس کا شیرازہ یکسر منتشر کر دیتے جنوں خود کشی یہ دو تلخ علی العموم ظہور پذیر ہونے
 لگتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سینٹ پلیمین و سینٹ پیکو میں جنگل میں کھڑے ہو کر باتیں
 کر رہے تھے کہ ایک بیک ایک نو عمر راہب جس کے چہرہ سے آثار وحشت و جنون عیاں تھے
 دوڑا ہوا آیا اور رو کر اوپر چکیاں لے لیکر اُس نے اپنا پرالم ڈگھڑایا کہ سنا یا کہ ایک حسین
 عورت اُس کے حجرہ میں چلی آئی اور اسے اپنے سے ملوث کر کے دفعۃً غائب ہو گئی یہ کہہ کر
 اُس نے زور سے ایک پیچ ماری اور تیزی سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے سارا جنگل ختم ہو گیا
 اور وہ ایک موضع کے سرحد پر پہنچا جہاں حمام کے سامنے خوب آگ روشن تھی۔ اس آگ
 میں اُس نے اپنے تئیں جھونک دیا اور چند لمحوں میں تودہ خاکستر ہو گیا۔ یہ بھی خیال رکھنا
 چاہیے کہ اس عقیل کے واقعات صرف نو عمر و نموش ہی عباد کو نہیں پیش آتے تھے بلکہ
 بڑے بڑے پرانے زاہدان مرتاض بھی ببا اوقات ان کا شکار ہو جاتے تھے چنانچہ ایک
 راہب کا واقعہ مشہور ہے جو زہد و تقویٰ میں خاص شہرت رکھتا تھا اور جس کی ریاضات ضربت
 تھیں یہاں تک کہ اسے خود بھی اپنی جذبات کشی پر غرہ ہو گیا تھا کہ ایک روز ایک راہ گم کردہ
 اور تھکی ماندی عورت نے اگر اس کے حجرہ پر دستک دی اور دو گھڑی کے لئے جنگلی جانوروں کے
 خوف سے اس کی پناہ میں آ جانا چاہا۔ زاہد نے رحم کھا کر یہ درخواست منظور کر لی اور اس
 عورت نے یہ کمال حقیقت اُس کے دست مبارک کو مس کرنا چاہا۔ ہاتھ کا ہاتھ سے مس ہونا
 تھا کہ حضرت زاہد کے جسم میں گویا ایک برقی رُود وڑ گئی اور چشم زدن میں سارا زہد و تقویٰ
 کافور ہو گیا۔ ہاتھ ہم آغوشی کی تمنائیں بڑھے۔ لیکن قبل اس کی کہ جسم سے جسم مس ہو وہ عورت
 نظروں سے اوجھل گئی۔ گویا ایک چھلاوا تھا جو معانظر سے غائب ہو گیا اور شیاطین فی
 ارواح خبیثہ کی جماعت قہقہوں کی آوازیں چلی آنے لگیں۔ اب حضرت زاہد کو نظر آیا کہ ان کی
 ہمرشت میں ریاضت وزہد کے علاوہ بھی کوئی اور عنصر شامل ہے جسے کوئی درج و تقویٰ

مغلوب نہیں کر سکتا۔ کوئی اور شخص اُس کی جگہ پر ہوتا تو فرط حسرت و ندامت سے بخون ہو جاتا اور یا تو دکشی کر لیتا۔ لیکن اس کی طبیعت پر یہ اثر پڑا کہ اس نے اسی وقت زاہدانہ زندگی کو خیر باد کہا اور عام دنیوی طرز معاشرت اختیار کر کے بقول مؤرخین مسیحیت کے جہنم کے لیے اپنے تئیں تیار کرنے لگا۔

اس طرز کے قصص و روایات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنس انات سے ربط و تعلق رکھنا ہی سخت خطرناک سمجھا جانے لگا۔ لیکن ترک تعلق کر لینا بھی آسان نہ تھا۔ چنانچہ ان زمانہ کی تاریخ میں جہاں اس طرح کے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں کہ یہ زیادہ عورت کے سایہ تک سے بھاگتے تھے۔ وہاں اس طرح کی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ عورت بحال خوش عقیدگی و استقلال ان کا پیچھا کئے چلی جا رہی ہو۔ بلکہ بعض عورتیں اس حیثیت سے بہت کامیاب رہی ہیں مثلاً سینٹ میلینا کہ قطع نظر اپنی بڑی جاہ و کوراہیوں پر وقت کر دینے کے اُس نے مزین روئینس کی میت میں شام و صبح میں ایک بڑا دورہ بھی کیا اور تمام زاہدین و راہبین کی زیارت کرتی رہی۔ مگر یہ ایک خاص صورت تھی ورنہ زاہدوں کا عام قاعدہ یہ تھا کہ ان میں سے جو عورت کے سایہ سے بچتے دنوں زیادہ محترم رہتا تھا اُسی قدر زیادہ متقی و متوجہ خیال کیا جاتا تھا۔ سینٹ میل نے بحر کسی شدید مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ سینٹ جان نے ۸۴ سال تک عورت کی صورت نہیں دیکھی بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہو کر اُس کے پاس کھلا بھیجا کہ اگر وہ اُسے دیکھنے نہ آئے گا تو وہ اپنی جان دیدے گی۔ یہ سن کر اپنے یہ جواب دیا کہ "آج رات کو جس وقت وہ اپنی خواجگاہ میں ہوگی میں آؤں گا" اور اس وعدہ کا ایثار یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اُسے خواب میں دیکھ لیا۔ رومہ کی ایک نہایت خوش عقیدہ لڑکی کا ذکر ہے کہ وہ اہلی جیسے دور دراز مقام سے سفر کر کے اسکندریہ محض اس غرض سے آئی کہ سینٹ آینس سے دعا لے۔ کس منہل سے اُسے باریابی نصیب ہوئی اور اُس وقت اُس نے بہ کمال الحاح و زاری فیتر سے التجا کی کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اس پر فقیر آپسے سے باہر ہو گیا اور

نہایت غضبناک ہو کر بولا کہ ”جتنے یاد رکھوں! اب ساری عمر اس دُعا میں صرف ہوگی کہ تجھ کو بھلاؤں، غریب لڑکی مایوس ہو کر اسکندریہ کے لاٹ پادری کے پاس گئی، اُس نے فقیر کے ارشاد کی یوں تاویل کی کہ ”وہ تجھے بھلائے گا۔ لیکن تیری روح کو ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھے گا۔“ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ عورتیں خوش عہدگی کے جوش سے لبریز ہو کر مردانہ لباس اختیار کر لیتیں اور ساری عمر زاہدانہ زندگی میں بسر کر دیتیں ان میں سے قابل ذکر سینٹ پلیمیا ہی جو پہلے ایک مشورائیکٹر س تھی۔ اسے عبادت کا شوق ہوا اور معمولی عبادت میں سیری نہ پا کر اس نے زاہدانہ زندگی اختیار کرنا چاہی۔ یہ ٹھان کر اس نے مردانہ وضع اختیار کی اور روپ بدلنے میں اسے یہ محال حاصل تھا کہ ساری عمر مردوں کے ساتھ ریاضات میں مشغول رہی اور دُعا کے وقت تک کسی کو اس کے عورت ہونے کا پتہ نہ چل سکا۔

بیانات بالا سے رہبانیت و خانقاہ نشینی کی ابتدائی تاریخ کا ایک صاف نقشہ نظر کے سامنے چھ گیا ہوگا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس طرز معاشرت کا عیسائی اخلاق و مہیا اخلاق پر کیا اثر پڑا؟ سب سے پہلی تبدیلی اس سلسلہ میں یہ نظر آتی ہے کہ مختلف محاسن اخلاق کے درجہ بہت اُلٹ پٹ گئے۔ مثلاً میحیکے قرونِ اولیٰ میں اور خاص انجیل کی تعلیمات کے مطابق اُمّ الاخلاق ایشا رہبردی یا محبت و الفت تھی۔ لیکن چوتھی اور پانچویں صدیوں میں رہبانیت کے زور سے اخلاق کا مرکز نقل بدل گیا تھا۔ اب اُمّ الاخلاق الفت و ہمدردی نہیں بلکہ عصمت و عفت تھی۔ اور عصمت یہ مراد نہ تھی کہ آدمی سوا اپنی منکوحہ بیوی کے اور کسی سے تعلق نہ رکھے بلکہ جائز ازدواجی تعلقات سے اجتناب بھی داخل عصمت تھا اور انسان کے لئے کمال اخلاق یہ قرار پایا گیا تھا کہ وہ اپنے تمام جذبات شہوانی کو یکسر فنا کر دے۔ اس طرز عمل کے ثمرات نتائج میرے نزدیک حسبِ ذیل ہوئے :-

(۱) ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مذہب میں ٹیس و تعصب بہت آگیا۔ رہبانیت پرستوں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا تھا کہ تقاضائے جنسی فی نفسہ ایک معصیتِ کبیرہ ہے۔ اور چونکہ یہ تقاضائے

ظہری، جذباتِ عہد و غضب وغیرہ کی طرح عارضی و ہنگامی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی گہ لہری رہ کر دل میں اٹھا کرتی ہے اور ان زاہدوں کو اسے ہر وقت دبائے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ خیال قائم کیا کہ اول تو نفس انسانی بجائے خود دیدی و بدکاری کی جانب مائل ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر لذتِ معصیت کی طرف مودی ہوتی ہے لہذا ہر لذتِ معصیت ہے۔ یہ اعتقاد صحیح نتیجہ تھا جذبہ شہوانی کو بالکل مارنے کا۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے یونانی فلسفے سے تلازم لذت و معصیت کا فقدان، نتیجہ تھا اس حقیقت کا کہ یونانی حکماء از دو باجی بد چلنی کو چنداں میوہ نہیں خیال کرتے تھے اور یونانی سپک تو ناجائز شہوت رانی کو علانیہ جائز رکھتی تھی۔

(۲) دوسرے نتیجہ یہ ہوا کہ جبر و اختیار کے مقدمہ میں فیصلہ اختیار کے حق میں ہو گیا۔ بچوں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ انسان کے جذبات اُسے برائی و بدکاری کی طرف لے جاتے ہیں لیکن وہ خود اپنے ارادہ سے رکتا ہے، وہ انسان کو فاعلِ مختار لا محالہ مانے لگا۔

(۳) تیسرے نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی یا جو انفرادی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر میوہ قرار پائے۔ مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت، ہرأت کہ ماہدانِ مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرتے تھے اور فرقہ کتھو تک ہمیشہ انھیں دباتا رہا۔ حالانکہ پرنسٹنٹ و مادی تمدن کا اقتضا ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھیں کو سراہا جاوے۔

(۴) چوتھا مگر نہایت اہم نتیجہ یہ بانی طرزِ معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزہ کا احترام واجب کا فور ہو گیا۔ درحقیقت اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ اخافِ فراموشی اور اور اعزہ کے ساتھ قساوتِ قبیہ کی جس کثرتِ نظیریں ملتی ہیں اس کا عام ناظرین اندازہ نہیں کر سکتے۔ لوگ آج ان زاہدوں کے اعلیٰ زہد و ریاضت و عرق و تقویٰ پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ ان کو یہ مدوح کس بدیردی سے اپنی ماؤں کی دشمنی کرتے تھے بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے والی و وارث محض دوسروں کے

لکڑیوں کے رحم پر چھڑ ویسے تھے۔ ان کا مقصد وزندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات
 اخروی حاصل ہو۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جن میں امیر
 ایک راہب صاحب کے پاس مدت دراز کے بعد ان کے والدین کے خطوط دریافت خیریت
 کے لئے پہنچے حضرت کو یہ خیال گزرا کہ کہیں ان کے پڑھنے سے میری کیسوی خیال میں
 انتشار نہ پیدا ہو۔ اور ان کو بے پڑے آگ میں جھونک دیا۔ ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے
 کہ اُسے راہب بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ ساری جائیداد و املاک پر لات مار کے صرف
 اپنے ہشت سالہ بچہ کو ہمراہ لے کر خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ راہبوں نے اس کا خیر مقدم
 کیا۔ لیکن وہ ابھی اُسے اپنی جماعت میں کیونکر شریک کر سکتے تھے۔ گو وہ اپنی دولت
 و ثروت کو بھول چکا تھا۔ تاہم اولاد کی مانتا تو اس کے دل سے ابھی نہیں نکلی تھی اس
 خیال کی بنا پر اُس کا بچہ اُس سے لے لیا گیا۔ کھانے، پینے، چلنے، پھرنے غرض ہر شے
 سے متعلق اُس پر ہر طرح کی سختیاں برتی جانے لگیں اور ہر طرح کی ذلتوں اور سزاؤں کا
 اُسے شکار بنایا جانے لگا۔ بیدار اور اپنی نجات کا حریص، باپ روزمرہ یہ تماشہ دیکھتا
 لیکن کبھی منہ سے اُٹ تک نہ نکالتا۔ یہاں تک کہ ایک روز پر خانقاہ کا اُسے یہ حکم ملا
 کہ بچہ کو لیجا کر دریا میں ڈال آئے۔ باپ کے جبیں استقلال پر اب بھی شکن نہ آئی وہ تعمیل ارشاد
 کے لئے مستعد ہو گیا۔ لیکن میں لب دریا چند راہبوں نے درمیان میں پڑ کر اس جاں گزرا
 امتحان سے معافی دلوا دی۔ یہ شخص آگے چل کر بہت بڑا زاہد مشہور ہوا۔ بالکل اسی طرح کا
 قصہ ایک اور امیدوار منصب بہت کا منقول ہے۔ ان کو بھی یہی حکم ملا تھا کہ اپنی اکلوتی
 اولاد کو دریا بُرد کر آئیں۔ لیکن عین موقع پر ایک خاص قاصد نے اگر بچہ کی جان بچالی
 کبھی کبھی ان واقعات میں خرق عادت کی آمیزش بھی ہو جاتی تھی مثلاً ایک روایت یہ ہے
 کہ کسی شخص نے اپنے بچوں کو چھوڑ کر خود راہب بننا چاہا۔ تین سال کے بعد اُسے خیال
 ہوا کہ ان لڑکوں کو بھی خانقاہ میں لانا چاہیئے۔ اس خیال سے وہ مکان واپس گیا

لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ تین میں سے دو وفات پا گئے ہیں اور صرف سب سے چھوٹا زندہ رہ گیا ہے اُسے اُس نے گود میں لیا اور خانقاہ میں لایا، یہاں پہنچا پیر خانقاہ نے دریافت کیا کہ کیا تمہیں اس کی محبت ہے؟ جواب ملا کہ "ہاں" مگر ارشاد ہوا کہ کیا تمہیں اس کی محبت ہے؟ مگر جواب اثبات میں ملا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ فوراً اسے سامنے ولے آؤ گے میں بھینک دو۔ معاف نہیں ارشاد ہوئی، لیکن باپ کی متحیر آنکھوں نے دیکھا کہ بیٹے پر آؤ گے گلزار خلیل ہو گیا ہے۔

اس طرز عمل کی سب سے زیادہ پر اثر و درانگیر مثالیں جنس نسواں سے تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں کہ یہاں خیال یہ تھا کہ عورت کی موجودگی کہیں دفعتاً تمام محنت کو غارت نہ کر دے۔ ہمارے بعض ناول نویسوں نے اس خیال کے چربہ آتارنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ کو قدما و راہبیں نے جس حد تک عملاً برتا تھا۔ وہاں تک ہماری ناول نویسوں کا طائر فکر نہیں پہنچ سکتا۔ مثلاً منوہ از نروائے ملاحظہ ہو۔ مشہور امام ربانیت سیویں جب نہایت ضعیف اور اپانج ہو گیا تو اس کی انتہائی کبر سنی پر نظر کر کے اُس کے تلامذہ و رفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل کو چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرے۔ وہ اس درخواست کو قبول کرتے پر راضی ہو گیا۔ لیکن شہ طیبہ پیش کی کہ وہ بستی ایسی ہو جس میں کبھی کسی عورت سے دو بدو ہوئے کا احتمال نہ ہو۔ ایسی بستی کا وجود ظاہر ہے کہ ناممکنات سے تھا۔ چنانچہ بالآخر وہ بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا اور وہیں جان دیدی۔ ایک اور راہب صاحب فکر کر رہے تھے اور اپنے فرقہ کی عام روش کے خلاف گویا اپنی طبیعت پر بہت بھاد کر کے اپنی والدہ کو بھی اپنے ہمراہ لئے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک چشمہ پڑا جس پر کوئی پل نہ تھا۔ حضرت نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ اور سارے جسم کو کپڑے میں خوب کس کر لپیٹنا شروع کیا۔ ماں نے متحیر ہو کر سب پوچھا تو جواب دیا کہ تمہیں کندھے پر بٹھا کر اُس پار کرنا ہی۔ ڈر ہے کہ اگر کہیں میرا جسم ہمارے جسم سے ملے ہو گیا تو میرا سارا کیا کرایا ایک دم میں رائیگاں جا بیگا۔ بینٹ جان آف

کی ہمیشہ کو اُس سے سید اُن تھا جب سینٹ مذکور کو باؤنٹیشینی اختیار کے بہت زمانہ گزر گیا تو ہمیشہ کے دل میں دیکھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوا۔ بلانے کے بہت سے خطوط لکھے مگر ادھر سے انکار ہی رہا۔ آخر مجبور ہو کر خود جنگل میں جا کر ملنے کا ارادہ کیا۔ اب سینٹ مذکور کو وحشت ہوئی اور خطاب لکھ بھیجا کہ خود ہی آتا ہوں۔ چنانچہ آپ آؤ ضرور مگر اس قدر تبدیل ہونے کے ساتھ کہ میں نے پہچانا تک نہیں اسی حالت سے آپ واپس چلے گئے اور بدعہدی کے شکوہ کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آیا تو تھا مگر سچ کے فضل و کرم سے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اب ہرگز کبھی میرے دیدار کا قصہ نہ کرنا۔ سینٹ تھوڈورس کی ماں بے اختیار ہو کر اپنے لڑکے کو دیکھنے آئی اور احتیاطاً بہت پادریوں کے سفارشی خطوط بھی لیتی آئی لیکن صاحبزادہ کو دل کسی طرح نہ پسچا۔ اور بالآخر ماں کو اپنی بیٹی کے ساتھ ناکام ہو کر واپس ہونا پڑا۔ سینٹ مارکس کی والدہ نے اس کے پیر سے اس کے ملنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اب سینٹ صاحب اس مشکل میں پڑے کہ یا تو پیر طر لیت کی عدول حکمی کریں اور یا ماں کا چہرہ دیکھنے کی معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوں مگر دیکھنے کے ظالم نے اس اشکال کو کیونکر رفع کیا۔ بری یعنی ماں کے پاس گیا ضرور مگر ہمیں بدلے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے جس سے نہ اس نے ماں کو دیکھا اور نہ ماں نے اسے پہچانا بالکل اسی طرح کا واقعہ سینٹ پور اور اس کی ہمیشہ کا۔ سینٹ پیمین کی بابت یہ روایت ہے کہ اُس نے منع اپنے چھ بھائیوں کے دفعۃً ترک خاندان کر کے جنگل کی راہ لی جس ضعیف ماں کی ساتوں اولادیں اُسے اکبار کی چھوڑ دیں اُس کو دل پر کیا کچھ گزر گئی ہوگی غریب بیتاب ہو کر تو دھبی جنگل میں آئی یہاں وہ ایسے وقت پہنچی جبکہ یہ لوگ اپنے حجرہ سے نکل کر گر جا جا رہے تھے۔ ماں کی صورت دیکھتے معائب دہشت زدہ ہو کر پلٹو ماں نے فوراً تعاقب کیا۔ لیکن کبر سنی کے پاؤں جوانی کے پاؤں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قبل اس کے کہ ماں دروازہ پر پہنچے صاحبزادوں نے اندر سے حجرہ بند کر لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ضعیف و ناتوان ماں دروازہ پر کھڑی اپنی جگر و دہچنچوں سے سائے جنگل کو بلائے دیتی تھی۔ اس حالت میں سینٹ پیمین نے دروازہ کے قریب آکر اس آہ و ثنیوں کا سبب پوچھا۔ ماں نے ہچکیاں لے لیکر

تقریر شروع کی کہ یہ سارا صدمہ ہمارے گرد نہ دیکھنے کا ہے کیا تم مجھے نہیں جانتے ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں؟ کیا میں نے تمہاری رضاغت نہیں کی؟ تمہیں پال جلا کر اتنا بڑا نہیں کیا؟ کیا میرے ان احسانات کا یہی معاوضہ تھا؟ کیا میرے ساری حقوق تم نے بھلا دیئے؟ یہ ساری تقریر بے اثر رہی۔ اہل زہد کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملا کہ تم اپنی موت کے بعد ہی ہمیں دیکھ سکو گے۔ یہاں تک کہ دکھیااری ماں کو مجبوراً اسی سے تسلی پا کر ناکام واپس جانا پڑا۔ اسی کے قریب قریب سینٹ یسویں کا واقعہ ہے جس کے ترک خاناں کرنے کا باپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مر گیا۔ ماں البتہ زندہ رہی۔ لیکن جب ۷۷ سال گزر چکے اور اسے سینٹ موصوف کی قیام گاہ کا پتہ معلوم ہوا تو وہ ملاقات کے لئے خود جنگل میں آئی۔ لیکن اس کی تمام تقریریں خوشامدیں آہ و زاریاں سب بیکار گئیں اور سینٹ موصوف نے کسی طرح ملاقات کی ہامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزری جاتی ہے تو یہ کھنکھایا کہ میں غمگین ملنے آتا ہوں تین شبانہ روز اس وعدہ کے گزر گئے یہاں تک کہ اسی حجرہ کے دروازہ پر فرط یاس سے ماں نے دم توڑ دیا۔ تب مقدس راہب حجرہ سے مع اپنے تلامذہ کے باہر تشریف لائے اور ماں کی میت پر چند آنسو گرائے اور دعائے مغفرت کی اس پر ایک خوش عقیدہ سوانح نویس کی روایت ہے کہ نقش میں حرکت ہوئی اور سینٹ موصوف نے مکرر دعائے مغفرت کی۔ پھر سینٹ موصوف جا کر بدستور اپنے خلوت مکدہ میں مصروف عبادت ہو گئے۔ اور ان کی کرامت و اتقا کا شہرہ ہر زبان پر جاری ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ روایات بالا میں ایک بڑا حصہ اغراق و مبالغہ کا بھی ہو گا۔ تاہم جتنی اصلیت ہے وہ بھی اس حقیقت کے علم کے لئے بالکل کافی ہے کہ ترک خاناں و قطع تعلقات خانگی کرنا اس وقت کے میسوں میں اعلیٰ فضائل و حقائق سے سمجھا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی قانون و شریعت کی طرف سے ان سختیوں کو ہلکا کرنے کی بھی کوشش ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً شروع شروع میں یہ اصول رکھا گیا تھا کہ جن بچوں کو بغیر ان کی مرضی لئے بوڑھوں کے

والدین راہب بنا ڈالتے ہیں وہ مجاز ہیں کہ بالغ ہو کر پھر دنیوی زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ یا ایک بار اگر جاکو نسل نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اولاد کے لئے اپنے والدین کو چھوڑ دینا خواہ وہ راہ مذہب ہی میں ہونا جائز ہے۔ لیکن اس طرح کی صدائیں خال خال اٹھتی تھیں۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ قانون نے اس باب میں والدین کو اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں دیا تھا۔ اور جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی۔ اُس کے نام پر پبلک میں ہر طرف سے واہ واہ ہوتی تھی سینٹ کریزوسٹم فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکے کو اُس کے باپ نے کسی فوجی عہدہ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ لیکن میں اُسے خانقاہ میں اُٹالایا۔ سینٹ ایمر و تین اس قسم کے انخوار کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ محبت شعار والدین کا اس زمانہ میں عجیب پروردہ حال تھا۔ سینٹ کریزوسٹم کی والدہ کی تقریر اب تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ جو کہتی ہے کہ ”میا اگر تیرا یہی ارادہ ہے تو اس قصد کو میری وفات کے وقت تک ملتوی رکھ“ سینٹ ایمر وز کا ایک پورا مقالہ اس موضوع پر موجود ہے کہ رہبانی زندگی کی برکتیں والدین کی خوشنودی کی برکتوں سے کس قدر بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابل میں والدین کو ناخوش کر دینا کتنا آسان ہے۔ پھر جو لوگ اپنی اولاد و اعزہ کو رہبانیت اختیار کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود بقول سینٹ کریزوسٹم کے عذاب الیم کے مستوجب ہوں گے۔ بلکہ یہ قول سینٹ ایمر وز کے ممکن ہے کہ وہ اُن پر اسی دنیا میں نازل ہو جائے جیسا کہ ایک یتیم دلیر لڑکی نے جب راہبہ بننا چاہا اور اس کے اعزہ نے اسے اس قصد سے باز رکھنا چاہا اور اس درمیان میں ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ تمہارے والدین اگر آج زندہ ہوتے تو وہ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔ تب تم کیا کرتی؟ اُس لڑکی نے جواب دیا کہ اسی باعث تو خط نے آج انہیں زندہ نہیں رکھا۔ یہ کہنا تھا کہ جس شخص نے یہ گستاخانہ سوال کیا تھا وہ خود بھی مر گیا اور لوگوں کے دل میں یہ دہشت سما گئی کہ اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا مشیت الہی سے لڑنا ہے۔ ایک مشہور خاتون کی بابت منقول ہے

کہ اپنے شوہر کے انتقال پر وہ دفعۃً ترک خانہ کر کے اور اپنی اولاد کی طرف سے بالکل ذمہ داری
ہو کر راہبوں کی جماعت میں جا شامل ہوئی۔ اپنی ساری جائیداد خیرات کر ڈالی اور اولاد کو لئے
بجز مالی زیر باری اور قرضہ کی پریشانیوں کے اور کوئی ترک نہیں چھوڑا۔ اس زمانہ میں یہ عقیدہ
بھی عام طور سے شائع کر دیا گیا کہ اعزہ واقربا پر روپیہ صرف کرنے میں مطلق ثواب نہیں بلکہ
جو کچھ ثواب ہو وہ فقرا پر خیرات کرنے میں ہے۔ چنانچہ بہت سے اہل ثروت حصول ثواب
کے لئے اسی عقیدہ پر عامل بھی تھے۔ البتہ ایک سینٹ کشمین و آریس کی استثنائی
مثالیں ایسی ملتی تھیں جو اعزہ کی حق تلفی کر کے خیرات کا روپیہ لینا حرام جانتے تھے۔ انہیں بالکل
مستثنیات میں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ عام عقیدہ کا ترجمان تو یہ اصول تھا کہ ”جو شخص اپنی ماں کی
دلشکمی پر داشت کر سکتا ہو وہی بڑی سی بڑی ریاضتیں بھی جھیل سکتا ہو“ سینٹ جروم ایک
شخص کو راہبانہ زندگی کی ترغیب دیتے ہیں اور اس ضمن میں ترک تعلقات خانگی کے باب
میں کیسی داو بلاغت دیتے ہیں :-

”متنازعات بھیتنا ہمارے گلے میں باہیں ڈال دے گا۔ تمہاری ماں آنسوؤں کا تار بانہ ہو گی
اپنے احسانات کو یاد دلائے گی۔ اپنے کپڑے اور بال فوج فوج کر اپنے حقوق پر توجہ
دلائے گی؛ تمہارا باپ اپنے تئیں تمہارے قدموں پر گر اڑے گا۔ لیکن تمہیں چاہیئے کہ
اس کے جسم کو پامال ہو جانے دو اور ان میں سے کسی شے کی پروا نہ کرو۔ تمہاری بوعہ شیر
تمہارے گرد پروا نہ ہو جائے گی۔ تمہارے والد یہ کہیں گے کہ میری موت کے وقت تک
اپنا ارادہ ملتوی رکھو“ اعزہ یہ سمجھائیں گے کہ خاندان کا شیرازہ صرف تمہاری ذات سے
قائم ہے۔ لیکن تمہیں ان میں سے کسی شے کی پروا نہ ہونی چاہیئے۔ تمہارے کان میں سچ
کی صدا آ رہی ہے۔ اُس کے مقابلہ میں تمہیں کسی اور آواز سے متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ سچ کی محبت
اور جہنم کے خوف کے سامنے ساری نجفیتیں اور رشتہ داریاں سچ ہیں“

یہ حالات قصص تو قدما کے تھے۔ لیکن متاخرین میں بھی یہ کیفیت بدستور قائم رہی۔ چن چن

سینٹ گری گوری روایت کرتے ہیں کہ "ایک شخص اپنی صغریٰ سے راہب بن گیا تھا مگر والدین کی محبت ہنوز اس کے دل سے نہیں نکلی تھی آخر ایک روز خفیہ طور پر وہ ان کی ملاقات کے لئے چلا گیا اس جرم پر غضب آتی یوں نازل ہوا کہ جوں ہی لوٹ کر آیا مر گیا۔ اور جب نعش دفن کی جانے لگی تو زمین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ متعدد ناکام کوششوں کے بعد جب سینٹ سینٹیکٹ نے اس کے سینہ پر تبرکات رکھے ہیں تب تدفین ہو سکی۔ اسی طرح کی اور روایات بھی اسی زمانہ سے متعلق مشہور ہیں۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی۔ پہلے جواثر واقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔

رہبانیت کی تاریخی سرگزشت بیان ہو چکی۔ اب اس پر کوئی میری رلے پوچھے تو میں مختصر یہ کہہ سکتا ہوں کہ حلالیق دنیوی سے آزادی حاصل کرنا اگرچہ بہت بڑی ہمت و جوانمردی کا کام ہے تاہم جس ترک تعلقات کی بنا محض خود غرضی پر ہو وہ کبھی محمود نہیں کہی جاسکتی قدما ر یونان و روم اگر ایثار و مجاہدہ سے کام لیتے تھے تو ملک و قوم سلطنت و جماعت کی بہبود کے لئے لیکن ہماری سبھی رہبانیت کا مقصد محض اپنی نجات آخری کا حصول تھا جو خود غرضی ہی کی ایک شکل ہے۔ دنیوی نہ سہی دینی سہی ایسا شخص جو آخرت میں اپنے نفع و آرام کے خاطر ماں باپ دوست آشنا بھائی بہن، اور اولاد کے حقوق کو یکسر تلف کر دے اور فرائض کو بالکل پس پشت ڈال دے۔ اگر وہ خود غرض نہیں تو دنیا میں اور کسے خود غرض کہہ سکتے ہیں؟

پانچواں نتیجہ رہبانیت و ترک تعلقات کا تعصب عدم مسالمت مذہبی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بے تعصبی و رواداری کی بنیاد وسیع ہمدردیوں پر ہے۔ جس شخص کی ہمدردیاں صحتی زیادہ وسیع ہوں گی وہ اسی قدر وسیع المشرب و بے تعصب ہوگا۔ لیکن ہمدردیوں اور جذبات لطیف کا گوارہ خانگی زندگی پر جس کا بیج ہی راہبانہ طرز معاشرت نے مار دیا تھا۔ جہالت تعصب بیدار دی، وہم پرستی کا اجتماع رواداری کے لئے کہاں گنجائش باقی رکھ سکتا تھا

ہر راہب اپنے اپنے گرجا کے مقدمات پر شدت کا رہنما اور ان سے کسی تجزی اختلاف کی بھی تاب لانے کے ناقابل تھا۔ اُس کے ذہن میں اس کا امکان بھی نہیں گزرتا تھا کہ مخالف کی رے میں واقعت کا جزو شامل ہو۔ اور پھر جب خود مسیحی فرقوں میں باہمی تعصب و عدم رواداری کا یہ حال تھا تو اُس وحشیانہ تعصب کا کیا پوچھنا جو انھیں مسیحوں سے تھا۔ ان لوگوں کے بڑے بڑے معابد، ان کی عظیم الشان یادگاریں اور شاندار قربان گاہیں۔ دم کے دم میں سمار کر دی جاتیں اور ان کے گرنے میں ایسے لوگوں کو کیا درد ہو سکتا تھا جن کے دل کبھی اپنے والد کی آہ و فریاد پر بھی نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی ملکی قوانین ان سختیوں کو ہکا کر دیتے تھے۔ لیکن نابان انھیں کبھی اسے جائز نہیں کہہ سکتے تھے۔ بلکہ حکومت کی کمزوریوں پر نہایت سختی سے احتساب کرتے تھے۔

چھٹا نتیجہ یعنی فضائل سیاسی و وطنی کا انحطاط اپنی غایت اہمیت سے ایک مستقل فضل کا محتاج ہے۔

فصل (۷)

جذبات و طینت کا انحطاط

سب سے آخری گرجے اہم نتیجہ رہبانیت کا یہ نکلا کہ طینت و قومیت کے جذبات کا فنا ہو گیا۔ بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسیحی تمدن جس قدر فضائل عصمت و عفت اور انسانیت کے لحاظ سے بلند ہوا ہے۔ اسی قدر کمالات علمی و جذبات قومیت کے لحاظ سے پست رہا ہے۔ یہ ہمیں کسی گزشتہ باب میں معلوم ہو چکا ہے کہ ظہور مسیحیت سے زرا پہلے جو علمی تحریک شائع ہو رہی تھی وہ بجائے خود جذبہ وطنیت کو پامال کرنے والی تھی۔ اور اُس کی بنا پر جو شے روم و یونان کی فہرست فضائل اخلاق میں اس فضائل کا مرتبہ رکھتی تھی وہ فنا ہو چکی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس انقلاب حالت کے خاص اسباب یہ دو تھے۔ ایک

یہ کہ سلطنت روم کے حدود کے اندر مختلف قوموں، نسلوں، اور مذہبوں کے لوگ اس شدت سے آپس میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ کسی ایک خالص ملک یا قوم کے جذبہ کو مخاطب بنانا قطعاً ناممکن ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اب سلطنت روم میں مشرقی فلسفوں کا عروج شروع ہوا اور ان انظامات فلسفہ میں روایت کے بالکل برخلاف وطن پرستی یا قوم پرستی کا کوئی درجہ نہ تھا۔ غرض ظہور مسیحیت کے وقت جذبہ وطنیت خود ہی ایک بڑی حد تک فنا ہو چکا تھا اور سچ یہ ہے کہ اسی سنگ راہ کے دور ہو جانے سے خود مسیحیت کی اشاعت بے روک ٹوک آسانی سے ہو سکی۔ کیونکہ ایک بالکل قطعی تاریخی حقیقت یہ کہ جو مذہب خصائص قومی کے معارض ہوتے ہیں وہ کبھی چلنے نہیں پاتے۔

لیکن اس جذبہ کے جو کچھ باقیات الصالحات رہ گئے تھے مسیحیت ان کا بھی ہتھیال کر دیا مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق روم کی عظمت و بقال کی عظمت تھی جس کا مستند دور رہا۔ کال لازمی مقدمہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنا ایک پورا جتھا قائم کر کے زوال حکومت کے منظر و سامی رہنے لگے اور ایسے تمام مناظر، ماعب و مشاغل سے بالکلیہ احتراز کرنے لگے جن سے جذبہ قومیت کو تقویت پہنچنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ بے شبہ انھوں نے کبھی حکومت براہ راست بغاوت نہیں کی تاہم وہ ہمیشہ رعایا کو حکومت کی جانب سے برگشتہ یا کم از کم بے تعلق بنا کر رہے اور اسے علانیہ فخر کے ساتھ کہتے رہے کہ ملک و قوم وغیرہ کی دنیوی ترقیوں سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ حقیقی ترقی روحانی ترقی کا نام ہے۔ پھر سپہگری کے پیشہ اور فوج کشی کو کبھی انھوں نے پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھا۔ بلکہ ان کے جوازیں بھی انھیں تامل رہا۔ نقطہ خیال عام مسیحیوں کا شروع ہی سے رہا تھا۔ اس پر راہبوں کے ترک تعلقات ترک دنیا صحرانی و خلوت گزینی نے اور چار چاند لگائے اور یہ بالآخر زوال حکومت کا ایک سبب بنی ثابت ہوا۔ مذہب اخلاق کے تعلقات باہمی کے باب میں لوگوں کو عجیب غلط فہمی ہے۔ مذہب اخلاق پر مقرر ضرور ہوتا ہے مگر کس طرح؟ اس طرح کہ اخلاق کے چشمہ کو وہ اپنے قائم کر دہ راستہ پر

تیزی سے بہانے لگتا ہے۔ اخلاقی قوت قوم میں پیشتر سے موجود ہونا چاہیے۔ مذہب اُسے پیدا نہیں کر سکتا البتہ وہ اس کا رخ متعین کر دیتا ہے اور اس کا ایک مخصوص راستہ قائم کر دیتا ہے اس حقیقت کی توضیح رومی انقلاب میاں اخلاق سے خوب ہوتی ہے۔ شروع شروع میں اگر کسی شخص کی بابت یہ کہا جاتا کہ وہ بڑا صاحب اخلاق ہے۔ تو رومہ میں ہر شخص یہ معنی لیتا کہ وہ بہت محب وطن ہے اور جتنی اُس میں وطنیت زیادہ ہے اُسی نسبت سے وہ فضائل اخلاق سے زیادہ آرا ہے۔ لیکن مسیحی رہبانیت نے اگر چونکہ اخلاق کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اس لئے وطن پرستانہ جذبات لامحالہ مردہ ہو گئے۔ اب راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استملاک کے پہلو بہ پہلو یہ صورت واقعات تھی کہ جمہوری زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ حکومت کے ہر شعبہ میں نا انصافی، رشوت خواری و دغا بازی کا بازار گرم تھا۔ فوج پر نامردی و بزدلی چھائی ہوئی تھی اور عام اہل ملک کے تعیش کی یہ توبہ پہنچ گئی تھی کہ اعیانہ کے مقابلہ میں شکست کھاتے تھے مگر عین شکست کے دن سارے وقت کو تھکے سر کس وغیرہ مختلف ملاعب کی زندہ دلی میں صرف کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور جو قوت ملک کے تحفظ میں کام آتی اب اُس کا مصرف فقہانہ مٹو کا فیال رہ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ عین اُس وقت جبکہ الارک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے پڑا تھا، المکھیجیت بحال اہماک میں ایل فقہ والیات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت ہزار ہا جوان جو ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں اکراؤ و شجاعت دیتے، اپنے وطن سے کوسوں دور جنگل و بیابان میں پڑے ہوئے ریاضتوں میں مشغول تھے۔ روم کو فتح ہونا تھا و فتح ہوا اور انقلاب حکومت کا جو خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے وہ اہل شہر کو اٹھانا پڑا۔ لیکن سینٹ اگسٹائن اسی پر فرخ کرتے رہے کہ کلیسا پر کوئی آنچ نہیں آنے پائی۔ بلکہ بعض جگہ تو اس سے بھی بڑھ کر مظلوم مسیحیوں نے یہ ستم کیا کہ فاتحین کا بڑھکر خیر مقدم کیا (مثلاً افریقیہ میں) درہ تھر با پولی کا سا ناقابل تسخیر درہ بھی غالباً انھیں کی سازش سے منسوخ ہو گیا اور آگے چل کر مسلمانوں کو مصر پر فتح نصیب ہوئی اس کا بھی ایک بڑا عنصر یہی مسیحی سازش تھی غرض اس طرح کے متعدد واقعات

یہ حقیقت بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کے لئے اپنے وطن سے غداری کرنا اب قطعاً کوئی اخلاقی جرم نہیں رہا تھا بلکہ ایک بڑے سے بڑا مذہبی اور پابند اخلاق شخص باسانی وطن ملک کے ساتھ غداری کر سکتا تھا۔ اور اخلاقی تخیل میں یہ انقلاب صاف مسیحیت کا اثر تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں کہ مسیحوں کا یہ طرز عمل دنیا کے حق میں کہاں تک مفید پڑا؛ لیکن اس قدر بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ سلطنت میں گمن لگ گیا تھا انحطاط کے علامات پورے پورے پیدا ہو گئے تھے اور اس کا زوال قطعی تھا جو کسی کے روکے نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھر مسیحیت ایسے وقت میں جو کچھ بھی کیا اُس سے اخلاق کو یقیناً ترقی ہوئی۔ ایسے وقت میں مسیحی پادریوں نے نہ صرف اپنے ذاتی خیر و خیرات اور فیاضیوں سے خلقِ اللہ کو نفع پہنچایا بلکہ اپنی بے طرفی و بے تعلقی کی بنا پر فاختہ کی نظروں میں ایسا اثر و اقتدار پیدا کر لیا جس سے آگے چل کر انھوں نے غربا پروری و ادبی وغیرہ میں بہت مفید کام لیا اور جو ان کے رومی وطن پرست ہونے کی صورت میں ناممکن تھا۔ مرض گواراں کے طرز عمل کے ان فوائد کو ہرگز نظر انداز کیا جاسکتا تاہم اسے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے دنیا کے تخیل اخلاق میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی فضائل اخلاق کی فہرست میں وطنیت کا جو درجہ شروع سے سب کو مسلم تھا وہ اب بالکل بدل گیا یہ سچ ہے کہ آگے چل کر کبھی کبھی کلیسا کے حدود کے اندر جذبات مذہبیت و وطنیت میں امتزاج ہو گیا۔ لیکن وطنیت کو بطور ایک فرض کے، بطور ایک فضیلت اخلاقی کے کبھی مسیحی اخلاق میں کوئی درجہ نہیں نصیب ہوا۔ بلکہ فقہانہ رسلے ہمیشہ اس جذبہ کو دبا رہی ہو یا پھر ائمہ کلیسا نے جب جب سیاسی معاملات میں دخل دیا ہے تو ہمیشہ اُن کا مقصد یہ رہا ہے کہ سیاسیات کو مذہب کی ماتحتی میں لائیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ کلیسا کی برابر کبھی کسی جماعت نے اپنے جماعتی اغراض پر ملک و وطن کے فوائد کو قربان نہیں کیا ہو مسیحیت و وطنیت کے اس تنازع کے اسباب خاص میرے نزدیک یہ تین تھے۔ اولاً یہ کہ مذہبیت میں

غلو و انہماک بجائے خود دینیوی منافع کی طرف سے انسان کی طبیعت ہٹا دیتا ہے۔ کیونکہ جو شخص نفع اغروی کی تحصیل میں مصروف رہتا ہے اُسے ان مادی و عارضی منافع کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر مذہب اپنا ایک خاص کلیسا قائم کرتا ہے یعنی جماعت کو ایک خاص منظم و مرتب شکل میں رکھتا ہے جس کا ایک مخصوص نظام ترکیبی ہوتا ہے۔ ایک مخصوص ضابطہ عمل و طریق کار ہوتا ہے۔ کچھ مخصوص مقاصد و اغراض ہوتے ہیں جن کی بناء پر اکثر اُس میں اور ملکی اغراض و مصالح میں تصادم واقع ہو جاتا ہے اور اس لئے حاکمین شریعت کی جو قوت دینی انتظامات ملکی و سیاسی میں صرف ہوتی وہ ان مذہبی کار فرماؤں کی طرف منتشر ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ شہداء و وطنیت و شہداء مذہب جو اپنے اپنے پیروں کے حق میں نصب العین کا کام دیتے ہیں وہ بلحاظ اپنے خصائص کے باہم بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ تینوں سبب ہر مذہب کو وطنیت سے مغائر رکھتے ہیں۔ مگر بحیثیت حق میں اس کی شدید رہبانیت کی بنا پر اور زیادہ قوی ثابت ہوئی۔

اس اہم بحث کے خاتمہ سے قبل در باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے :-
 (۱) اول یہ کہ موجودہ زمانہ کا تخیل علمی و سیاسی زندگی کے باب میں قدامت کے تخیل سے بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ قدامت میں رواقیین اخلاق کو اگرچہ نوعی حیثیت سے دنیا کی تمام چیزوں سے مختلف جانتے تھے تاہم سیاسی زندگی میں حصہ لینا فرض قرار دیتے تھے۔ بخلاف ان کے لذتین جو حُسن اخلاق کو افادہ کے مرادف قرار دیتے تھے۔ سیاسی زندگی سے محترز رہتے تھے۔ مسیحی رہبانیت نے اگرچہ اس باب میں رواقیت کی تائید کی کہ اخلاق و مسرت و بالکل متبائن چیزیں ہیں تاہم اُس نے سیاسی زندگی سے اپنے پیروں کو ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ بخلاف اس کے ہمارا موجودہ تجارتی و کاروباری تمدن جو استیصال غلامی کے بعد سے پیدا ہوا ہے برابر سیاسی زندگی کے نشوونما میں ایک عنصر قومی کا کام دیتا رہا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ اخلاق میں یہ انقلاب تخیل خاص اہمیت رکھتا ہے جس پر مؤرخین نے کافی توجہ نہیں کی ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اب تک مؤرخین نے اخلاقی زندگی کے صرف اُن موثرات کا اہتمام کیا ہے جن کا اثر جماعات پر خاص طور سے نمایاں رہا ہے۔ مثلاً مذہب یا فلسفہ۔ لیکن اُن موثرات کو تقریباً یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو افراد کی خانگی اور روزمرہ کی معاشرتی زندگی پر اندرونی اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک زیادہ گہرا اثر انہیں آخر الذکر جزئی اور اظہارِ حقیر موثرات کا ہوتا رہا ہے۔ مؤرخین کی اس بے اعتنائی کے کم و بیش جملہ مذاہب شکار ہوئے ہیں۔ لیکن مسیحیت خصوصیت کے ساتھ اس کا ہدف رہی ہے۔

فصل (۸)

بازنطینی حکومت کی عام اخلاقی حالت

دور مسیحیت میں رومی و بازنطینی حکومت کی عام اخلاقی حالت کا اندازہ کرنے میں آج ہمیں اس کا نہایت لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہمارے پیش نظر جو ناخذ ہیں۔ اُن میں اُس وقت کے اخلاقی معائب و نقائص کے درج کرنے میں کس سختی سے کام لیا گیا ہے۔ ہمارے ان ناخذ کے جو مصنفین ہیں وہ خود رہبانیت کے رنگ سے اس قدر متاثر تھے کہ ہر خفیف سی خفیف لغزش میں وہ نہایت ہولناک رنگ بھر کر لے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ان واقعات کو کہ کچھ عرصہ کے بعد عام مسیحیوں نے ویسا ہی پر تکلف لباس پہننا شروع کر دیا تھا جیسا اُن کے گرد و پیش رائج تھا۔ یا یہ کہ جو مسیحی اب تک قدیم سادگی پر قائم تھے اُن پر یہ لوگ مضحکہ کرتے تھے۔ یا پھر یہ کہ جو لوگ پہلے برائے نام مشرک تھے وہ اب برائے نام مسیحی ہو گئے۔ ان واقعات کو آج ہر شخص معمولی و غیر اہم سمجھے گا۔ لیکن قدیم مؤرخین کے نزدیک انہیں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور گویا یہ بہت بڑے اخلاقی جرائم تھے۔ یا پھر قدیم مؤرخین کی خواہ وہ مسیحی ہوں یا مشرکین ایک عام عادت یہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے

واقعہ کو لے کر اُس کی مذمت و منفعت پر اپنا سارا زور بیان صرف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں اُن کے زور بیان کو اس سراف پر حیرت ہوتے لگتی ہے۔ اس قبیل کی چند مثالیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جو نیل نے صفیات کے صفیات ایک امیر کے اوپر اظہار غیظ و غضب کی نذر کر دیئے ہیں۔ اس جرم عظیم پر کہ وہ جس روز کا نسل مقرر ہوا ہے اُسی کی شام کو اُس نے اپنے ہاتھ سے شایع عام پر اپنی گاڑی ہانپی بسینکا اس اخلاق شکنی پر پکے سے باہر ہوا جاتا ہے کہ بعض اُمراء مشروبات کو برف میں ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں! پلیدی صاحب بحال سنجیدگی فرماتے ہیں کہ دنیا میں سب بڑا جرم سب سے بڑا اخلاقی، اور سب سے بڑا بد اخلاق و شخص ہوا جس نے پہلے پہل طلائی انگشتی کا استعمال کیا! آپوئس نے ایک بار کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ دانتوں کو منجن سے صاف رکھنا چاہیئے اس پر اُس کی وہ لے دے ہوئی کہ الاماں۔ بالائے غریب کو یہ کہہ کر اپنی بریت کرنا پڑی کہ گھڑیاں بھی دریائے نیل سے کبھی کبھی باہر آکر اپنے دانت کھول کر لیٹ جاتا ہے اور کوئی پرندہ آکر اُس کے دانتوں کو صاف کر جاتا ہے! کلیمنٹ آف الگزنڈریا کا ارشاد تھا کہ مصنوعی بال لگانے والے یا بال دار ٹوپی دینے والے کے بعض مرہم گر جا میں آکر ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ جس وقت پادری اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے وہ دراصل اُس کے سر کو نہیں بلکہ مصنوعی بالوں کو مس کرتا ہے! ٹرٹولین کا قول تھا کہ جو لوگ خضاب کا استعمال کرتے وہ صریح اس حکم ربانی کی تکذیب کرتے ہیں کہ انسان ایک بال کو بھی سفید یا سیاہ نہیں کر سکتا! اور جو لوگ مصنوعی بال لگاتے ہیں اُن کے حشر کا خیال کر کے تو وہ لرز اٹھتا تھا! یہ خیال اس قدر دیر پا ثابت ہوا کہ بہت آخر زمانہ تک قائم رہا۔ صدیاں گزر گئیں رومی سلطنت کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ ملک میں معاصی و دروایل کے صد ہا سیلاب آ اور جا پکے۔ لیکن جو صوفیہ کلیمنٹ آف الگزنڈریا پھونک گیا تھا۔ اُس کی صدائے بازگشت سینٹ ایمبروز، سینٹ جرم و سینٹ گرگوری نیز بائزن کے مصنفات سے برابر آتی رہی۔

لیکن ان بیانات سے ہمارا یہ مقصود نہیں کہ ہم اُس زمانہ کی اخلاقی زندگی کو بے عیب یا موجودہ حالت سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے تذکرہ سے ہمیں ناظرین کو محض محتاط و خبردار کر دینا منظور تھا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ پادری مصنفین کے روایات کو کافی مبالغہ آمیز مان لینے کے بعد بھی اس زمانہ کا اخلاقی انحطاط بالکل ثابت شدہ رہتا ہے۔ ردعی معاشرت کی جو تصویر اینٹینا کیس نے کھینچی ہے، مارسیلز کی زندگی کی جو تصویر سیلویں نے کھینچی ہے، اور ایشیاؤ کوچک و قسطنطنیہ کے حالات کا جو نقشہ کرنوٹسم نے کھینچا ہے اور جن کی تائید متعدد مؤرخین اور صد ہا دیگر مصنفین کے ضمنی بیانات سے ہوتی ہے، اُن سے یہ حقیقت بالکل مسلم ہو جاتی ہے کہ اخلاقی انحطاط جیسا اُس وقت میں تھا اس سے زیادہ شاید ہی کسی زمانہ میں رہا ہو۔ اور یہ اُمراؤ و باشوں کے طبقہ تک محدود نہ تھا بلکہ ارباب تقویٰ کا دامن اس میں خصوصیت کے ساتھ آلودہ نظر آتا تھا۔ مذہبی ضیافتیں جن کا مقصد میسجوں میں باہم اخوت پیدا کرنا تھا۔ اب بادہ نوشی و بدچلنی کی تماشہ گاہ رہ گئیں تھیں۔ اور کن شکلوں سے جا کر ساتویں صدی میں بند ہوئیں۔ شہداء کی برسیوں یا سالانہ فاتحوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اُن کی یاد و تذکرہ کے بجائے وہاں میدہ لگنے لگے اور شہوت رانی و بدچلنی کو گویا ایک مرکز بنا دیا گیا۔ یہاں تک کہ بالآخر اسی علت میں انھیں بند کر دینا پڑا۔ ازدواج کے بار میں پادری تو مشروع ہی اس کی مخالف لے پئے چل کرتے تھے۔ یعنی مجرد رہا کرتے تھے۔ لیکن اس تجربہ کے پردہ میں ناجائز تعلقات کا وجود بھی سینٹ سیاسپرین ہی کے زمانہ سے تھا جو قسطنطنیہ کے بعد سے بہت ترقی کر گیا اور پادریوں پر بدچلنی کا الزام علانیہ لگایا جانے لگا۔ اکثر یہ ہوتا کہ بن بیاہیاں اور پادری تنہا ایک مکان میں رہتے۔ بلکہ ساتھ نہاتے، بلکہ ایک ہی بستر پر ساتھ سوتے اور یہ دعویٰ کرتے رہتے کہ ہم نے اس قدر ضبط نفس حاصل کر لیا ہے کہ باوجود اس قدر اختلاط کے کبھی جذبہ جنسی کو تحریک نہیں ہوتی۔ امیر ہواؤں کے گرد پادریوں کا ایک ہجوم رہا کرتا جو ہر وقت اُن کی خوشامد میں مشغول رہتے تاکہ انھیں خوش کر کے اُن کے ترکہ پر قبضہ کریں یا نذر کے نام سے کچھ حاصل کریں۔ یہ مرض اس قدر متعدی ہوا کہ بالآخر ویٹینین کو

قانونناس کی ممانعت کرنا پڑی کہ کوئی پادری کسی غیر کی جائداد کا وارث بن سکے اور سینٹ جرم افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اس قانون کی سخت ضرورت تھی۔ بہت لوگ اس لئے گرجا کے خدام بننے لگے کہ ملکی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے تھے اور بہت افراد راہبوں کے حلقہ میں ایسے شامل تھے جو محض اس لئے کہ ہاتھ پیر ہلا کر روٹی کھانا نہ پڑے۔ خانقاہ میں جالہ راہب بن گئے تھے صد ہا سپاہی جنگی خدمت سے بھی چرچہ کر اسی طرح راہبوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اوسے طبقہ کی عورتوں کو کسی نیچے طبقہ کے شخص سے آشنائی پیدا کرنے کا سب سے آسان ذریعہ یہ معلوم تھا کہ خانقاہ نشین ہو جائیں۔ فلسطین جو زائیرین کا مرجع عام تھا سینٹ اریگوری کے زمانہ میں شہرت رانی کا چکلہ ہو کر رہ گیا تھا اور یہ حالت چند روزہ نہ تھی، بلکہ صدیوں تک قائم رہی۔ چنانچہ آٹھویں صدی میں سینٹ بونیفیس اپنے ایک خط میں آج شپ آف کنسٹربری کو تحریر کرتا ہے کہ ”خدا کے واسطے اپنے وطن کی عورتوں کی زیارت رو کے“۔ کیونکہ لندن سے لے کر روم تک یورپ کا کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جس میں انگریزی خوانین جلالت طوائفوں کا پیشہ اختیار کئے نہ ہوں۔ اس زمانہ کے پادریوں کے کھانے پینے اور طرز معاشرت کو دیکھئے تو (بقول سینٹ جروم کے) معلوم ہو گا کہ بڑے بڑے امراء دولت ان کے آگے ماند ہیں۔ اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے تو وہ اور ان کے پیرو جو جوڑ توڑ کرتے تھے ان کی شہادت گرجا کی تاریخ کے ہر صفحہ پر ثبت ہے۔

یہ حال تو مذہبی دنیا کا تھا۔ دنیا داروں کی عام دنیا کی اس وقت سب زیادہ نمایاں خصوصیت طفل مزاجی تھی۔ اخلاقی قوت یوں خواہ اس وقت مشرکوں کے زمانہ سے زیادہ ہو مگر جو کچھ تھی سب صحرا کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور اس لئے دنیا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں باقی رہا تھا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں جو طفلانہ خرابی پھیل گئی تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مذہبی، سیاسی، علمی مناقشہ سب دب گئے تھے۔ اور ان کی جگہ جس چیز پر زور بلوہ و فساد، بلکہ کشت و خون اور بغاوت تک کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ گاڑیوں کی

دوڑیں کس فریق کی فتح ہوگی اور کس کی شکست؟ جرأت و دلیری اور وطن پرستی کا نام
 و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور خلقت میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی
 عیش پرستیاں ارکان دربار کی غلام طینتی اور طبوسات و زیورات کی تزیین و آرایش اپنے شباب
 پر تھیں۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے پھیروں کے دریا
 جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد رہتا دوراہیں پیدا ہوئے
 تھے وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی و بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی غرض بدکاری
 اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہو۔ رائل
 جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا
 البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں
 وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مگر آری، دغا بازی، دروغ گوئی
 کی وہ گرم بازاری تھی جو قیصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ الیہ ظلم، تشدد، شقاوت، و بھیک
 اتنی نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ حریت فکری، آزاد دنیاوی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔
 لیکن ان مناسب نقائص کے ذکر کے ساتھ غیب سے جملہ یہ گفتی ہنرش نیز بگو کے
 سرشت اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ اور اس دور میں جو کچھ محاسن تھے ان کا بھی
 پورا اعتراف کرنا چاہیے۔ رائل بالاس کے پہلو پہلو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت فضائل بھی
 بھی موجود تھے اور یہ سب میح کے پیدا کردہ تھے۔ مناظر سیانی و مغرب کی حکومت (یعنی نو)
 سواہل رخصت ہو گئے تھے اور مشرقی حکومت (یعنی قسطنطنیہ) میں تو ان کا قدم ہی لگنے
 نہ پایا۔ طوائفوں کے بڑے بڑے پھلے جو زہرہ کے مندروں میں قائم تھے یکسر بند کر دیے
 گئے تھے اور مذہب بجائے خود بدچلنی و شہوت پرستی کا محرک نہیں باقی رہنے پایا تھا۔ قیوم
 بخش تصویریں اور نقاشیاں جن کے آثار اب تک موجود ہیں، امرار کی ضیافتوں کا یہ دستور
 کہ خواہیں برہنہ ہو کر کھانا کھلاتی تھیں۔ جرائم خلاف وضع فطرت جن کا روی فرماں روا تک

مسلمانہ ارتکاب کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئی تھیں۔ شہوت پرستی اب بھی زوروں پر تھی تاہم اُس کا اعلان اور اُس کے غیر فطری طریقہ مسدود ہو گئے تھے۔ اگرچہ ایک پُر قوت جماعت ہوئے گا یہ اثر تھا کہ لوگوں پر اخلاق کی ایک ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ نیکی کی انھیں ترغیب ہوتی تھی اور بدی کی طرف سے ایک جھجک قائم تھی۔ لوگ گناہ کرتے تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی دہشت دلوں پر طاری رہتی تھی کہ عاقبت میں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔ صحت و خوشحالی میں ممکن ہے کہ خدا کو بھولے رہتے ہوں لیکن بیماری و مصیبت کے وقت فوراً خدا یاد آجاتا تھا۔ یا جب کسی معصیت کا ارتکاب کرنے لگتے تو ضمیر کی ملامت شروع ہو جاتی اور ضمیر کی ملامت بھی نہ سہی تو کم از کم دنیا کے سامنے اپنی رسوائی و ذلت کا خوف بہ حال لگا رہتا تھا معوض وہ بے خونی، ڈھٹائی اور بے شرمی جو پیشتر گنگاروں میں تھی مسیحیت کے اثر سے جاتی رہی تھی اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہ ہونا چاہیے کہ گو مشرکوں کے بڑے سے بڑے متقی و پاک باز میسجیوں کے بڑے سے بڑے متقی و پاک بازوں کی ٹکر کے تھی تاہم میسجیوں کے بڑے سے بڑے گنگار و مجرم مشرکوں کے بڑے سے بڑے گنگاروں و مجرموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے مشرکوں کی یہ کاریاں میسجیوں کی یہ کاریاں کہیں بڑھی ہوئی تھیں۔ مسیحی و غنطین کا اثر سے خیر و خیرات کے بھی بہت سے طریقے رائج ہو گئے تھے۔

فصل (۹)

دور رہبانیت کے فضائل مخصوص

پچھلی فصل میں مسیحیت کے عام اثرات کا بیان تھا۔ خالص رہبانی اثرات کا سراغ لگاتے ہوئے جیسا کہ بعض پچھلی فصلوں میں گزر چکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت کے بالکل ابتدائی اثرات تمام تر مضر تھے مصلحوں کا ترک دنیا کر کے جنگل و بیابان کو ہجرت کر جانے اور دنیا کے سامنے

تذکیہ نفس کا ایک غلط نصب العین کے پیش ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا کئی صدیوں تک یورپ کی اخلاقی زندگی میں کوئی اصلاح نہ ہو سکی۔ تاہم بعض فضائل اخلاق شروع ہی سے رہبانیت کے جلو میں تھے۔

سب سے زیادہ حقیقی اخلاقی ترقی کی بنیاد، ایثار و فروغ و فراموشی پر ہے۔ رفق و لطف و مہربانی، تہذیب، اعتدال و ضبط، یہ سب بجائے خود فضائل اخلاق کے عنوانات صحیح ہیں تاہم نفس بشری کی اصلی عظمت و شرافت کا پتہ ان سے نہیں چلتا۔ اس کے لئے ان سے بالاتر جانا چاہئے۔ اس کا صحیح معیاری ایثار ہے اور یہی نصب العین رہا۔ دوراہمیں نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور خود اس پر عمل کیا۔ ان کے طرز عمل میں گواہی خامی ضرور رہ گئی تھی کہ ایثار کو وہ اپنی روحانی نو و غرضیوں کی آمیزش سے پاک نہیں رکھ سکتے تھے۔ تاہم اتنا بھی دنیا میں کون کرتا ہے کہ ثواب اجل کے لئے ہزار ہا لذائذ عاجل سے دست بردار ہو جائے اور مال و دولت، بال بچہ، عزت و شہرت سب کو چھوڑ چھاڑ کر صحرائے نشیمن اختیار کر لے۔ ایسے نادر و نایاب وقت میں جبکہ ساری دنیا پر دولت کی حکومت تھی اور اس سے اہل کلیسا بھی مستثنیٰ نہیں رہے تھے یہ صد اصراف راہبوں کے حلقہ سے بلند ہوتی تھی، کہ

”انسان کے حق میں محنت، آرام سے بہتر، گناہی، نام و نشان سے بہتر، اور داد و بخشش

قبول عطیات سے بہتر ہے۔“

یا پھر جس زمانہ میں کہ ائمہ کلیسا اپنی خفیف الحرقمیت سے نام پیدا کر رہے تھے، رہبانی جماعت کی طرف سے یہ ندا آتی تھی کہ

”راہب، حذر کرو، دو جامعوں کے قربت سے حذر کرو، ایک عورتوں سے دوسری باہر دلوں۔“

یہ صدائیں بے اثر نہیں رہ سکتی تھیں اور الفاظ سے زیادہ موثر راہبوں کا طرز عمل تھا ان کی بد قطع شکلیں نفرت انگیز وضعیں، اور وحشت خیز ریاضتیں ہی غیر متدن و مانگوں پر اور زیادہ اثر ڈالتی تھیں لوگوں کے عام تخیل میں راہب کی تصویر یہ تھی کہ ایک لابی سفید ڈاڑھی والا شخص

جس کے چہرہ پر نور برس رہا ہے۔ بحال سکون تار کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ شیاطین آکر دوسوہ اندازی کرنا چاہتے ہیں مگر اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جنگلی درندے اُس کے اشارہ پر کام کرتے ہیں اور درد و دکھ بیماری کا ہلی کو وہ ایک جنبش بسے فوراً دفع کر سکتا ہے۔ اس تحمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مقدس بزرگوں کے متعلق صد ہا قصہ و افسانہ ملک میں شائع ہو گئے۔ یہ قصہ عموماً مہمل و مضحکہ انگیز ہیں۔ تاہم اپنے اندر اعلیٰ ترین اخلاقی نتائج رکھتے ہیں۔ یہ اس قدر شائع ہو گئے تھے کہ مائیں اپنے بچوں کو سُلاتے ہوئے انھیں کو بطور کمائینوں کے بیان کرتیں اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کا دائرہ نہایت وسیع ہوتا جاتا۔ ذیل میں ہم ناظرین کے تفتن و واقفیت کے لئے ایک آدھ کہانی اس طرح کی درج کرتے ہیں:-

سینٹ انٹونی کو بیٹھے بیٹھے ایک شب کو یہ خیال گزرا کہ اس سے بڑا زاہد تمام صحرا میں کوئی نہیں۔ معاً اتفاق ہوا کہ نہیں ایک زاہد تم سے بھی زیادہ برگزیدہ ہے۔ یہ معلوم کر کے سینٹ انٹونی کو اس کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور صبح وہ اس کی تلاش میں سفر کو نکلا۔ راستہ میں اُسے عجیب الخفقت انسان ملتے رہے۔ مثلاً ایسے کہ جن کے سر پر سینگ تھے اور جن کے سر پر بکریوں کے سے تھے۔ انھوں نے منزل مقصود کا پتہ بتایا یہاں تک کہ سینٹ انٹونی سینٹ پال کے دروازہ پر پہنچا جس کی عمر اس وقت ۱۱۳ سال کی تھی۔ اسے پہلے دروازہ کھولنے میں تامل ہوا۔ لیکن بالا خرہ کھول دیا۔ اور جب سینٹ انٹونی سے بغلیہ ہو چکا تو دنیا کی حالت سے متعلق سوالات شروع کئے۔ مثلاً یہ کہ اب بھی دنیا میں نئے نئے مکانات تعمیر ہوتے ہیں؟ اب بھی دنیا میں بُت پرستی کا وجود ہے؟ وغیرہ۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک گوا ایک چپاتی لاکر ڈال گیا۔ سینٹ پال نے کہا کہ ساٹھ برس گزرے کہ میرا رزق آدھی چپاتی روز کا ہے۔ یہ آج پوری روٹی ہمارے حصہ کے لئے آئی ہے۔ یہ لکھ دو نوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک چمٹہ کے کنارے کھانے کو بیٹھ۔ لیکن اب ایک سخت غامض مسئلہ چھڑ گیا۔ وہ یہ کہ ابتدا کون کرے؟ سینٹ پال کہتا تھا کہ آپ مہمان ہیں، حق تقدیم آپ کو حاصل ہے۔ سینٹ انٹونی

اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کرتا تھا کہ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کا سن ۱۱۳ سال کا ہے اور میں ۹۰ سال کا ہوں، کئی گھنٹے گزر گئے اور اس نازک بحث کا کسی طرح تصفیہ نہ ہو سکا تھا۔ آج جب بالکل شام ہو گئی تب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس چپاتی کو دو دنوں ایک ساتھ اپنی اپنی طرف کیٹیں۔ چنانچہ اسی فیصلہ پر عمل ہوا۔ چند روز کے بعد سینٹ پال کا انتقال ہو گیا۔ سینٹ انٹونی کو دست و بازو میں اتنی قوت نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں تجیز و تکفین کرتا۔ اس فکر میں تھا کہ دو قوی ہیکل شیر جنگل سے نکلے۔ انھوں نے قبر کھود کر نعش کو دفن کیا۔ قبر پر روئے اور پھر سینٹ انٹونی کے آگے سر جھکا کر برکت چاہی۔

یہ قصہ سینٹ جردم بحال سنجیدگی و نجستگی اعتقاد بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو اس کی صداقت میں شک کرے وہ لحد و زندیق ہے۔ اسی طرح مورخ پبلیڈس روایت کرتا ہے کہ میں نے سینٹ میکیریس کے سفر کا حال خود انھیں کی زبان سے یہ سنا ہے کہ جب انھیں اُس مشہور طلسمی باغ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا جس پر شیاطین کی عملداری ہوا اور وہ اس قصد سے نکلے تو متواتر دنوں تک وہ تاروں کی مدد سے سفر کرتے رہے اور راستہ یاد رکھنے کے لئے برابر لکڑیاں گاڑتے جاتے تھے۔ لیکن شیاطین یہ تدبیر نہیں چلنے دیتے تھے اور لکڑیاں اکھاڑ کر روزرات کو اُن کے سر ہانے رکھ دیتے تھے جب وہ باغ نزدیک آگیا تو ستر ذرات شیطان نے نکل کر اُس سے کہا کہ ”کیوں ہمیں وق کرنے آئے ہو“ مگر میکیریس نے کہا کہ ”میں صرف یہاں کے عجائب دیکھنے آیا ہوں“ تم سے کچھ تعرض نہ کروں گا چن چن پچھ اُس نے باغ کی سیر کی اور میں دن کے بدلنے زاویہ کو واپس پہنچا۔

اس طرح کے صدا بہ قصہ اور مشہور ہیں جو اس قدر مستبعد تو نہیں مگر جن میں اخلاقی سبق اُن بہتر نکلے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب ہی سینٹ میکیریس بیمار پڑا اور کسی مُردے نے انکو لاکر دئے تو اس نے کسی اور ایسے تذکر دئے اُس نے بھی کسی تیسرے راہب کے تذکر دئے یہاں تک کہ سارا صبح اکا بکر لگا کر بالآخر وہ پھر خود سینٹ میکیریس کے پاس واپس آگئے۔ یہی زاہد ہریش خلوت

میں گدہ لاپانی پیتا تھا۔ لیکن جب کوئی دوسرا راہب شراب پیش کرتا تو اس کی خاطر کٹنی کے خیال سے یہ کبھی انکار نہ کرتا اور اس کے بعد اس کا کفارہ یوں کرتا کہ جتنے جام شراب کے پئے تھے اتنے دنوں سادہ پانی تک نہ پیتا۔ اسی کے ایک مرید نے ایک باریہ دیکھا کہ ایک مشرک بڑی سی لالچی ہاتھ میں لئے ہوئے بہت تیزی سے صحرا کی طرف لپکتا جا رہا ہے۔ اور پکار کر پوچھا کہ ”لے دو تو زاد کماں چلا“ مشرک کو سخت غصہ آیا اور اُس نے اسی لالچی سے ان کی خوب مڑمت کی۔ مار پیٹ کر کے چلا ہی تھا کہ سینٹ میکریس کا سامنا ہو گیا جس نے اس فروتنی و انکسار کے ساتھ اس سے خطاب کیا کہ مشرک کا دل موم ہو گیا وہ فوراً عیسائی ہو گیا اور جسے ابھی زد و کوب کیا تھا اُس کی تیمارداری و علاج میں مصروف ہو گیا۔

سینٹ آیوئیس ایک بارسینٹ کین کی ملاقات کو گیا۔ میزبان نے روٹیاں لاکر سامنے رکھیں۔ آسمان نے کہا کہ ”قبل غروب آفتاب میں منہ پر کبھی دانہ نہیں رکھتا“ میزبان نے اصرار کیا اور جب وہ بھی ناکام رہا تو کہا کہ ”آہ! مجھے کس قدر ندامت ہے کہ تم مجھے ایک ذرا ہتھکڑی ملنے آئے مگر اگر دیکھا تو ایک شکم پرست شخص پایا“ اس پر مہمان نے کہا کہ ”آپ آزدہ نہ ہوں آپ کی آزدگی کے مقابلہ میں میں گوشت تک کھا لینے کو تیار ہوں“ جب کھانا ہو چکا تو میزبان نے کہا کہ ”بھائی دستور میرا بھی وہی ہے جو ہمارا ہے۔ لیکن مہماں نوازی کا ثواب تو اب صوم سے زیادہ ہے“ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک امیر خاتون جس وقت ایک راہب کی مہماں نوازی میں مصروف تھی اس کا بچہ کنوئیں میں گر پڑا۔ مگر راہب کی کرامت یہ تھی کہ آگے ذرا گزرنے پر بچہ نکلتا لیٹا رہا اور بعد کو اپنی ماں سے بیان کیا کہ ”جس وقت میں کنوئیں میں گرنے لگا ہوں میں نے دیکھا کہ راہب نے ہاتھ پھیلا کر مجھے گود میں لے لیا“

سینٹ میکریس کی بابت ایک اور روایت یہ مشہور ہے کہ اُس پر ایک باریہ القا ہوا کہ کسی پڑوس کے شہر میں دو شاوی شدہ عورتیں اس سے زیادہ برگزیدہ ہیں۔ حالانکہ ازدواج و برگزیدگی میں اُس وقت تناقض سمجھا جاتا تھا۔ سینٹ موصوف جاکران سے ملا اور ان سے

اُن کے تقدس کا راز پوچھا۔ انھوں نے پہلے تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "ہیں تقدس بزرگزی کی سے کیا واسطہ، آج ہی رات کو چارے شوہروں نے ہم سے صحبت کی ہے۔ ہم میں کیا نیکی پیدا ہو سکتی ہے؟" مگر جب سینٹ کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو انھوں نے بیان کیا کہ ہم دونوں دو بھائیوں کی بیویاں ہیں۔ اور پندرہ سال سے ہم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا ہے۔ ہم نے اپنے شوہروں سے بہت منت کی کہ ہمیں چھوڑ دیں مگر انھوں نے ہمیں نہ چھوڑا۔ تب سے ہم نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کبھی کوئی گناہ کی بات منہ سے نہ نکالیں گے۔" اس پر سینٹ نے اختیاء چلا اٹھا کہ "وائے، خدا از دواج بخرد، اور خانقاہ نشینی و دنیا داری کو نہیں دیکھتا بلکہ دل اور نیت کو دیکھتا ہے۔ اور برگزیدہ ہیں وہ جن کی طبیعت نیک ہے۔"

فصل (۱۰)

حیوانات پر شفقت

روایات بالا کی طوالت سے شاید بعض ناظرین اکتا گئے ہوں لیکن میں نے اس طوالت کو اس لئے اختیار کیا کہ ان کی مدد سے اُس وقت کے مسیحیوں کے اصلی اندرونی جذبات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں میں فصل ہذا میں اُن قصوں اور روایتوں کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو راہبان صحرا اور حیوانات کے باہمی تعلق سے متعلق شائع تھیں۔ ان کا تذکرہ اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان سے تاریخ اخلاق کے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ حیوانات کے ساتھ ہمدردی و شفقت کا خیال کیونکر پھیلا۔ یہ خیال قدامت کے یہاں ناپید نہ تھا بلکہ اُن کے ہاں متعدد روایات ایسی مشہور تھیں جن میں حیوانات کے ساتھ اعلیٰ ذہنی و اخلاقی قوی کا انشاء کیا گیا تھا جس سے یہ بھی ضمناً پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ علم الحیوانات اور حیوانی خصائص سے کس قدر ناواقف تھے۔ ہاتھی کے دانشمند و فیاض ہونے کا عقیدہ عام طور پر شائع تھا بلکہ اس کی

ایک گونہ پرستش ہوتی تھی۔ شہد کی مکھیوں کے بارہ میں یہ یقین تھا کہ جب ان سے خلاف آئین حکومت کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو وہ خود کشتی کر ڈالتی ہیں۔ یا بعض اور حیوانات اپنے بچوں کے تغذیہ کے لئے خود کشتی کر لیتے ہیں۔ ایک عقاب کی بابت مشہور تھا کہ وہ ایک نو عمر لڑکی پر عاشق تھا اور جب اُس کی وفات پر اُس کی نعش جلانی جانے لگی تو عاشق نے بھی اپنے تئیں شعلوں پر گر لگا کر اُس کی اپنی جان دیدی۔ اور کتوں سے متعلق تو دو ایک نہیں صد قصے اس کے مشہور تھے کہ اپنے آقاؤں کے ساتھ اُنھوں نے بھی اپنی جان دیدی۔ بعض حکماء کا مقولہ تھا کہ حیوانات میں مثل انسان کے روح منتقل ہوتی ہے اور فیثاغورس تو اس کا قائل تھا کہ انسانی رو میں یہ قاعدہ تناسخ حیوانات میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ رواقیہ اور بعض اور حکماء کا یہ مسلک تھا کہ روح انسانی و روح حیوانی دونوں روح ربانی کے برابر درجہ کے مظاہر ہیں۔

خیر یہ تو افسانہ تھے۔ لیکن ان کے علاوہ تحفظ حیوانات کے قانونی آثار بھی قدما کے یہاں ملتے ہیں۔ زراعت کا دار مدار چونکہ زیادہ تربیل پر ہے۔ لہذا یہ مشروع سے مختلف ممالک میں خاص طور پر مقدس سمجھا گیا ہے۔ مثلاً مصر میں۔ اور توریت میں تو بیل کے ساتھ بدسلوکی کی خاص مانعت آئی ہے۔ روم قدیم میں اس خیال میں اس قدر مبالغہ کیا گیا کہ بیل کو ہلاک کرنا، قتل عدا انسانی کے مراد سمجھا جانے لگا۔ اور منقول ہے کہ اسی طرح کا ایک قانون یونان قدیم میں بھی رائج تھا۔ مور کا احترام بھی یونان و یروشلم میں یکساں فرض تھا۔ کوئی پرند جب کسی انسان کے پاس آکر پناہ لے تو اس کی حفاظت کرنا اور اسے رہائی دینا فرائض میں داخل تھا۔ بلکہ ایک روایت یہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ یونان میں کوئی بچہ پرندوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے سزائے موت دیدی گئی۔

ارتقاء، اقوام کی رفتار کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بیدردی و جھسی سے ذکی الحسی درمیان کی طرف صعود ہوتا رہتا ہے۔ جو انسانیت و لطافت شائستگی کا سنگ بنیاد ہے۔ لیکن اس عام

رفتاریں بعض خاص حالات سے رکاوٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت یہاں بھی پیش آتی
 قوانین بالا کا مقصد یہ تھا کہ ہیل وغیرہ کا آمد حیوانات کے تحفظ کے ذریعہ سے ایک غائبہ دوش
 و جنگو قوم میں زراعت پیشگی کے عادات پیدا کئے جائیں، لیکن اس رحمانہ احساس کے بڑے
 دشمن وہ کھیل یا بازیوں ثابت ہوئیں جن میں حیوانات کی خونریزی لازمی تھی یونان قدیم
 میں ہیل بازی، مرغ بازی، بیئر بازی کا دستور عام تھا اور حکومت کی طرف سے اس کی اور
 تائید و اشاعت ہوتی تھی تاکہ اہل فوج جرات و شجاعت کا ان سے سبق حاصل کریں۔ روم
 قدیم میں ان چیزوں کی جو افراط تھی اس کا ذکر پیشتر گزر چکا ہے۔ لیکن جس طرح ہم یہ پہلی جلد کے
 کسی باب میں دکھا چکے ہیں کہ باوجود مناظر سیانی کی کثرت کے انسانیت کا معیار گرنے نہیں
 پایا تھا۔ اسی طرح یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ باوجود حیوانات کی خونریزی جنگوں اور بازیوں کے
 خود رومی لٹریچر، اور نیز ان ممالک کے لٹریچر میں جو روم کے ماتحت تھے حیوانات کے ساتھ
 بہ لطف و شفقت پیش آنے کے بہ کثرت نظائر ملتے ہیں۔ درجہل، لکڑیٹس، پلوٹارک، آؤڈ،
 یونیل، پولونیس، و آئین ان سب کے یہاں یہ خیال کسی نہ کسی پیرایہ میں ملتا ہے۔

یعنی تبصرہ جانوروں کو درجہل، ہیس صدی حیوانات کے کٹنے کے ساتھ ساتھ اس احساس کا قیام رہنا چاہئے
 حیرت انگیز ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ صرف یہ احساس ہی نہیں موجود تھا بلکہ اس کی متعین طور
 پر تعلیمات موجود تھیں۔ فینا غورٹ و امیڈ وکلس نے اس تعلیم کی بنا، تنازع ارواح پر رکھی تھی
 یعنی اس مسئلہ پر کہ وہی ارواح اول بدل کر انسان و حیوان کے قالبوں میں آتی جاتی رہتی ہیں
 اور فلسفہ فینا غورٹ کی اشاعت کے ساتھ اس عقیدہ کی تعلیم بھی عام ہوئی گئی۔ پارفری نے
 ترک لحم کی تلقین کی اور سینکا نے کچھ روز کے لئے اس پر عمل درآمد بھی کیا۔ لیکن ان سب سے
 بڑھ چڑھ کر کارنامہ پلوٹارک کا تھا۔ اس نے تنازع سے بالکل قطع نظر کر کے شفقت حیوانات
 کو فرائض انسانی میں داخل کیا اور اس شد و مد سے اس کی وکالت کی کہ اس کی نظیر مسیحی
 لٹریچر میں بھی کم از کم سترہ سو سال تک نہیں ملتی۔ وہ اس کا قائل ہے کہ حیوانات کے ساتھ

حسن سلوک اسی قدر قطعی و لازمی ہے جتنا خود بنی نوع انسان کے ساتھ اور ایسی ہی خیر کے مناظر وغیرہ کی پر جوش مخالفت کرتا ہو۔

میسیت کا دور اولیٰ اس کا مودہ نہ تھا۔ کہیں کہیں اتفاقی طور پر اس زمانہ میں بھی پادری ترک لحم و شفقت حیوانات کے باب میں تلامذہ فیتاغورث کی بولی بول گئے ہیں۔ تاہم عام حالت یہ تھی کہ اُن کے عقیدہ تناسخ کی کُلّی تعلیل ہوتی تھی۔ نوع انسان جلد انواع عالم سے کلیتہً و اصولاً ممتاز سمجھی جاتی تھی۔ اور تمام فرائض انسانی کا دائرہ صرف بنی انسان تک محدود تھا۔ بلکہ اس خاص باب میں تو انجیل سے زیادہ توریت نے کام کیا ہو کہ اُس میں حیوانات کے ساتھ حسن سلوک کے اگر صریح احکام نہیں مقرر ہیں تو کم از کم ایسے اشارات تو بہ کثرت ہیں جن سے دل میں اس کا احساس پیدا ہو جاتا ہو۔

لیکن مسیحی بشریت میں حقوق حیوانات کے متبعین نہ ہونے کی تلافی ایک دوسری صورت سے ہو گئی یعنی راہبوں کے طرز زندگی سے۔ صحرا و بیابان میں تنہا رہنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حیوانات کے ساتھ زیادہ تعلقات پیدا ہوں اور اس بنا پر عوام کے ذہن میں راہبانانہ زندگی کا جو تخیل تھا اُس کا ایک لازمی عنصر حیوان دوستی بھی ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ تخیل طرح طرح کے افسانوں میں جلوہ دکھلانے لگا۔ مثلاً یہ کہ پرندہ پیر صحرا کی آواز پر اپنی پرواز روک دیتے ہیں، شیر اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں اور راہب کا دل اگر چہ اپنی سمجھنوں کی محبت سے خالی ہوتا ہو۔ تاہم اپنے ان احباب صحرائی کے لئے ہمدردی و الفت رکھتا ہے اور اس کی تقدس و برگزیدگی اس کے ہمیشہ میں بھی سراست کر جاتی ہے۔ سینٹ یقون جب سفر کے لئے باہر جاتا تھا تو درندے رقتا، سفر کا کام دیتے تھے اور وہ اس رفاقت کے معاوضہ میں انھیں اپنے کنوئیں کا پانی پلاتا تھا۔ مصر کے ایک راہب نے بیابان میں ایک خوشنما باغ تیار کیا تھا اور وہاں ایک تاڑ کے نیچے بیٹھ کر شیروں کو اپنے ہاتھ سے پھل پھلاری کھلاتا تھا۔ سینٹ پومن ایک بار اس کے وقت سردی سے لرز رہا تھا کہ ایک شیر نے آکر اُس کے سارے

جسم کو بچھالیا اور اس طرح سردی کی اذیت سے وہ محفوظ ہو گیا۔ شیر مقدور راہبوں کی خدمت
 کیا کرتے تھے۔ بلکہ بعض بعض کی تجویز و تکفین تک انھیں نے ہی کی ہے۔ ایک ضعیف العمر
 راہب ایک مرتبہ پیدل سفر کر رہا تھا۔ اور اپنا اسباب ایک گدھے پر بار رکھے ہوئے تھا۔ راستہ
 میں ایک شیر نے گدھے کو ہلاک کر ڈالا۔ لیکن اس کے بعد راہب کے اشارہ پر اس کا اسباب خود
 اپنی پشت پر بار کر کے منزل مقصود تک پہنچا آیا۔ ایک اور راہب نے ایک مرتبہ جنگل میں جنگلی
 گدھوں کے ایک جھنڈ کو آواز دی جس میں سے ایک گدھا نکل کر آیا اور وہ ان کا سامان بار
 کر کے ساتھ چلا۔ بعض راہبوں نے گھڑیاں و دیگر دریائی جانوروں کی پشت پر سوار ہو کر دریائے
 نیل و سندھ کو عبور کیا ہے اور آہوؤں کے تذکرہ تو ان قصوں میں نہایت کثرت سے آتے ہیں
 جن میں شاید بے زیادہ دلچسپ قصہ یہ ہو کہ ایک شکاری ایک آہو کا تعاقب کر رہا تھا کہ قلعہ
 آہو نے اپنی اصلی شکل اختیار کر لی۔ یعنی خود مسج کی اور اس کی پیشانی پر صلیب لٹک رہی تھی یہ
 معجزہ دیکھ کر شکاری معاً ایمان لے آیا۔ سینٹون کی جماعت میں مقدونینٹ لیے ہوئے ہیں
 جو خاص خاص نوعی حیوانات کے مخصوص پیرایہ سینٹ ہوتے ہیں۔ مثلاً سینٹ اریلمس بلیوں کے
 پیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح کوئی سوروں کا ہوا ہے۔ کوئی آہوؤں کا، کوئی کوؤں کا وغیرہ سینٹ کوئیر
 کے تین رفیق تھے، ایک مرغ، ایک چوہا، اور ایک کھی۔ مرغ کا کام یہ تھا کہ اوقات عبادت پر
 بانگ میتا تھا اور اگر راہب کو اٹھنے میں دیر ہوتی تو چوہا اس کا کان کترے لگتا۔ اور کھئی کا
 فرض یہ تھا کہ دوران مطالعہ میں راہب کو اگر کسی وقت اپنی نظر ہٹا لینا پڑتی تو کھی عین اس
 لفظ پر میٹھ جاتی جہاں سے اس نے چھوڑا تھا۔ اور اس طرح نشان کا کام دیتی۔ ایک اور راہب کا
 معمول تھا کہ شب کا کھانا ایک بیٹھریئے کے ساتھ کھاتا تھا۔ ایک روز بھیڑیا قبل از وقت آکر
 وہ کھانا تنہا کھا گیا۔ مگر اس خطا پر اسے اتنی مذمت ہوئی کہ ایک ہفتہ تک اس نے راہب کو
 منہ نہیں دکھایا اور بالآخر جب آیا تو سرنگوں جس سے انتہائی انفعال برتا تھا۔ راہب نے اس کا
 قصور معاف کیا اور اس روز خوش ہو کر اسے دہرا حصہ دیا۔ اسی طرح اور صدہا روایات اس

طرح کی مشہور ہیں کہ کسی راہب نے ایک شیرنی کے اندھے بچہ کو بینا کر دیا۔ کسی زخمی پرندہ کو فوراً اپنی دعا سے اچھا کر دیا۔ کسی مڑوہ پرندہ کو زندہ کر دیا۔ اور ان سبھی بڑھکریہ کہ حیوانات کی اخلاقی زندگی میں معاصی اصلاح کر دی یعنی جو جانور چور تھے ان سے چوری کی عادت پھڑادی۔ جو بدعہد تھے انھیں با وفا بنا دیا۔ رقص علی ہذا۔

میں نے ابھی کہا کہ اس قبیل کی صد ہا روایتیں مشہور تھیں اس میں مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے۔ صد ہا کیا معنی ہزار ہا روایات اس قسم کی شائع تھیں اور ان کی یہ افراط و کثرت بلاوجہ نہ تھی ایک تو صحرا کی غلوت نشینی بجائے خود انسان و حیوان کے درمیان میل جول کی طرف مڑی ہوئی ہے۔ دوسرے غیر تربیت یافتہ نفوس بھسائل و ردائل کو مجسم شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں اور تجسیم کے لئے حیوانات کا قالب موزوں نکلا۔ تیسرے مشرکوں کے زمانہ کے توہمات ابھی باقی تھے جو حیوانات کے جانب عقل و اخلاق کا انتساب کرتے تھے۔ ان مختلف قوتوں نے مل کر اس طرح کے قصص کو خوب چمکا دیا۔ موجودہ ناظرین انھیں مفرخفات کے درجہ میں کھیں گے اور ایک بنجیدہ تالیف میں ان کے داخلہ پر معترض ہوں گے۔ لیکن درحقیقت یہ اعتراض بالکل سچا ہوگا۔ کیونکہ صدیوں تک یہی مفرخفات جزو معتقدات رہیں۔ بلکہ یہی خوش اعتقاد مذہب اخلاق اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ناقابل انفصال طور پر وابستہ ہونے کے ساتھ قوم اندرونی جذبات کی بہترین ترجمان رہی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ سے شفقت حیوانات کے مسئلہ پر جو روشنی پڑتی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن خوش اعتقادیوں کی اس مسلسل داستان کے علاوہ دو چار واقعات مستند تاریخی ذرائع سے بھی ہم تک پہنچے ہیں جن سے راہبوں کی واقعی ہمدردی حیوانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً تیرھویں صدی میں وینس میں ایک غیر معروف سینٹ جمیس ہوا جو اس کا دستو تھا کہ لڑکے جن چڑیوں کی ٹانگ میں ڈور باندھ باندھ ان سے کھیلا کرتے تھے۔ یہ انھیں ان سے خرید کر کے رہا کر دیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق پر بھی ظلم نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ یا پھر مثلاً سینٹ فرانسس اسپی

کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے بادشاہ کے دربار میں کبھی باریابی نصیب ہو تو میں اُسے خدا کا واسطہ دلا کر یہ التجا کروں گا کہ لو دن (چند دلوں) کی اسیری کی مخالفت کرے اور یہ قانون جاری کرے کہ گدھوں اور بیلوں کو بڑے دن کے دن خصوصیت کے ساتھ زیادہ اور عمدہ کھانا دیا جائے۔ اسی راہب کی بابت بیسیوں افسانہ بھی مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے ایک بار ایک بھیڑیے سے یہ وعدہ لے لیا کہ آئندہ کبھی بھیڑیوں پر حملہ نہ کرے گا اور بھیڑیے نے پیاں باندھنے کے طور پر اپنا پنچہ اس کے ہاتھ پر مارا اور اس کے بعد سے اہل شہر روزانہ اُسی بھیڑیے کا ازوقہ دیدیتے تھے۔ وغیرہ

لیکن بحیثیت مجموعی ہم سے کوئی رائے پوچھے تو ہم یقیناً کہیں گے کہ کتھولک اہم نے شفقت حیوانات کے باب میں جو کچھ کیا وہ برائی نام سے زائد نہیں۔ علم برداران مذہب کا یہ ہمیشہ شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر شے کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور چونکہ اُن کے نظام نجات و کفارہ میں حیوانات کا کوئی درجہ نہ تھا۔ اس لئے کبھی انہوں نے ان کے حقوق کی طرف اعتنائے کی، بلکہ کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ اُن کا کوئی حق بھی ہمارے اوپر ہے۔ قصص بالا میں بھی جتنی مثالیں حیوانات کے ساتھ ہمدردی و شفقت کی ملتی ہیں اُن میں سے کوئی اس حیثیت نہیں کہ حیوان فی نفسہ ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے بلکہ محض اُن حیوانات سے محبت ہے جنہیں مسیح یا دیگر بزرگان دین کے ساتھ کوئی نسبت تخصیص رہی ہے۔ مثلاً گدھے سے اس لئے محبت تھی کہ مسیح اس پر سوار ہوئے تھے۔ آہوؤں سے اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے بزرگوں کے مخفی قبروں کا پتہ لگتا تھا۔ و قس علی ہذا۔

غرض جتنی روایات ہیں سب کسی مذہبی تخصیص کی بنا پر حسن سلوک کی ہیں ورنہ حیوانات کے ساتھ من حیث الہیوان کسی فرض کی ادائی کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اس مسئلہ پر دو بالکل مختلف حیثیات سے نظر کی جاسکتی ہے۔ ایک اس لحاظ سے کہ حیوانات کو اذیت و تکلیف کس درجہ کی ہوتی ہے؟ دوسرے اس نقطہ نظر سے

کہ ان سے انسان کی سرشت اخلاقی میں شقاوت و سنگدلی کہاں تک پیدا ہوتی ہے؟ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی متناسب ہرگز نہیں ہوتیں۔ کیونکہ آج بھی ہمارے شکار کے وقت شکار کو جو اذیت و تکلیف ہوتی ہے وہ ہرگز اُس اذیت و تکلیف سے کمتر نہیں جو جانوروں کو اکھاڑے میں باہم لڑائے جانے سے ہوتی تھی۔ تاہم چونکہ تعاقب کے وقت ہم میں جو خوش جوش ہوتا ہے اور شکار اپنی تکلیف کو ظاہر نہیں کر سکتا، اس لئے شکار سے ہمارے نفس میں وہ شقاوت و قساوت نہیں پیدا ہوتی جو قدیم خونریز ملاعب کے نظارہ سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ قدیم خونریز مناظر آج بے شبہ دنیا کی مسیحیت سے معدوم ہو گئے ہیں، لیکن ان کی معدومیت میں مسیحیت کا کیا خاص احسان ہے؟ جس زمانہ میں اور جن ممالک میں مسیحیت اپنے عروج پر رہی وہاں یہ خونریز ملاعب برابر قائم رہے اور آج جو معدوم ہوئے ہیں تو اس لئے کہ تمدن کی ترقی اور شایستگی کی لطافت سے لوگوں کے مذاق میں اس قدر نزاکت و نفاست پیدا ہو گئی ہے کہ وہ مناظر خونریزی کو نظارہ کی تاب نہیں لاسکتے۔ نیز اس لئے ڈراما و تھیٹر کی گرم بازاری نے تفریحات و ملاعب کا رنج اب بالکل دوسری سمت پھیر دیا ہے۔ اس انقلاب احساس کی پروٹسٹنٹ کلیسا نے اپنے اپنے ممالک میں تائید کی ہے، لیکن کیتھولک ممالک میں امد کلیسا کو یہ فخر بھی نہیں دیا جاسکتا۔ وہاں یہ کام والیٹر و بیکسیر یا جیسے اشخاص کے ہاتھوں سر انجام پایا ہے۔ اسی حالت میں اصل مسئلہ کے ان دو پہلوؤں کی تفریق کو ملحوظ رکھ کے ایک حکیم اخلاق بالآخر یہ فیصلہ کرے گا کہ موجودہ طرق شکار و صیاد افکنی سے اگرچہ نفس میں وہ قساوت نہیں پیدا ہوتی جو قدیم ملاعب سے پیدا ہوتی تھی۔ یا آج کل طبی و عضویاتی معلومات کی غرض سے زندہ حیوانات پر جو اعمال جراحی کئے جاتے ہیں وہ چونکہ دنیا کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اس لئے ان کا ذہر بلا اثر عام اخلاق پر نہیں پڑنے پاتا۔ تاہم ہم میں سے کون رحیم المرتضیٰ شخص ایسا ہے جس کے جس اخلاقی کو ان واقعات کے نظارہ سے صدمہ نہیں پہنچتا؟ اور ان چیزوں کو باضابطہ حدود اخلاق کے اندر لانا یا حیوانیات کے ساتھ حسن سلوک کو ایک اخلاقی فرض سمجھنا تو اٹھاریس

صدی کے بالکل ماوی تمدن و دنیوی شائستگی کا نتیجہ ہے جس میں راہبان صحرا کی سعی و کوشش کو کوئی دخل نہیں مسیحی دنیا کو اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس باب میں ہندو مسلمان دونوں اس سے بہت سبقت لے گئے ہیں، بلکہ آج تک جن ممالک میں رومن کتھولک فرقہ کا غلبہ (مثلاً اسپین و اٹلی) وہاں اب بھی حیوانات پر بحال شقاوت و بالاعلان مظالم جاری ہیں خالق اہمیت کا ابتدائی اثر دنیا پر جس حد تک مفید پڑا وہ تخیل کے ذریعہ سے قصوں اور افسانوں کی وساطت سے پڑا۔ مشرق میں بعض خالقانہ نشین بڑے مشہور عالم ہوئے ہیں اور ان میں سے اکثر زاہدان مرتاض پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن مغرب میں خالق اہمیت نے اس سے اعلیٰ اثر مظاہر میں اپنا جلوہ دکھلایا۔ شروع شروع میں یہاں بھی زہد خشک و عبادات و ریاضات کی گرم بازاری رہی۔ لیکن تین سبب ایسے پیش آئے جنہوں نے رہبانیت کا رُخ عملیت کی طرف پھیر دیا۔ ایک یہ کہ مغرب کی آب و ہوا اور یہاں کی اقوام کی نسلی خصوصیات خود ہی جسم کو ریاضات شاقہ کے برداشت کی قابل نہیں رکھتیں اور نہ دماغ میں زیادہ توہمات پیدا ہونے دیتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ چھٹی صدی میں ایک مقنن اعظم ایسا پیدا ہوا جس کا اثر رفتہ رفتہ سارے یورپ پر محیط ہو گیا اور جس نے غیر ضروری و محکمہ ریاضات کو ناجائز اور محنت و کاروبار کو راہبانہ زندگی کا جز و قرار دے کر موجودہ تمدن کی داغ بیل ڈال دی۔ تیسرے یہ کہ بربروں کے پیہم حملوں نے نظام حکومت و معاشرت کو دہم و برہم کر کے پھرا سے اُس کی ابتدائی صورت میں پیدا کر دیا اور اس طرح سیاسی، علمی و معاشرتی نظامات کا بار خالقانہ ہوں ہی پر آ پڑا۔

بعض مؤرخوں نے کہا ہے کہ الاریک کے ہاتھوں تیسرے رومن سے چونکہ مشرکانہ مذہب کی بڑی بڑی عظیم الشان یادگاریں مٹ گئیں۔ اس لئے یہ واقعہ بجائے خود اس شہر میں مسیحیت کی تقویت کا باعث ہو گیا۔ میرے نزدیک اسے ذرا زیادہ وسعت دے کر اسے مغربی تمدن کے عام انحطاط پر منطبق کرنا چاہیے۔ اس تمدن میں مسیحیت اگرچہ ملکی مذہب کا مرتبہ رکھتی تھی تاہم

سلطنت کا سارا فلسفہ ساری روایات کا دار و مدار بُت پرستانہ مذہب پر تھا جس کے پیدا کردہ قدیم دستور و کھصال لوگوں کے خیمہ میں داخل ہو گئے تھے۔ بربروں کے حلقوں نے اس تمدن کو منہدم کر کے میحیت کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

اس دور ابتلا میں ارکان کلیسا نے جس جرأت و دانشمندی کا اظہار کیا ہے، حقیقت اُس کی نظیر آسان نہیں۔ یہ ہیں کسی گزشتہ فصل میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کس بے خوفی کے ساتھ مفتوحوں کو فاختوں کے غضب سے بچاتے تھے۔ اور کس ایثار و عالی ہمتی کو صرف کر کے قحط زدوں کی رفع تکالیف میں مشغول رہتے تھے، ایسے زمانہ میں جبکہ غلہ کی درآمد ملک میں مسدود ہو گئی تھی اور جبکہ بڑے بڑے وسیع و شاداب کھیت حملہ آوروں کو گھوڑوں کی ٹاپ سے پامال ہو رہے تھے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بربروں کا قبول میحیت ہے مگر افسوس ہے کہ تاریخ کا یہ صفحہ ہمارے لئے تقریباً بالکل سادہ ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ قوموں کی قویں اور قبائل کے قبائل ایسے ہیں جن کے قول دین کے اسباب ہیں مطلق نہیں معلوم ہیں۔ قوم گو تھ تو زوالِ روم سے پیشتر ہی مسیحی ہو چکی تھی۔ لیکن بڑا حصہ دنیا سے بربریت کا اُس وقت مسیحی ہوا جبکہ دنیوی حیثیت بربروں کا عین عروج تھا۔ ان ویشیوں کو جو اپنے وطن میں اپنے کلید برداران شریعت کی حلقہ پوشی کے عادی تھے جب ایک غیر ملک میں پہنچ کر ایسے اساطین مذہب سے سابقہ پڑا جو ان سے بدرجہا زاید تمدن و شایستگی تھے۔ ان کے پر شوکت مذہبی مراسم و ہیبت ناک عقاید شریعت و نشر سے ان کا متخیلہ خاص طور پر متاثر ہوا۔ قدیم تعلقات کو تو یہ خیر یاد کہہ ہی چکے تھے۔ اب انھوں نے تمدن کی عظمت کے آگے اپنی گردن خم کر دی۔ اور لاطینی زبان کے ساتھ لاطینی مذہب بھی ساری جماعت پر محیط ہو گیا۔ اور اس راہ دعوت و تبلیغ میں مسیحیت کے دو عقیدے اُس کے حق میں خصوصیت کے ساتھ مفید پڑے۔ ایک عقیدہ نجات مخصوص برائے مسیحیان، دوسرے وجود شیاطین۔ نجات مخصوص کے اعتقاد کی بنا پر مسیحیوں کے لئے قدیم معتقدات سے تائب ہونا لازم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی چونکہ وہ اپنے

قدیم مہودوں کے تصور کو ذہن سے یکسر خارج نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انھیں دوسرے مسئلہ یعنی وجود شیاطین سے یہ مدد ملی کہ اب وہ انھیں شیاطین کے درجہ پر رکھنے لگے۔ پھر اُس وقت کے داعیان مسیحیت میں علاوہ جوش خلوص و سرگرمی کے دانشمندی بھی انتہائی کی تھی۔ انھوں نے یہ تار لیا تھا کہ یہ بربری اپنے بادشاہوں اور بادشاہ بگمبوں کے دین کے مطابق ہمیشہ اپنا دین رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا اصل مرکز انھیں بنایا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ملکہ کلوٹلڈا، ملکہ پرتھا، و ملکہ تھیوڈولڈا کے قبول مسیحیت کے اثر سے اُن کے شوہروں اور پھر ساری قوم کے مسیحی بنالینے میں کیسی مدد ملی۔ ایک مرتبہ مسیحیوں نے یہ کیا کہ ایک نقاش کو کچھ نئے دلا کر اُس سے میدانِ حشر و جہنم کی ایک تصویر بنوائی جس میں منکرین بڑے عذاب جھیل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر منکرینِ قدما دہشتِ مہیست سخت متاثر ہوئے۔ اس طرح کی ترکیبیں اُس وقت کے داعیانِ مسیحیت اکثر کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سب سے زیادہ چلتا ہوا جادو ان کو یہ یاد تھا کہ ہر طرح کا دنیوی عیش و آرام، دولت و حکومت ایمان و مسیحیت کے ثمرات ہیں اور ہر طرح کی مصیبت، قحط، سیلاب و غیرہ بُت پرستی یا مصیبت پیدا ہوتی ہے۔ وحشیوں کے دماغ میں تحقیق و تنقید کی قوت کم ہوتی۔ وہ اس سے خصوصیت کے ساتھ متاثر ہوتے۔ اور جب وہ خوف و طمع دونوں کے اثر سے اس میں جوق جوق شریک ہونے لگے تو انھوں نے اپنے قدیم تہواروں اور میلوں کا نعم البدل مسیحی بزرگانِ دین کے سالانہ فاتحوں و یادگاروں کو پایا۔ علاوہ باضابطہ مبلغین کے دعوت و تبلیغ ایک ایسا فرض تھا جسے مسیحی اسیرانِ جنگ بھی ادا کرتے تھے اور جب ان مختلف ذرائع سے ایک بڑی رقم ادا فاتحین کی مسیحی ہو گئی تو شدید تعزیری قوانین نافذ کر کے مسیحیت کی مخالفت کا سد باب کر دیا گیا۔

غرض بالا تزان مختلف تدابیر و ذرائع سے مسیحیت کو فتح حاصل ہوئی لیکن یہ فتح جلد وسیع تھی اُس قدر قطعی و خالص نہ تھی۔ کیونکہ اب مسیحیت اکثر پش پش رہی تھی بلکہ بُت پرستی

سے کشمکش میں خود اس کی آمیزش اس میں بہت کچھ آگئی تھی۔ بتوں کے جگہ پر اب مسیحی شہداء و بزرگان دین کے نام زبان پر چڑھ گئے تھے۔ اور گواہی دے گئے تھے۔ لیکن صفات و خصوصیات سب جوں کے توں رہ چکے تھے۔ آئندہ کلیسا نے اس کے روک تھام کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی۔ بجز اس کے کہ وہ مختلف افسانوں اور قصوں کے ذریعے سے اس عقیدہ کو پھیلانے لگا۔ رہے کہ معبودان قدیم شیاطین کی صورت میں اب بھی زندہ ہیں اور لوگوں کو ورغلا کر راہِ حق سے منحرف کرایا کرتے ہیں۔ مثلاً چھٹی صدی کے ایک مشہور پاپا روم یہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک یہودی تناسف کر رہا تھا۔ راستہ میں رات ہو گئی۔ سامنے اپولو کا ایک دیوان مندر تھا۔ اُس میں وہ شب بسر کرنے کے ارادہ سے گیا۔ مگر اُس کے اندر پہنچا اُس پر سخت دہشت طاری ہوئی۔ اُس نے شیاطین کے گزند سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے جسم پر انگلیوں سے صلیب کی صورت بنائی۔ اس کے اثر سے وہ شیاطین کے گزند سے محفوظ رہا۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ آدھی رات کو اپولو اپنا دربار کر رہا تھا۔ اور بڑے بڑے ہیبت ناک شیاطین اپنے یہ پُر فرکار نامہ بیان کر رہے ہیں کہ ہم اس طرح مسیحیوں کو ورغلا یا کرتے ہیں۔ یا اس طرح آئرلینڈ کا ایک مشنری سینٹ گال ایک بار رات کے وقت مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ جھیل کے قریب ہی اُس نے خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی کہ اُسے اس ستارے میں عجیب و غریب روتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں پانی کے دیوتا اور پہاڑوں کے دیوتا کی تھیں، جو اس باب میں مشورہ کر رہے تھے کہ سنئے دشمن (مسیحیت) کو کیونکر شکست دینا چاہیے۔

فصل (۱۱)

خانقاہِ ہیبت

مغرب میں خانقاہوں کی اشاعت کے مسئلہ پر متعدد مؤرخوں نے لکھا ہے۔ اور یہ مسئلہ

اب کچھ ایسا دشوار و فاضل نہیں رہا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ جو اسباب عام رہبانیت کی اشاعت کے باعث ہوئے۔ ایک بڑی تعداد ان میں کی اب بھی موثر رہی اور پھر ایک سبب مزید یہ ہوا کہ بربروں کے متعدد حملوں سے ملک میں جو عام انتشار و بد نظمی پھیل چکی تھی اُس کے لحاظ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کوئی ایک مرکز تو کم از کم ایسا ہو جہاں امن و سکون نصیب ہو سکے اور خانقاہیں اس ضرورت کو بہ احسن وجوہ پورا کرتی تھیں۔ یہ درحقیقت ایسی چیز تھیں جن کی طرف خواص و عوام دونوں کو یکساں کشش ہوتی تھی۔ خوش اعتقادوں کے لئے خانقاہ میں داخل ہونا جنت میں داخلہ کی ضمانت تھا۔ اہل کرم و متقی اس میں اس لئے داخل ہوتے تھے کہ مختلف تبلیغی و کریمانہ فرایض کی انجام دہی کا موقع ملے گا۔ جاہل و پست کے لئے یہ ترغیب تھی کہ بڑے بڑے عمدہ ملیں گے جو ممکن ہے کہ پایائیت پر ختم ہوں۔ کتاب کے کیڑوں کو یہ طمع تھی کہ سکون کے ساتھ مطالعہ و کتب بینی کا وقت ملے گا۔ اپاہجوں اور کاہلوں کو یہ کشش تھی کہ ہاتھ پیر نہ ہلانا پڑے گا۔ غرض یہ کہ ہر طبقہ و ہر مزاج کے لوگوں کو اس میں شرکت کے لئے کافی محرکات موجود تھے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ خواہ اس میں کتنے ہی کثرت سے لوگ شریک ہوں، معاش کی طرف سے کبھی تنگی نہیں ہونے کی۔ امر او اہل ثروت جب تک زندہ ہیں ہمیشہ حصول ثواب و نجات کے لئے اپنی جائیدادیں وقف کرنے جائیں گے اور راہب صاحبان ٹیکس وغیرہ سے مستثنیٰ رہ کر ان جائیدادوں کا پورا انتظام کرتے رہیں گے پھر معاش کی طرف بے اطمینانی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؛ بلکہ ایک شورش و بد نظمی کے زمانہ میں میں اہم مرکز سکون ہونے کی حیثیت تمدن، زراعت و کاروبار کا بھی مرکز ابھی خانقاہیں رہ گئی تھیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ خانقاہیں کے یہ مفید اثرات دیرپا نہیں ہو سکتے تھے۔ ابتدائی جوش و غلہ کے گزر جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ بڑی بڑی جماعتیں مجتہد اور جائیدادوں کی مالک غیر مسئول رہ کر پاکباز رہ سکیں چنانچہ یہی ہوا کہ چند روزیں بد چلنی کا بازار خوب گرم ہو گیا

اسی طرح جب جنگِ جدال کی بد نظمیاں موقوف ہو گئیں اور ملک کے سارے کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔ تو خانقاہوں کے وجود سے جو تمدنی منافع تھے یعنی اُن کا زراعتی و کاروباری مرکز ہونا، ان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اب صورتِ حالات کے بدل جانے سے خانقاہیت کی بعض تعلیمات راہِ ترقی میں حائل ہونے لگیں۔ مثلاً اس کی یہ تعلیم کہ فقر و افلاس موجب تقدیس و احترام ہے۔ صریحاً ترقی تمدن کے منافی تھی۔

مگر ایک شے خانقاہیت کی پیدا کردہ ایسی تھی جو گویا جزوِ سرشت ہو گئی اور جو صورتِ حالات خارجی کے بدلنے کے ساتھ بدلنے والی نہ تھی۔ اس سے ہماری مراد خوئے فروتنی و انکسار سے ہے۔ راہبوں میں اور سب صفات تو موجود ہوتی تھیں لیکن انانیت و خودی اکثر پیدا ہو جاتی تھی اور کیوں نہ پیدا ہوتی؟ وہ کسی کے نوکر چا کر نہ تھے۔ کسی کے پاس غرض لے کر نہیں جاتے تھے۔ صد ہزار ہا اہل غرض ان کے پاس البتہ آیا کرتے تھے۔ غرض انانیت و خودی راہبوں کا ایک عام شیوہ ہو چلا تھا کہ مغرب کی خانقاہیت نے اس خطرہ کو مٹا دیا۔ یہاں کی باضابطہ و مرتب خانقاہانہ زندگی کی شرطِ اولین یہ تھی کہ اطاعت و انکسار ہو۔ اطاعت کے فوائد سے قدیم تمدن بیگانہ نہ تھے۔ تاہم زوالِ رومہ کے وقت اور دیشیوں کی ہنگامہ آرائیوں کے درمیان یہ جو ہر گویا دنیا سے ناپید ہو گیا تھا۔ مسیحیت نے آکر پھر اُعادہ معدوم کیا۔ اسی لئے دنیا نے بھی بڑھ کر اس کا خصوصیتِ خیرِ مقدم کیا۔ اور گر جہاں اس تعلیم کی تقلید دیگر حلقوں میں بھی ہو نہ لگی اور اطاعت کا جو ہر تو خیر دنیا میں پیشتر سے موجود تھا۔ لیکن انکسار، فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے اور اس تعلیم پر جس پابندی کے ساتھ خانقاہوں میں عملد آد ہوتا تھا اور کہیں نہیں ہوتا تھا۔ و حقیقت خانقاہانہ زندگی کا نظام ہی اس ترتیب کا واقع ہوا تھا کہ غور و پندار کا شائبہ تک نہ رہنے پائے اور اس کی جگہ تواضع و تذلل لے لے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسانِ رحیم، خلیق و فیاض طبع ہوا اور منکسر و متواضع مطلق نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انسان میں انکسار و تواضع ہو مگر رحم، خلق و فیاضی نہ ہو۔ اس بنا پر اس جذبہ کو اُم الفضائل کہنا

چاہیئے۔ اور یہی خیال کر کے میسجٹ اس پر اتنا زور دیا۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ تو بہر حال دیکھنے میں آیا کہ خانگی و معاشری زندگی سے قطع تعلق کر کے خائفانہوں میں نظر بند ہو کر رہنے سے جو شقاوت، اقص و سنگدلی، راہبوں کے دل میں پیدا ہو جانی چاہیئے وہ نہیں پیدا ہونے پائی۔ لیکن یہ صنف بھی گو ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا، تاہم تمدن کی زورافزدن رفتار کا آخٹیک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی تمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خود داری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خائفانہ طرز زندگی کا مثل فوجی طرز زندگی کے اقتضایہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خود داری موجود ہوتی ہے۔ لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خائفانہ زندگی کا مطمح نظر تھا۔ کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور پھر بڑے بڑے ناہروں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماء اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں۔ ایک مذہبی و دوسرے خود داری۔ انھیں پر زور دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ پرنسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی آزاد خیالی، خوش معاہلی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ کھوٹا کھلا قوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے بجائے بیاں دناؤ، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی و گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر بحیرہ خالی ہیں۔

فصل (۱۲)

خائفانہیت کا تعلق فضائل عقلی کے ساتھ

یہ فضائل عقلی کیا ہیں؟ فضائل اخلاقی کا مفہوم تو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن یہ فضائل عقلی

کیا معنی ہے اس سے ہماری مُراد یقین و اعتقاد کی دیانت داری اور ضمیر کی آزادی سے ہے۔ ذہن کو ہر قسم کے قیود و جذبات شدید کی گرفت سے آزاد رکھنا راہ صداقت پر بلانا خیال نتائج علمی قائم رہنا اور مقدمات کی شہادت جن نتائج پر پہنچائے انھیں کو اختیار کرنا خواہ اس کو کسی جذبہ کو کتنا ہی صدمہ پہنچے، یہ سب فضیلت عقلی کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس کو اختیار کرنا دنیا کے دشوار ترین کاموں میں سے ہے اور اگر کوئی مذہب یا اصول اخلاق ضمیر کی آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے یا بعض جذبات کی پاس داری کے خیال سے عقل و شہادت کی قوت کو محو و ذکرنا چاہتا ہے تو وہ یقیناً فضیلت عقلی کا ہادم ہے۔

قدما کے ان قوانین استقرا اگرچہ اس قدر مضبوط نہ تھے تاہم آزادی ضمیر کا پورا احترام تھا۔ بے شبہ ان کے اعلیٰ حکومت کی طرف سے بعض قوانین اس قسم کے ناعدتھے کہ فلاں فلاں کام مذہبی کی پابندی لازمی ہے یا بعض ایسے نظامات فلسفہ کی جو صریحاً اخلاق شکنی کی طرف لیجا تھے اشاعت بھی حکماً بند کر دی گئی تھی۔ تاہم اس طرح کی مثالیں صرف بطور مستثنیات کے ملتی ہیں ورنہ عموماً آزادی رائے کی حرمت سب کو مسلم تھی۔ رائے کی غلطی کسی کے نزدیک معصیت نہ تھی، بلکہ جو لوگ بحال جرات و بے خوفی، علمی مسائل کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے، اکثر وہی سب سے زیادہ معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ اور بت پرستانہ مذہب خواہ اور کہتے ہی معاصبات مجموعہ ہو۔ تاہم اس میں یہ تین صفات تو اعلیٰ درجہ کی موجود تھیں تخیل، وطنیت، و رواداری۔ یہ عقیدہ کہ اس نظام کا نیاں کی کبھی دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہے، جو انسان سے بدرجہا قوی مگر یہ لحاظ نوعیت اس کے بالکل مشابہ ہیں تخیل کو کتنا متاثر کرنے والا تھا! اسی طرح مذہب کی بنیاد قومیت پر رکھنا اور مذہبی مراسم کو ملی فراہیں سے بالکل مخلو کر دینا یقیناً جذبہ وطنیت کو مستحکم کر دینا تھا۔ یا پھر اسی طرح یہ مسئلہ کہ مختلف اقوام کے دیوتا ہیں جو مختلف طرق عبادت سے خوش ہوتے ہیں، رواداری کا سنگ بنیاد تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ رومہ میں جو مختلف ادیان کی بجائے خود ایک نمائش گاہ بن گیا تھا۔ حریت فکری اپنے منہا کی شباب پر تھی، ہر شخص اپنے

ضمیرِ رائے کا مختار تھا۔ صدمہ ہا قلم کے مختلف معتقدات و خیالات شائع تھے۔ اور مشککہ نہ تحقیق و تنقید کو عیب نہیں۔ بلکہ ایک خاص وصف سمجھا جاتا تھا۔

یہ حال قدما کا تھا۔ لیکن ہمیں گزشتہ صفحات میں معلوم ہو چکا ہے کہ کلیسا کی وسعت اقتدار کا ایک خاص سبب اس کا غیر مسئولانہ اوم تھا اور زود اعتقادیوں کے دُور میں اس کا بڑا کامنامہ یہ تھا کہ وہ اپنے منبیین سے اپنے احکام کی بیچون و چر تمیل کراتا تھا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ احکام شریعت پر کو رائہ عملد رائہ کا رواج عام ہو گیا اور شک و اعتراض ایک جرم قرار پا گیا اسی سلسلہ میں ہم اس مغالطہ کو بھی کھولے دیتے ہیں جو رائے کی غلطی کو اخلاقی جرم قرار دینے کا باعث ہوا۔ عقلی حیثیت سے دیکھئے تو کسی رائے یا عقیدہ کو اخلاقی جرم قرار دینا سرے سے ناممکن ہے۔ ہم نے مانا کہ کوئی شخص مہل سے مہل عقاید کا قایل ہے۔ کوئی شخص مثلاً یہ کہتا ہے کہ بز و کل سے بڑا ہوتا ہے یا ایک خط مستقیم سے دائرہ بن سکتا ہے تو یہ عقاید خواہ کتنے ہی مہل و مضحک ہوں لیکن اخلاقی معصیت ان میں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے؟ کسی عقیدہ کو بجائے خود معصیت قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ آواز کو رنگین قرار دیا جائے۔ یہ بے شبہ ممکن ہے کہ کسی رائے یا عقیدہ کے عملی نتائج اخلاق شکن ہوں، لیکن اس سے نفس اس رائے یا عقیدہ کو تو بھرا مائے نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک عام کلیہ ہے۔ مگر دو صورتیں ہمارے نزدیک ایسی ہیں جو جادہ اخلاق کی خلاف ورزی و غلطی رائے کی طرف منجر ہوتی ہیں:-

(۱) اول یہ کہ غلط رائے عموماً ضمیر کی بددیانتی سے پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں اس طرح کے منافقین بہت کم ہوتے ہیں جو دیدہ و دانستہ ایک رائے کو غلط سمجھ کر پھر بھی اسے صحیح ظاہر کرتے رہیں لیکن اس طرح کے منافقین عیش و عشرت اور ہر جگہ بہت کثرت سے موجود رہتے ہیں جو تحقیق و تلاش کی محنت و تکلیف سے جی چڑھتے ہیں جو کاہلی و آرام طلبی کے باعث اپنے سابقہ تخیلات و معتقدات پر قانع رہا کرتے ہیں اور اپنے مخالف واقعات و شواہد سے بالکل چشم پوشی کئے رہتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں ان کے جذبات پارینہ کو صدمہ نہ پہنچے۔

(۴) دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی سیرت و افتاد طبعیت کا اس کے خیالات و معتقدات پر بجد اثر پڑتا ہے۔ بلکہ اگر ہم کسی شخص کے مزاج و سیرت پر پوری واقفیت رکھتے ہوں تو یہ تقریباً وثوق کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ یہ فلاں مسئلہ میں فلاں رائے کا قائل ہو گا۔ جو لوگ قدرتِ عالی ہمت، عالی ظرف، شجاع و بلند حوصلہ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی مذہب یا مسلک فلسفہ کی تعلیمات کی تلاش میں رہتے ہیں جن سے ان کے ان جذبات کو ابھرنے کا موقع ملے۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کے مزاج میں سرد مہری، دناست، تنگ نظری و بزدلی ہوتی ہے وہ اپنے مذاق و مزاج کے موافق مذہب فلسفہ کی تلاش کرتے ہیں۔ اور یہ تو بہ کثرت دیکھنے میں آتا ہے کہ سیرت و مزاج کے بدلنے سے انسان نے اپنا مذہب و اخلاق بدل دیا ہے۔ نیز یہ کہ رائے و خیال کا تغیر تغیر سیرت کا باعث ہوا ہے۔ غرض یہ کہ اکثر صورتوں میں طینت کی خرابی رائے کی غلطی کا سبب ہوتی ہے۔

بہر حال ان دو صورتوں میں انسان کی طینت و سیرت کا اثر اس کے اخلاق و مذہب پر بہت کافی پڑتا ہے۔ ان میں سے پہلے نقص کی اصلاح کی کلیسا نے کبھی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں تک ممکن ہوا اس نے قوانین استقرا کے انضباط اور تشکیک و تنقید کا ہمیشہ سد باب کرنا چاہا۔ حالانکہ علمی ترقیوں کا سنگ بنیاد بھی تشکیک و اطمینان ہی ہے۔ لیکن اگر قدامت کے قائم کردہ اصول پر قلعہ اور لکیر کا فیتہ بنا رہتا تو آج سائنس کا کیا حال ہوتا؟ کینٹ و ہیوم اپنی تشکیک سے اگر فلسفی دنیا میں تملکہ نہ ڈال دیتے تو آج فلسفہ جدید کا کہیں بھی وجود ہوتا؟ دیکو والیٹر، نیوٹر، ویلوس اگر قدیم مؤرخین کے نتائج تحقیقات کی طرف سے غیر مطمئن نہ ہوتے تو آج تاریخی نتائج کے مواد میں کچھ بھی اضافہ ممکن تھا؟

البتہ شوقِ دوم کی طرف مہمیت پوری توجہ کی۔ اور رائے و خیال پر سیرت و طینت کی اہمیت اثر کا کلیسا کو ہمیشہ اعتراف رہا۔ اور درحقیقت یہی ایک شے تھی جس نے ایک بڑی حد تک اس کی تعلیمات میں تعصب و عدم رواداری کو جگہ دیدی۔ وہ اپنے اہل علم میں ایک

خاص قسم کی سیرت دیکھنا چاہتا تھا اور اس راز سے آشنا تھا کہ جب تک وہ سیرت قائم رہے انسان کے معتقدات بھی ایک خاص پنج پر رہیں گے۔ اس لئے اُس نے اس مخصوص سیرت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی اور تعصب ارکان کلیسا کے ہاتھ میں پڑ کر اس کوشش اصلاح نے تعصب و عدم رواداری کی شکل اختیار کر لی۔ چند مخصوص اعتقادی و تاریخی مسائل کو تحقیق فطری کے مرتبہ پر رکھ دیا گیا، جن پر بحث و شک کرنا دائرہ مسیحیت خارج ہو جاتا تھا۔

یہ تو تعلیمات تھیں۔ عمل یہ تھا کہ رواداری و مسالمت کا کہیں نام و نشان نہیں باقی رہتا۔ پاپا تھا۔ آج بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُس وقت (یعنی قسطنطین کے زمانہ) سے بجائے ملکی جوش قومیت و ملیت کے عام انسانی بہرہ دہی پھیل گئی تھی۔ لیکن یہ خیال قطعاً واقعات تاریخی شہادات کے مخالف ہے۔ زوال روم کے وقت اخوت انسانی کا جذبہ دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن مسیحیت نے اس کی جگہ محبت و الفت کی بنیاد تھام کر مذہبی پر رکھی۔ جو لوگ عیسائی نہیں وہ سب ملعون و جہنمی و قابلِ حذر ہیں۔ اول اول یہ خیال صرف عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کے تعلقات پر محدود رہا۔ اُس کے بعد رفتہ رفتہ عیسائیوں میں جو اسی۔ نوے سے فرقہ پیدا ہوئے خود ان میں سے ہر ایک اپنے طرز عمل میں دوسرے کے ساتھ اسی اصول پر عمل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک فرقہ کا ہر شخص دوسرے فرقہ کے اشخاص کے سایہ سے بھاگنے لگا۔ ان فرقہ بندیوں کی بنیاد اس طرح کے اختلاف مسائل پر ہوتی تھی کہ مثلاً ایک گروہ کہتا تھا کہ خدا اور مسیح متحد الٰہا ہیست ہیں۔ دوسرا کہتا کہ نہیں مشترک الٰہا ہیست ہیں۔ ان جزئی موثقیات سے جو اختلاف پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی بنا پر اس قدر سخت ہنگامہ آرائی ہوتی تھی کہ شہر میں سخت بلوہ ہوتے اور کثرت سے کشت و خون ہوتا۔ ایک موقع پر شہر قسطنطنیہ کے بلوہ میں ۳۰۰ آدمی کام لائے۔ ایک بادشاہ نے ایک مرتبہ ۸۰ پادریوں کو دریا میں غرق کر دیا۔ ایک مقتدر پادری نے ایک بار فریق مخالف کی بیواؤں پر تازیانہ لگوانے شروع کئے اور بن بایہوں کو برہنہ کر کے آگ پر کڑھاؤ پڑھا کر ان میں ڈال کر تل ڈالا۔ ایک مشہور عالم فلسفی خاتون پشیا

پراعتزال و بے دینی کی فرد جرم لگا کر اسے ایک گرجا میں قتل کیا گیا۔ اس کا پر منہ بہم نہ ہو سکا۔
 پر گھٹیا گیا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے آگ میں ڈال دیا گیا۔ کچھ لوگوں کو جب
 مصر پر فتح حاصل ہوئی تو کئی دن تک ملک قتل و غارت کا بہت بنا رہا۔ اسکندریہ پر تو علم
 و قسط ظہینہ بارہا مختلف مسیحی فرقوں کی دست درازیوں کا شکار ہوتے رہے خصوصاً قسطنطینہ
 پر تو سب سے زیادہ مصائب نازل رہے۔ تیسری صدی سے یہ ہوا چلی کہ مخالف جماعتوں کے
 طریق عبادت کو قانوناً روکا جائے یہاں تک کہ کچھ روز میں بالکل بے ضرر و مشرکانہ عبادتوں
 کو بھی روک دیا گیا اور مشرق کی بہت بہتر تعمیری صنایعیاں اور یونان کی بہتر سے بہتر نقاشیاں
 بحال بیدردی خاک میں ملا دی گئیں۔

ان مذہبی و قانونی کارروائیوں کے علاوہ جو لٹریچر اُس وقت شائع ہوتا تھا وہ اپنے
 لہجہ کی دشمنی کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ کی مناظرہ و کلام کی
 کتابیں اٹھا کر دیکھئے سخت کلامی و سبب شتم سے مملو ملیں گی۔ جن میں ہر فریق اپنے مخالفین کو
 شیاطین و ملامت کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ان کی موجودہ مصیبتوں کو خدائی تازیانہ سے تعبیر کرتا
 ہے اور بہ کمال خیانت نفسِ بھقی میں اُن کی تعذیب و عقوبت کے تصور سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا
 کرتا ہے۔ سینس، بیل وغیرہ دو چار مستثنیات کو چھوڑ دیکھئے جو قدما مشرکین کی جائز و ناجائز
 سے دریغ نہیں رکھتے تھے۔ باقی علی العموم اُن کے لئے گویا زبان میں کوئی کلمہ خیر تھا ہی نہیں
 جس وقت ہم اس لہجہ کا مقابلہ یونانیوں و رومیوں کے اُس لہجہ سے کرتے ہیں جو وہ اپنے
 مخالفین کے مقابلہ میں اختیار کرتے تھے تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں و رومیوں کے
 اخلاق کا پایہ کس قدر بلند اور اُن میں کیسی فراخ دلی تھی اور ان کے مقابلہ میں اُس وقت کے
 مسیحی گویا چھوڑے پن اور تنگ نظری کا نمونہ تھے۔

فصل (۱۳)

خانقاہیں بطور خزانہ علم کے

مغربی خانقاہوں نے جس زمانہ سے اپنے علمی و تعلیمی فرائض کو ادا کرنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کھٹولک ازم کا اقتدار تقریباً منسلک ہو چکا تھا اور جو شش منظرہ سرور پڑ چکا تھا تاہم کلیسا کے ذریعہ سے اشاعت و تحفظ علوم میں جتنی کوششیں ہوئیں سب خانقاہی کے اثر سے ہوئیں۔ آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ اگر کھٹولک ازم کا وجود نہ ہوتا تو اب تک علمی زندگی کس اسلوب پر قائم رہی ہوتی لیکن ایک واقعہ یہ کہ کھٹولک ازم کے زیر اثر خانقاہوں ہی نے علم کی مشعل کو روشن رکھا۔ دو چار سال تک نہیں صدیوں تک علوم کی تاریخ بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں البتہ تاریخ اخلاق کی ضمن میں ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ خانقاہیں اپنے ان فرائض کو کیونکر ادا کرکے اب تک انجام دیتی رہیں۔

سب سے پہلا سوال اس بحث میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ گرجا نے علوم قدیم کی محافظت کہاں کی؟ یہ تو ہم پیشتر کہہ ہی آئے ہیں کہ اس باب میں جو کلیسا کے اندر مختلف خیالات تھے ایک گروہ جس کا سردار رٹولین تھا مشرکین کی تصانیف کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا اور گروہ جس کے مشاہیر ارکان جیٹن ماریٹر کلیمنٹ آف الگرنڈریا و آریجن تھے۔ اس کے بالکل برخلاف ان کے ساتھ کمال عقیدت و شفیقتی رکھتا تھا۔ بلکہ انھیں محرف مخ شدہ الہامی کتابیں قرار دیتا تھا۔ ایک اور گروہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ اس کا سرگروہ سینٹ آگسٹائن تھا جو یہ اعتراف کرتا تھا کہ معصیت اجتناب کا خیال اسے اول اول سرور کی ایک تحریر سے پیدا ہوا۔ جولین نے قدما کی تصانیف کی تعلیم روکنا چاہی لیکن اس کی جس قدر پُرجوش مخالفت ہوئی اُس نے صاف ثابت کر دیا کہ اُس وقت کے مقتدیانِ مسیحیت انھیں کتنا عزیز رکھتے تھے

پھر فلاطینیت جدید کی اشاعت، ہزار ہا آدمی کا برائے نام اصطلاح اور کچھ اس جوش و خروش میں کمی ہو، فراع البالی و خوش حالی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان سب چیزوں نے مل کر اور اس کی تائید کی بلکہ سانیس نے تو پادری ہو کر یہ غضب کیا کہ اپنے تئیں نہ صرف ایک مشرک فاضل ہادیشیا کا متفقہ ظاہر کیا بلکہ ملکہ روح میں بالکل فلاطون کا ہم آہنگ ہو گیا اگر کہیں یہ مقتدیان کلیسا کی آزاد خیالی عام ہو گئی تھی تو مسیحیت کی زرقار کا رخ بالکل ملت گیا ہوتا لیکن ایسا ہونا مقدسین نہ تھا۔ نجات مخصوص کا عقیدہ رومی علماء، شریعت کا جو فلسفہ الطبع یونان سے روم کی مذہبی و سیاسی بے تعلقی، بربروں کا حملہ اور ان کا قبول مسیحیت وغیرہ متعدد و پیچیدہ واقعات نے کھولے۔ کھولے عقاید کو بالآخر غالب کر دیا۔ اس وقت سے حریت فکری کا خاتمہ ہو گیا اور بحر چھٹی صدی کی ایک آدھ ہشتائی مثال کو اب علم ادب تمام تر عبارت رہ گیا موانعوں سوانح شہداء سے۔ دور دراز ملکوں میں کچھ حصہ تک آثار حیات قائم رہے۔ مثلاً سیریل میں ایک اسکول ساتویں صدی میں موجود تھا اور آئرلینڈ کی خانقاہوں میں شاید اس کے بھی چند سال بعد تک علم کے پرچے رہے ورنہ عام حالات کے لحاظ سے تو اب سائے یورپ پر علمی موت طاری تھی اور یہ جو برابر قائم رہا تا آج کل اسلارڈ کی عقلیت و محاربات صلیبی نے اس قالب مردہ میں از سر نو روح پھونکی۔ اس ساری مدت میں کھتولک نرم کا بڑا کا نامہ یہ ہے کہ لاطینی زبان کو اس نے ایک مقدس زبان کی طرح زندہ رکھا۔ یونانی زبان تو گویا مردہ ہو چکی تھی حالانکہ یونان سے آمد و رفت کے تعلقات کبھی منقطع نہ ہو سکے۔ اور لاطینی زبان جو زندہ تھی اس کی یہ حالت تھی کہ اس کی تحصیل قطعاً ممنوع تھی اس زبان کے قدیم مصنفین جہنم کے گندے سمجھے جاتے تھے اور قرب قیامت کے خوف سے کسی کو دنیوی علوم کی طرف توجہ کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ راہبین و زاہدین مثلاً میر مصنفین روم مثلاً ورجل، ہو ریں وغیرہ کا ذکر انتہائی اہانت و تحقیر سے کرتے تھے۔

خانقاہیں اس زمانہ میں کتب خانوں کا کام ضرور دیتی تھیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا

ہمارے نزدیک صحیح نہیں کہ اگر خانقاہیں نہ ہوتیں تو کیں کتب خانہ قائم ہی نہ ہوتے اور اگر
آخر میں کوئی یہ جتانے کہ رامیں کس محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کتابوں کی
نقلیں کر کے سرایہ علوم کو محفوظ رکھتے تھے تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس دیدہ ریزی
کے ساتھ قدیم نسخہ سیسے حروف کو مٹا کر اپنی مزخرف داستانیں اُن پر تحریر کرتے تھے۔

البتہ ایک بات ضرور جس میں دُور خانقاہیت کے مصنفوں کو موجودہ مصنفین پر
فضیلت حاصل تھی اور وہ وہ سکون، الطینان خاطر، ویکسوئی تھی جو آج کل کے مصنفوں کو
تو اب میں بھی نہیں نصیب آج کل ہر وقت جو یہ تکریم، ہجوم کئے رہتی ہیں کہ کتاب کیونکر
طبع ہو؟ کیسے شائع ہوگی؟ لوگوں میں مقبول ہوگی؟ اس سے شہرت و ناموری میں اضافہ
ہوگا؟ کوئی اس کا جواب یار دو توتہ کھے گا؟ اُس دور کا مصنف ان افکار پریشانیوں سے
بری رہتا تھا۔ اُس کی اُمیدیں و توقعات تمام تر عقیقی کے اجر و نفع سے وابستہ رہتی تھیں۔
اُسے دنیوی مقبولیت و ناموری کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟ پھر بعض دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ علم و
ادب کو مذہب کی طرف سے تحریک ہوتی تھی مثلاً مشورائیکلو سیکسن شاعر کیدمن کی بہت
منقول ہو کر ابتداء اُس سے کس طرح انظم نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز خواب میں
اُسے بشارت ہوئی کہ ”اے ادرجہ باری میں کلام موزوں کر“ اُس وقت وہ شعر کہنے لگا اور بہترین
شاعر اپنے مالک کا ہو گیا۔ یا ایک مرتبہ ایک بدشوق لڑکا والدین و استاد کی سخت گیرلوں
سے تنگ آکر گھر سے نکل گیا۔ راستہ میں ضعف ماندگی سو نہ حال ہو کر ایک کنوئیں کے سامنے
بیٹھ گیا جس پر ایک لڑکی پانی بھر رہی تھی۔ اتنے میں اُس کی نظر کنوئیں کی جگت پر پڑی جو ایک
جگہ سے گھس گئی تھی اس نے لڑکی سے اس کا سبب پوچھا اُس نے جواب دیا کہ روز ریتی
کی رگڑ لگتے لگتے یہ اتنی گھس گئی۔ لڑکے کو اس القائے ربانی پر معاً تنبیہ ہوا اور اس نے
اپنے دل میں کہا کہ جب پتھر کی سل رگڑ کھاتے کھاتے گھس جاتی ہے تو میں تو انسان ہوں
میں کیوں نہیں متواتر کوشش سے تحصیل علم کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ گھر واپس آیا اور اتنی رضیت

کہ موت کے وقت وہی بدشوق لڑکا اسپین کا مشورینٹ الیڈور کہلایا۔ ایک راہب صاحب
جنھوں نے اپنی زندگی بدکاری میں بسر کی تھی جہنم میں جھونکے جا رہے تھے، مگر محض اس بنا پر
بچ گئے کہ ان کے گناہوں کا شمار ان حروف سے نہیں بڑھنے پایا جن کی انھوں نے ایک
نہ ہی تصنیف میں کتابت کی تھی، اسی طرح ایک اور راہب کی قبر جب ۲۰ سال کے بعد کھول کر
دیکھی گئی تو پایا گیا کہ اور سارا جسم سرگل گیا ہے۔ لیکن ہاتھ جس میں وہ قلم لیتا تھا بدستور اپنی
حالت پر ہے۔ یا پھر ایک مرتبہ ایک مُصنّف کے انتقال کے روزرات کے وقت پڑوس کے
خاندانہ کی ایک لڑبہ کی آنکھ دفعۃً ایک تیز روشنی سے کھل گئی۔ وہ سمجھی کہ دن نکل آیا، مگر اٹھی تو
معلوم ہوا کہ ابھی رات ہے۔ مگر سامنے ایک نور مجسم خاتون بیٹھی ہیں جن کے چہرہ کی ضیاء سے اُس
مُصنّف کی قبر منور ہے۔ اتنے میں قبر کے اندر سے ایک سفید براق قمری نگلی جسے اُس خاتون
نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خاتون خود جناب مریم تھیں جو اُس مُصنّف کی
روح کی تقدیس کے لئے آئی تھیں کیونکہ جو مُصنّف و عالم اپنی زندگی صبر و تقویٰ کے ساتھ گزارا
ہوئے درجہ شہادت نصیب ہوتا ہے۔

لیکن ان افسانوں کی خوشنمائی و دلچسپی ہیں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتی کہ
کتھولک عروج کا زمانہ بحیثیت مجموعی تاریخ کے تاریک ترین زمانوں میں ہوا ہے۔ اس وقت دنیا
سے مسیحیت کی تمام قومیں علوم عالیہ و فنونِ نافعہ سے قطعاً بیگانہ اور فقیانہ موشگافیوں کی طرف
یکسر متوجہ تھیں جو شخص کسی واقعہ طبعی، فلسفی، مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتا اُس پر سحر، الحاد، یا سیدی کا
الزام لگا کر اُسے خاموش کر دیا جاتا اور سب سے بڑھ کر کیے تھے تنقید کے ہر طریقہ پر مسیحیت بھل
مہر لگا دی تھی۔ کسی مسئلہ میں شک کرنا موافق و مخالف دونوں دلائل کو سُن کر سُنے کا یہ کسی
حقیقہ کے لئے دلیل طلب کرنا کسی مسئلہ پر خالی الذہن ہو کر غور کرنا یہ سب ممنوع قرار پا گیا
تھا۔ اب اگر کوئی غلط واقعہ انسان کے ذہن نشین ہو گیا ہو اس کی تصحیح آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اگر
کسی غلط اصول استدلال کا رواج پڑ گیا ہو اس کی بھی اصلاح ممکن ہے۔ گو بہ وقت، لیکن جب

سرے سے تحقیق و تنقید، غور و فکر ہی کو حرام بلکہ کفر قرار دے دیا گیا تو اس کا علاج کس کو بس میں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہالت، توہمات، ضعیف الاعتقادیوں کی گھٹالیورپ پر صد ہا برس تک چھائی رہی۔ تا آنکہ جب سرشتہ تعلیم کی باگ خالقانہوں کے بجائے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں آچکی مسلمان سائنس کی اشاعت کر چکے۔ قدام، یونان و رومہ کی تصانیف علمی بیداری پھیلانے لگیں اور اس سرے سے اس سرے تک تجارتی و کاروباری آزادی پھیل چکی، تب کہیں جا کر یہ ظلمت دور ہوئی۔

میں خوب جانتا ہوں کہ میراقرون وسطیٰ کی ذہنی زندگی کی اس قدر بدنام تصویر پریش کرنا بہت سے لوگوں کے ممال کا باعث ہوگا۔ اس وقت متعدد جماعتیں ایسی موجود ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر قرون وسطیٰ کی حمایت پر آمادہ ہیں مثلاً کچھ لوگ اس زمانہ کی خوش اعتقادیوں کی بنا پر کچھ آثار قدیمہ کے سہارے پر کچھ اس غلط تاریخی کلیتہ کی بنا پر کہ ترقی کے بعد تنزل محال ہے اوپر کچھ لوگ کھٹولک ازم کے استبداد سے خوش نظمی کی بنا پر عرض کسی نہ کسی تاریخی غلط فہمی کی بنیاد پر متعدد جماعتیں ایسا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کی بیوج و ستائش ہمیشہ مغالطات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ذیل میں ہم اس قسم کے چند عامۃ الورد و مغالطات کو صاف کئے دیتے ہیں:-

(۱) پہلا مغالطہ یہ ہے کہ چونکہ ایک مدت دراز تک یورپ کی علمی زندگی خالقانہوں میں محدود رہی لہذا اگر خالقانہوں کا وجود نہ ہوتا تو آج علوم کا بھی پتہ نہ ہوتا، ہمارے نزدیک اس استدلال کا مقدمہ اگرچہ بالکل صحیح ہے تاہم نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ یہ بے شبہ صحیح ہے کہ ایک مدت تک خالقانہوں نے تحفظ علوم میں بڑا کام کیا، لیکن مشرکوں کے زمانہ میں علوم کی اشاعت بہت دور دراز ممالک میں ہو چکی تھی مصر و ایشیائے کوچک گویا مرکز تمدن تھے۔ یونان سے بھی علم رخصت نہیں ہوا تھا۔ اسپین، کال، و برطانیہ میں معلمین و کتب خانوں کی افراط تھی نارویں آریں، بورڈر، ٹولو، لبلانس، ارسیلہ، یوایتز، وٹریوس کے مدارس کی خاص طور پر شہرت تھی۔ سولہویں صدی میں مسیحی فرماں روا اگرکین نے کال میں وہی قانون جاری کیا جو انٹونیس کے وقت میں

اٹنی میں ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ ہر بڑے شہر میں حکومت کی طرف سے معلمین کو وظائف ملتے رہیں پس
 لاطینی لٹریچر کی اس قدر وسیع اشاعت کے بعد کون ذی عقل اسے تسلیم کر سکتا ہے کہ سخیہ سخت
 حالات مخالف بھی اسے دنیا سے فکار سکتے تھے؟ اگر کھتولک ازمنہ کٹھڑی کھڑی ہوتی تو کوئی
 دوسرا طریقہ تحفظ علوم کا کل آتا۔ پھر خدمت علم کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تحفظ و بقائے علوم
 دوسرے اضافہ علوم۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے دوسرا طریقہ بدرجہا بلند و ممتاز ہے۔ لیکن رابن
 خاقانہ نے زیادہ سے زیادہ صرف پہلی صورت پر قناعت کی اور دوسرے طریقہ کو ہاتھ
 لگانا ہمیشہ گناہ سمجھتے رہے۔ قدامت کے ذخائر و خزائن کو محفوظ رکھنے کی جو کوشش انھوں نے
 کیں بے شبہ ہم ان کے لئے ان کے بہت ممنوں ہیں۔ لیکن یہ بہت مشتبہ ہے کہ ان کی یہ خدمت
 کبھی ان کے ان معاصی کا کفارہ کر سکتی ہے کہ انھوں نے حریت فکری کا خاتمہ کر دیا غور و
 فکر کا سد باب کر دیا اور تحقیق و تنقید کو ممنوع قرار دیدیا۔

(۲) اسی منظر کا کسی قدر مختلف پیرایہ میں یوں بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ صدیوں تک
 جتنے علماء پیدا ہوئے رہے وہ سب کے سب فقہاء و مقتدایان شریعت ہی تھے۔ پس اگر انھوں نے
 ادھر توجہ نہ کی ہوتی تو دنیا سے علم کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہوتا۔ اس طرز استدلال پر ہمیں
 ایک قصہ یاد آتا ہے جو سروسے نقل کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک قیدی اپنے ابتداء میں سے
 ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے اندر نظر بند رکھا گیا تھا جس کے دیوار میں ایک شگاف تھا
 اور صرف وہی رستہ روشنی کا تھا۔ ایک مدت کی نظر بندی کے بعد قیدی کو یقین ہو گیا کہ اگر یہ
 دیوار گر جائے گی تو یہ شگاف بھی نہ رہے گا۔ اور اس لئے اتنی روشنی بھی بند ہو جائے گی۔
 آپ کہتے ہیں کہ جو کچھ علمی روشنی تھی وہ ان فتنہ کے دم سے تھی۔ میں کہتا ہوں کہ یہی ظالم تو
 علمی روشنی کے سد راہ تھے۔ انھوں نے اگر اپنے متبعین کے قوائے عقلی کو معطل نہ کر دیا ہوتا
 تو دنیا معلوم نہیں آج کمال سے کہاں ہوتی۔ یہیں اس سے انکار نہیں کہ اس جماعت نے بعض
 نہایت مفید علمی خدمات انجام دیں سینٹ ٹامس الونیاس سینٹ مینڈیکٹ کے علم فضل

و کمال تجربہ سے کس کی مجال انکار ہو سکتی ہے؛ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ اس جماعت نے کیا کیا؟ بلکہ یہ ہے کہ یہ جتنا کر سکتی تھی اُس میں سے کس قدر کیا۔ جس قدر غیر محدود مواقع اسے حاصل تھے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کتنا کام کیا؟ دس بیس برس نہیں صدیوں تک یہ حالت رہی کہ جس شخص کو ذرا بھی علمی مذاق سے مَس ہوتا تھا وہ راہب بن جاتا تھا۔ یہ راہب روم کی زبان سے واقف ہوتے تھے اور آسانی اس کے اعلیٰ علوم سے واقفیت حاصل کرتے اور پھر ان راہبوں کو ہر طرح پر کیسوی، اطمینان و فراغ البالی حاصل رہتی تھی۔ ان سب حالات مساعد کو پیش نظر رکھ کر اس کا خیال کیجئے کہ انہوں نے جو علمی خدمات انجام دیں اُن کا کیا وزن اور کیا مرتبہ ہے، جب البتہ اس بحث کا صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے۔ پھر سب بڑھ کر یہ کہ جو زمانہ کٹھک علم پرستی کے شباب کا کسا جاتا ہے اُس میں بھی تحقیقات جتنے وسیع و اہم علمی کارنامہ ہوئے اُن کا فخر مقتدایان شریعت کو نہیں بلکہ اُن افراد و جماعات کو حاصل ہے جنہیں اس حلقہ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مشور عالم طبیعات راجر بیکن نے کو راہب تھا۔ لیکن واقعہ اُس نے جو کچھ کام کیا وہ سب راہبانہ قواعد و احکام کے بالکل علی الرغم کیا۔ بالآخر وہ اسی جرم میں قید کر دیا گیا اور ۱۴ سال کی اسیری کے بعد جب مراد تو اس کا نام ساحروں کے طبقہ میں لیا جاتا تھا۔ عمل و تجربہ کا ہیں جو کچھ بھی تھیں وہ یا تو کیمیا سازی کی تماشا گاہ ہیں یحقیں اور یا مسلمانوں کی قائم کردہ تھیں، قطب نما، بارود، و کاغذ کی ایجادیں اُسی زمانہ میں ہوئی ہیں۔ لیکن کیا ان میں سے ایک شے بھی راہبوں اور خانقاہ نشینوں کی کوششوں کی شرمندہ احسان ہو؟ ہرگز نہیں قطب نما کی ایجاد کی تو پوری تحقیق نہیں۔ لیکن آخر الذکر دو چیزوں کو تو قطعاً مسلمان اپنے ہمراہ یورپ میں لائے۔ اور رومی کے کاغذ کارولج تو مسلمانوں میں مسلمانہ و شریع ہو گیا تھا۔ حالانکہ مسیحی اس سے تیرھویں صدی کے آخر تک ناواقف رہے۔ عیسائیوں نے سب سے پہلے تو پانچا نہ کا استعمال جنگ کریمسی میں کیا۔ اور بارود سے اول بار ۱۳۳۱ء میں واقف ہوئے۔ لیکن مسلمان اس سے گیارھویں صدی ہی کے آخر میں واقف ہو گئے تھے

خلاصہ یہ کہ اختراع و ایجاد، اکتشاف و اجتہاد سے قرون وسطیٰ کے مسیحی فضلا ہمیشہ بیگانہ رہے اور تحقیق و تنقید کے شوق کو پیدا کرنا کیسا ہمیشہ اسے دباتے ہی رہے۔

(۴۴) ایک غلط فہمی کا اظہار ان الفاظ میں کیا جاتا ہے کہ کھتولک ازم اگرچہ ترقی تمدن جتن کی زیادہ معین نہیں بلکہ ایک حد تک اس راہ میں باج ہے تاہم ایک زمانہ میں یہ بہت مفید رہی ہے اور جس وقت تک تمدن اس طرح پر نہیں پہنچا تھا وہ بہت کارآمد شے رہی ہے۔ مجھے اس دعوے کی صحت میں بہت تاہل ہے۔ اگر کھتولک ازم کے اصول ترقی تمدن کے معین تھے تو انہیں ہمیشہ معین رہنا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت وہ مفید ہوں اور پھر روز کے بعد مضر ہو جائیں۔ میرے نزدیک وہ اصول شروع ہی سے ترقی تمدن کے مخالف تھے، البتہ شروع میں ان کی مضرت زیادہ ظاہر نہیں ہونے پائی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض زہر اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کو ہلاک کرنے سے پیشتر اس پر سکون و اذیت طاری کر دیتے ہیں ان کا آخری نتیجہ، اہلاک یقینی ہوتا ہے، البتہ وہ زود اثر نہیں ہوتے یہی حال کھتولک ازم کا تھا۔

تمدن شائستگی اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم جاہل و رکیز تمدن ہو سکے۔ یہیں سے علم و اخلاق کے ارتباط کی بھی بنا پڑتی ہے۔ جو قوم علمی تحریک علمی زندگی کو مردہ کرتی ہے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر اخلاقی زندگی پر نہ پڑے۔ اس عام جہالت و طرح پر علمی زندگی کے انحطاط میں اخلاق پر مخصوص و براہ راست اثر ڈالنا سب سے پہلا اثر تو یہ پڑا کہ حق و صداقت کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو گئی۔ بڑے سے بڑے مصنفین و ثقافت مؤرخین کی تصانیف اٹھا کر دیکھو۔ کذب و افتراء، مبالغہ و اغراق، تدلیس و تحریف کا اتنا نظر آئیگا جیسا کہ ایک مہو جو وہ مشہور جرمن مؤرخ گھیر کر کہہ اٹھا کہ ”مسیحی صداقت“ ایک ایسا کتب اضافی ہے جس کے مضامین و مصاف الیہ باہم قطعاً متناقض ہیں۔ مگر یہ عام بددیانتی و کذب شعاری ان لوگوں کو نزدیک چنداں معیوب نہ تھی جن کے نزدیک نجات کا دار و مدار

اخلاق و حسن و عمل پر نہیں بلکہ اعتقاد پر تھا۔ وہ اگر اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو صرف کلیسا کی تائید و حمایت میں اور کلیسا کی تائید میں سب کچھ جائز تھا۔

دوسرا بڑا اثر اخلاق پر یہ پڑا کہ معاصی کا کفارہ فدیہ زر سے ہونے لگا۔ شرک و میسیت میں ابتدا سے ماہ الامتیا زیہ چلا آتا تھا کہ آخر الذکر کے نزدیک طہیت کی پاکیزگی و نیت کی صفائی کچھ العبادت تھی۔ بخلاف اس کے مشرکوں کے یہاں باطنی پاکیزگی کو عباد و مذہبیت کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ خود مشرکوں کے یہاں اس کے خلاف بھی خال خال مثالیں ملتی ہیں (مثلاً سسرو، پولونیس، و متغین فیتاغورس کے ہاں) لیکن عام حالت مشرکوں کی یہ تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی فاسق و فاجر ہو بڑے سے بڑا مذہبی پیشوا بن سکتا تھا۔ میسیت نے شروع شروع میں اس کی شدید مخالفت کی تھی اور مذہب و طاعت کو بالکل ضد اخلاق پر مشروط رکھا تھا، لیکن یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ امتداد زمانہ سے مشرک نہ جذبات کی اس میں آمیزش ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابتدا میں اس کی بنیاد خیر و خیرات کے راستہ سے پڑی۔ یعنی میسیت نے فیاضی پر زور دینا شروع کیا اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ جما دیا کہ جو لوگ اس دنیا میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں انھیں یہ سب آخرت میں واپس مل جائیگا اس عقیدہ کی بہترین شہادت ساتویں صدی کے ایک مصنف کے بیان کردہ افسانہ میں یوں ملتی ہے کہ ایک متمول مشرک نے قبول میسیت کے بعد پادری سانیسیس کے ہاتھ میں کچھ اشرفیاں اس غرض سے دیں کہ غریب کو تقسیم کر دی جائیں اور اُس سے بطور نامناسب کچھ کے یہ تمسک کھو لیا کہ عقبی میں اس کا یہ قرض ادا ہو جائے گا۔ کئی سال کے بعد جب اُس پر حالت نزع طاری ہوئی تو اُس نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی کہ میرے ساتھ کفن کے اندر وہ تم تک بھی رکھ دینا۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور تین دن کے بعد اس نے سانیسیس کو خواب میں یہ دکھلایا کہ وہ میرا قرض ادا ہو گیا۔ میری قبر کھودو و اُس میں رسید رکھی ہوئی ملے گی۔ چنانچہ سانیسیس نے قبر کھودی اور واقعہ اُس میں مردہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسید

اس مضمون کی نکلی کہ مسیح نے میرا قرض مباح کر دیا !

اس خوش عقیدگی نے ترقی کرتے کرتے رفتہ رفتہ نہایت مبالغہ آمیز شکل اختیار کر لی
 بڑی بڑی جاہلادیں خانقاہوں پر واقف کی جانے لگیں، مزارات شہداء و بزرگانِ دین
 افراط سے نذر پڑھنے لگی مختلف سیاسی و مذہبی اسباب کی بنا پر راہبیں بہترین امانت دار
 سمجھے جانے لگے اور صدمہ و غم، بیماری کاہلی، اور خوف و خطر کے ہر موقع پر نذر چڑھا دیا
 فراہم ہو گیا۔ بلکہ اُمراء کے لئے اپنی موت کے وقت خانقاہوں کے واسطے جاہلادیں
 وقف کرنا اس قدر لازمی قرار پا گیا کہ اس کا تارک تقریباً دائرہ مسیحیت خارج سمجھا جانے لگا۔
 ایک مشہور مؤرخ نے کہا، یہ کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو ہم ادوارِ ثلثہ میں رکھ سکتے ہیں
 پہلا دور وہ تھا جس میں مذہب عبارت تھا اخلاق سے دوسرا وہ جس میں مذہب مراد
 تھا۔ جو دولت و تقشف کے اور تیسرا دور وہ جو ساتویں صدی سے شروع ہوتا ہے جس
 مذہب نام تھا خانقاہوں پر صرف زر کا۔ کھٹولک ازم کا استبداد، ملک کی عام ناخواندگی
 و جہالت اور چھٹی صدی سے لے کر بارہویں صدی تک کی علمی ظلمت ان سب چیزوں کا
 مل ملا کر یہ نتیجہ ہوا تھا کہ جو قوت پہلے الحاد و بیدینی کے رد میں صرف ہوتی تھی وہ اب
 اکتساب ثروت کی طرف منتقل ہو گئی۔ اور بڑے سے بڑا یہ کار بھی اپنے فسق و فجور کا کفار
 نذر و نیاز، صدقہ و خیرات کی صورت میں دیدینا کافی سمجھنے لگا۔

ادھر راہبوں نے بھی جن کا اگلا جوش اب سرد پڑ چکا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کے انہل
 پر کوئی باز پرس کرنے والا نہیں اور دولت مند تو وہ ہو ہی چکے تھے پھر انھیں متقی و محتاط
 رہنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ اب یہ کھل کھیلے اور ہر طرح پر خوب داد و پیش دینے لگے ان
 کے اکثر دل سے تارک الدنیا تو پیشتر سے بھی نہ تھے۔ بلکہ صرف محنت و مشقت و فوجی خدمت
 سے بچنے کے لئے اس جماعت میں آکر شامل ہو گئے تھے۔ ان آسانوں کے مقابلہ میں قیود
 ان کے لئے صرف یہ دو تھے۔ ایک تجرد و دوسرا افلاس۔ لیکن جب کبھی موقع ملتا

تو یہ ان قیود کو توڑ دینے میں کبھی تامل نہ کرتے۔ بلکہ آزادی کے ساتھ عورتوں سے تعلق رکھتے اور خوب دولت جمع کرتے جاتے۔ تین چیزیں اس راہبانہ تب دولت کی اور بھی معین ہوئیں ایک تو قرب قیامت کا اعتقاد خصوصاً دسویں صدی کے خاتمہ پر، دوسرے محاربات صلیبی کہ ان مواقع پر نہایت کثرت سے پڑنے عہود و موشیق مالی کفارہ دیکر توڑے گئے۔ اور تیسرے وہ ملک و بائے طاعون جس نے سارے ملک پر ہیبت و دہشت مسلط کر دی تھی۔ ان تمام حالات کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء و سلاطین کی خوبیوں کا معیار تمارتران کی ہی مالی فیاضیاں رہ گئیں اور جو شخص جتنا زیادہ اوقاف کلیسا میں صرف کرتا۔ معاصر راہب مؤرخین کی نظروں میں اُسی قدر بہتر و بااخلاق سمجھا جاتا۔ بے شبہ کوئی کلیہ متشنيات سے خالی نہیں ہوتا۔ اس ظلمت کہہ میں بھی کبھی کبھی ذرات نور چمک اٹھتے تھے۔ چنانچہ آئر لینڈ کے راہبیں قبول و ظائف میں جس استغنا کا اظہار کرتے تھے یا جن بعض خانقاہوں نے کبھی اعلیٰ سرشتہ اخلاق ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یا پھر بعض راہبوں نے جس قوت و استقلال کے ساتھ مذہبی مقاصد میں ناجائز رقتوں کے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم ان سے ناواقف نہیں بلکہ ان کا پوری طرح اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال متشنيات کا نہیں، بلکہ عام حالت کا ہو اور وہ ایک مسلسل داستان ہے راہبوں کی زرپرستی اور عوام کی خوش اعتقادی کی۔ آخر کار یہ زرپرستیاں وسیع کاریاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کے خلاف رد عمل شروع ہوا۔ مگر اس کا آغاز کین صیدلو کے بعد ہوا۔ اُس وقت تک یہ مذہبی قزاقی اپنا کام کر چکی تھی اور مقتدایان کلیسا کے کیسہ پُر ہو چکے تھے۔

ہمارے نزدیک اس مذہبی تحریف و دہشت زدگی نے جتنا کام مشترکوں کو مسیحی بنانے میں کیا تھا اُس سے کہیں زیادہ اس دُور خانقاہیت میں کیا۔ کبھی کبھی اتفاق سے ایسے بھی پادری پیدا ہو جاتے تھے جو ان متفق علیہ مسائل کو اشتلا فی بنا نا چاہتے تھے

کہ کافروں پر عقوبت دائمی ہوگی مگر جو کچھ قبل جتنے حکماء گزرے ہیں حسبِ نبی تھے اور پھر جو
 قبل پتہ لینے کے فوت ہو جاتے ہیں عذابِ ابدی کے مستحق ہوں گے۔ لیکن ان مشکلین کی
 کوششیں ہمیشہ ناکام رہتی تھیں کیونکہ درحقیقت ان مسائل پر فقہاء کا اجماع عام تھا اور یہ کچھ لوگ
 کلیہ کا اصل الاصول تھا کہ تمام کفار بلکہ جو مسیحیوں میں کی ایک بڑی تعداد آخرت میں ایک
 عذابِ ابدی میں گرفتار رہے گی اور عذاب بھی ایسا شدید جس کے مقابلہ میں دنیا کی تمام
 آلام و شدائد ایک راحت ہیں۔ کچھ لوگ کلیہ کا یہ اصل الاصول بجا نہ آئے تو دیکھا کم تھا۔
 راہبان خائفانہ نشین نے اسے اور مبالغہ انگ آمیزی کے ساتھ بیان کرنا شروع کیا
 سینٹ میکس کی بابت روایت ہے کہ ایک بار اُسے جنگل میں ایک انسان کا کاسر
 پڑا ہوا ملا۔ اس نے اپنا عصا اُس پر مارا جس سے اُس میں قوت نکلا آگئی۔ اُس نے بیان کیا
 کہ میں مشرکوں کے ایک بزرگ کاسر ہوں جو دنیا میں طورِ مسیحیت بہت پیشتر تھا اور
 اس لئے اب دوزخ کا کاندہ ہو رہا ہوں۔ جتنا فاصلہ زمین سے آسمان تک ہوتا ہے
 بلند آتش دوزخ کے شعلہ اُٹھتے ہیں۔ کفار و گنہگاروں پر پشت کی طرف سے عذاب نازل
 کیا جاتا ہے۔ میری التجا صرف اتنی ہے کہ آپ کی دعا سے سامنے کی طرف سے عذاب
 نازل کیا جائے تاکہ میں کم از کم اپنے رفقاء کی شکل تو دیکھ سکوں اور مرگ ابنو چہشتی دوزخ
 ہی کے اصول پر کچھ تسکین حاصل کر سکوں۔ اسی طرح سینٹ گری گوری کی بابت مشہور ہے
 کہ شاہِ ریچمین کے محاسن و فضائل سے متاثر ہو کر اُس نے اُس کی بخشش کی دعا کی اُس کی
 اس دعا پر خود اُس کے اوپر عتاب نازل ہوا اور بالآخر جب اُس نے اس کا عہد کیا کہ آئندہ
 کبھی اس طرح کی دُعا نہ کرے گا۔ تب جا کر اتنا ہوا کہ ریچمین پر عذاب میں تخفیف ہو گئی۔

راہبوں نے بحال ہر گرمی چند ہی روز میں آلام و شدائدِ جہنم کے مناظر سے متعلق احیاء
 خاصہ انبار پیدا کر دیا جس میں سے گرمی گوری اعظم کی ایک تالیف خاص شہرت رکھتی
 ہے۔ مگر جو اول سے لے کر آئینک اکاذیب و موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اسی کی ایک روایت

یہ ہر کہ ایک شخص اسٹیفن نامی غلطی سے مر گیا تھا۔ جب اس کی روح و اور محشر کے حضور میں پیش ہوئی تو ارشاد ہوا کہ اس اسٹیفن کی نہیں بلکہ اس کے ایک ہمنام کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی روح دوزخ کا ایک منظر دکھائے جانے کے بعد دنیا میں پس کر دی گئی اور معاً ایک دوسرا اسٹیفن وفات پا گیا۔ کوہ آتش فشاں اس نقطہ خیال سے ابواب جہنم ہیں اور سلسلی میں ان کے دہانہ جو وسیع ہوتے جاتے تھے۔ اس کا سبب سینٹ گری گوری کے الفاظ میں یہ تھا کہ قُرب قیامت کے باعث ان میں عنقریب بہت بڑی تعداد دوزخیوں کی داخل ہونے والی ہو۔ اسی واسطے یہ وسیع کئے جا رہے ہیں۔ متعدد درابھوں نے مشرک تاجداروں کی ارواح کو دوزخ میں پڑے ہوئے رکھا شقہ میں بچشم خود دیکھ لیا تھا۔ مگر آگے چل کر متاخرین راہبین نے اس باب میں شدید مبالغہ آمیزیوں سے کام لینا شروع کیا۔ ان کے سامنے سینٹ گری گوری کی داستان بھی پھینکی اور بے مزہ رہ گئی۔

ساتویں صدی سے نئے کر بارہویں صدی تک عذاب آخروی کے چشم دید حالات اس جزئی تفصیل سے بیان کئے جاتے رہے کہ خالق کائنات کی جانب ذایم اخلاق کا انتساب ان سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ دوزخ کے وسط میں شیطان ایک دائرہ تار کے اندر لوہے کی دھکتی ہوئی زنجیروں سے جکڑا ہوا کھڑا ہوا ہے۔ مگر اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جن سے وہ دوزخی ارواح کو پکڑ پکڑ کر اپنے دانتوں سے نوچتا ہے اور پھر اپنے شکم میں جو معدن آتش ہے ڈال لیتا ہے۔ فرشتگان عذاب لوہے کے دھکتے ہوئے گرز لے ہوئے ارواح کو آگ کو آگ سرف میں اور برف سے آگ میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عذاب کے اور مختلف طریقہ بھی ہیں۔ مثلاً کوئی زبان کے بل لٹکا ہوا ہے۔ کوئی لکڑی کی طرح چیرا جا رہا ہے کسی کو سانپ ڈس رہا ہے کسی کے سر پر ہتھوڑوں کی مار پڑ رہی ہے کسی کا جسم ابال کر کپڑے میں پخوڑا جا رہا ہے قس علیٰ ہذا گنگاروں کو پل صراط پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور آتش جہنم کو آتش دینیوی سے وہی نسبت ہوتی ہے جو اصل جسم کو سایہ سے ہوتی ہے۔ گویا یہ اُس کے سامنے اتنی بڑی حقیقت ہے

پھر اُس میں گندھک کی بھی آمیزش ہوتی ہے اور کسی قسم کی روشنی نہیں ہوتی تاکہ دوزخیوں کو منجملہ اور تکالیف کے ایک تاریکی کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑے۔

ہمارے موجودہ تعلیم یافتہ ناظرین ان نفرت انگیز تذکروں سے ممکن ہو کہ اکتانگے ہوں۔ لیکن آج سے چند صدی پیشتر جو زمانہ تھا اُس کی یہ حالت نہ تھی۔ اُس وقت لوگ انہیں بحال خوش عقیدگی سنتے تھے اور ان سے بدرجہ غایت متاثر ہوتے تھے۔ بجز ایک پیلیجیوں کی استثنائی مثال کے جو جدید سائنس دانوں کا ہم مذاق تھا اور سب کا یہ متفق علیہ اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ اولین کی پاداش میں دنیا پر موت، بیماری وغیرہ جملہ عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں، ہر شخص قرب قیامت کا معتقد تھا اور شیاطین کی قوت و کارفرمائی کا ہول ہر دل میں سما یا ہوا تھا۔ ان معتقدات کو موثر بنانے کا سب سے چلتا ہوا اگر معتقدانِ فرقہ کھونک کے ہاتھ میں یہ تھا کہ انہیں بچوں کے ذہن میں ایام طفولیت ہی سے بٹھانا شروع کر دیتے تھے تاکہ آئندہ کبھی یہ نقوش جو نہ ہو سکیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیماری یا مصیبت کے وقت لوگوں کو وہی تصویریں اپنے گرد چلتی پھرتی نظر آتے لگتی تھیں جو ان کے داہم میں عرصہ سے باگز ہیں تھے سینٹ گری گوری کی روایت ہو کہ ایک صاحب جو بڑے عابد و زاہد سمجھے جاتے تھے مگر جو خفیہ طور پر اپنی غذا میں گوشت کا استعمال رکھتے تھے جب دنیا سے کوچ کرنے لگے تو حالت نزع میں انہوں نے دیکھا کہ ایک ٹیب اثر دہان کے جسم کے گرد چکر مارے بیٹھا ہو اور ان کی روح قبض کر رہا ہو۔ یا اسی طرح ایک پنجابِ معصوم بچہ نے بس نے اپنے باپ کی زبان سے کلمات کفر سن کر انہیں سیکھ لیا تھا۔ مرتے وقت یہ دیکھا کہ فرشتگان عذاب ارد گرد دکھڑے ہوئے اُسے دوزخ میں سے تھانے کی غلٹ کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ معتقد کلیسا کی یرقانی آنکھ کو دنیا میں ہر چار طرف عذاب و عقوبت ہی کی زردی دکھائی دیتی تھی۔ وہ لطف

لے اس طرح کے دہشت انگیز قصص کے بیان کرنے میں آئرلینڈ کے راہبوں کا نمبر اول ہے۔

تفریح کی بے ضرر چیزوں کو مُنبہ ہی سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ شفق کی زردی آئینہ سرخی کی وہ یہ تعبیر کرتا تھا کہ آفتاب اس وقت دوزخ کے قریب ہو رہا ہے اور اس کی دہشت سے اس کا یہ رنگ ہو رہا ہے۔

شقاوت و قساوت کے یہ کارنامے نیرو و فیلیس کے شایان شان ہوں تو ہوں (بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کے سامنے نیرو کی شقاوتیں عشرِ شیر کا بھی درجہ نہیں رکھتیں) لیکن ایک ایسی ذات کی طرف جسے رحمن و رحیم، غفار و سار کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا اور جو ہمہ تن مرحمت و مغفرت سمجھا جاتا تھا۔ ان کا انتاب کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ مگر نفس انسانی کی اس بوجہی کو کیا کیجے کہ جو لوگ مشرکوں پر یہی سب سے بڑا اعتراض کرتے تھے کہ وہ اپنے معبودوں کی جانب ذمائم اخلاق کا انتساب کرتے ہیں۔ وہی صدیوں تک بحال خوش عقیدگی اس نزاعات کو جزو ایمان کیا، اہل ایمان سمجھتے رہے۔ ہم لوگ آج کسی بڑے سے بڑے ظالم تاجدار کے انتمائے ظلم کے لئے اس کے سوا اور کیا پیرایہ بیان اختیار کر سکتے ہیں کہ وہ اسلاف کے جرایم کی پاداش میں اخلاف کو پشیمانیت تک مبتلائے عذاب کھاتا تھا مگر یہ کیا قیامت تھی کہ بعینہ اس خصوصیت کو بے تحلف بلکہ فخرِ مقتدا یا ان فرقہ کھولک اپنے معبود حقیقی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ ان بزرگواروں میں ایک نہایت مشہور بزرگ پشیر لومبرڈ ہوئے ہیں جو اس پایہ کو شخص تھو کہ ان کی تصنیف کی چار ہزار جلیل القدر فقہانے شروح و تفاسیر لکھیں۔ ان حضرت کی تصنیف کا ایک فقرہ سننے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ پر داد تحقیق دیتے ہوئے کہ اہل بہشت و اہل دوزخ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے، ارشاد ہوتا ہے کہ

”اب خاتمہ سخن پر ہیں یہ منہج کرنا ہے کہ دوزخیوں کو مبتلائے عذاب دیکھ کر ہشتیوں کو درد معلوم ہوگا یا اس سے ان کی مسرت میں اصافہ ہوگا؟ گری گوری کا مقولہ ہے کہ اس منظرِ عذاب سے ہرگز ان کی مسرت میں خلل نہ ہوگی کیونکہ جب ان کے دل میں رحم اور ترس کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا

پھر کیا تھے اُن کی مسرت کو کم کرنے والی ہوگی۔ اور اگر یہ بیشدیوں کو مسرت بجائے خود بہت کافی ہوگی تاہم جب وہ گنگاروں کی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کریں گے تو انھیں اور زیادہ فخر و سرور حاصل ہوگا کہ وہ فضلِ خدا نے ان تکالیف سے محفوظ رکھ رکھے۔ پس نیکو لوگوں کو بشارت ہو کہ وہ دوسروں کو مثلاً اُسے آلامِ ذی طہر لہی مسرت و راحت میں اور افتادہ حاصل کریں گے اپنی نجات پر خدا کا شکر بھی لائیں گے۔ اور جو لوگ کفر و معصیت میں پڑے رہے تھے۔ انھیں کیفرِ کردار کو پہنچنے دیکھ کر لطفِ حاصل کریں گے۔

اُس زمانہ میں ہر شے کی لفظی تحقیق و مویشکا فی کما جو خطا پیدا ہو گیا تھا اُس سے اس خرافات کی اشاعت کو اور تقویت پہنچی۔ ان لوگوں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ جب تک بال کی کھال نہ بن جائے جب تک جُزئی تفصیلات پر اطلاع نہ حاصل کر لیں محض "عذابِ آخری" پر قانع رہ جائیں۔ ہاں تو ایک سبب اس کا یہ تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ راہِ بہتہ طرزِ زندگی و غفلت نشینی بجائے خود التباس، جو اس پیدا کر کے متعین نہ کہ سائنس ایسی صورتیں پیش کر دیتی ہے۔ اور پھر قیصر سبب سے بڑھ کر لوگوں کی ارادی بددیانتی و کذبِ شکاری تھی۔ لیکن یہ نفسِ بشری کا قافہ فطری ہے کہ وہ مدت دراز تک خوف و دہشت کی حالت میں نہیں رہ سکتا ہے بلکہ جہاں اپنے دل سے اسبابِ دہشت پیدا کرتا ہے وہاں اُن کا تو ذہنی اپنے دل سے پیدا کر لیتا ہے چنانچہ جہاں توشِ عقیدگی کی آنکھ کو ہر طرف شیا عین کا مجمع نظر آتا تھا۔ وہاں ملائکہ کی بھی کمی نہ تھی اور رفعِ دہشت کا سب سے زیادہ موثر و مجرب نسخہ یہ ثابت ہوا کہ کسی میر فقیر کو اگر انہما تزدیدی جائے۔ یا خانقاہوں پر چالو اور وقف کر دی جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک مردہ کے اعمال کا وزن ہو رہا تھا تو یہ کاریوں کا پلہ بہت بھکا ہوا نظر آیا اور قریب تھا کہ فرشتگانِ عذاب اپنا کام شروع کر دیں کہ دفعۃً سینٹ لارنس کی درگاہ کے ایک مجاہد نے قدم رکھا اور سونے کا ایک ٹکڑا جو اُس مردہ نے درگاہ پر چڑھایا تھا دوسرے پلہ میں ڈال دیا جس سے معاً اُس کا وزن بہت بڑھ گیا اور مردہ کی نجات ہو گئی۔ بالکل اسی طرح

دیگو برٹ، شارلمین وغیرہ کو نجات حاصل ہوئی۔ بلکہ بعض اشخاص جو گناہوں کی گھڑی لائے ہوئے مہ گئے کبھی کبھی اپنے پیروں کی دُعا سے دوبارہ زندہ کئے گئے ہیں تاکہ ان کو دماغ معاصی کفارہ مالی کے پانی سے دُہو دیئے جائیں اور اس طرح جوں جوں تخیلی انداز ہی کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ جوں جوں لوگ عذابِ آخری کی دہشت کا زیادہ ڈھکا ہوتے گئے اُسی نسبت سے راہبوں اور خائفانہ نشینوں کے کید زیادہ پُر ہونے لگے۔

اُس زمانہ میں شریعت نے جس سختی کے ساتھ معاشرتی زندگی کو اپنے شکنجہ میں کس کھینچا۔ حقیقت اس کا اندازہ وہ لوگ کر ہی نہیں سکتے جنہوں نے اُس زمانہ کی تفسیر اور اس پر کا مطالعہ نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں کہ ہزاروں عجیب و غریب اور مضحکہ خیز معجزات کی داستانیں اُس وقت موجود تھیں بلکہ نہایت کثرت سے تھیں اور بالقصد وضع کی گئی تھیں اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مسیحیت برائے نام مسیحیت رہ گئی تھی ورنہ نقدِ آلہ و شرک کے لحاظ سے اُس میں اور بُت پرستی میں کوئی فرق نہیں باقی رہا تھا۔ ملک کی عام جماعت دماغی سطح کی پستی۔ نیم مسیحی بربروں کی وحشیانہ مذہبیت خائفانہوں کا اقتدار و اثر مقتدیانِ کلیسا کی خود غرضیاں، معاصی کے مالی کفارہ دینے کا رواج عام بہنم کی دہشت و ہیبت ان سب چیزوں نے مل ملا کر کلیسا کی قوت کو فوق الحد بنا دیا تھا۔ ایسی کہ کسی کو مخالفت کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ رد و انکار کا پہلا زمینہ ہے شکِ بے اطمینانی او یہاں ہرگز سے شک و سوسہ شیطانی کے مترادف قرار دے کر قطعاً ممنوع و حرام کر دیا گیا تھا جس کی سزا ایسی شدید رکھی گئی تھی کہ لوگوں کا کلیچہ اس کے قصہ ہی سے دہل جاتا تھا اور حقہ ایمان کلیسا نے بحال دشمنی ایسا نظام اقتدار تیار کر رکھا تھا کہ انسان اپنی تکلیف و مصیبت کے وقت انھیں کی طرف رجوع کرنے میں اپنے تئیں مجبور پاتا تھا جس سے ان کی فکر اہل دنیا پر اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ علم و تعلیم، دولت و ثروت، امارت و حکومت، غرض ہر قسم کی قوتیں اگر انھیں کی ذات میں جمع ہو گئیں۔

ان حالات کے ساتھ اندازہ کرو کہ اُس زمانہ میں جن روشن خیالوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہوگا۔ انھیں کیسی شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! تقلید کی بندشوں سے آزادی ہمیشہ اور ہر جگہ مشکل رہی ہے۔ لیکن جب بندشیں اس قدر سخت و سنگین ہوں تو ان پر خطاب آنے میں دشواریاں بھی کس بلا کی پیش آتی ہوں گی! لوگ کسی بڑے بلوہ یا بقاوت کے مصائب کا آسانی سے تصور کر سکتے ہیں اور قتل و خون دار و زندان کے شدید بلاؤں کو ہمارے متخیلہ میں آجاتے ہیں۔ لیکن سارے ملک میں مطعون و انگشت نما ہونے اور راجے محبوب ترین اعزہ و احباب کے چھوٹ جانے سے جو سہان روح رہتا ہوگا اُس کا اندازہ دشواری اور اس سے بھی دشوار تر اُس تکلیف جان گزرا کا احساس ہے جو ان مصلحوں کو گوشہ خلوت میں یہ سوچ سوچ کر ہوتی ہوگی کہ اگر کہیں ان کی رائے حق پر نہ ہوئی بلکہ جیسا وہ بچپن سے سنتے چلے آئے ہیں محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہوئی اور اسی حالت تشکیک وارتیاب میں ان کی وفات ہو گئی تو آخرت میں ان کے لئے کیسا عذاب الیم ہوگا۔ یہ تصور کس قدر ہولناک ہے! کون کہہ سکتا ہے کہ ان غریبوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور پھر یہ غریب تنہا رہتے تھے۔ کوئی ان کی منظم جماعت نہ تھی جو تبادلہ خیالات و ہمدردی سے اپنے غم کو بھلاتے۔ ان کے تو یکے جویں نابور پڑ جاتے ہوں گے۔ علوم طبعی یعنی سائنس اور فلسفہ تاریخ ہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کے دامن میں انھیں پناہ مل سکتی تھی مگر اس وقت ان دونوں کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ آج یہ ایسے تمدن و اشاعت علم برب بڑے سے بڑے فلسفی پر بار بار یہ کیفیت گزرتی ہے کہ بیماری یا اور کسی ناگہانی مصیبت کے وقت اُس ذہن میں بے اختیار وہ مفر خرافات عقاید از سر نو نمودار کرتے ہیں جنہیں اُس نے بچپن میں سنا تھا گو یا جنہیں دماغ و عقل مدت ہوئی مردود کر چکے ہیں مگر دل و جذبات سے وہ باوجود مدت العمر کی کوشش کے نہیں نکل سکے ہیں تو پھر اُس زمانہ کے روشن خیال مصلحوں کے تصور میں جنہیں آغوش مادر سے اس تعلیم کا غور کر دیا گیا تھا کہ تقلید اس الفضائل اور شک وارتیاب

مطلق ہو بعض وقت جس قوت داشتہ اوس کے ساتھ بچیں گے راسخ شدہ اعتقادات عود کر آتے ہوں اُس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ درحقیقت یروبا دوسرے کا منہ چلانے کے اور احسانات کے دنیا پر ایک یہ بھی بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے دوزخ کے خوابوں کے ساتھ مضحکہ لگے جو راہبانہ اقتدار کے لئے ایک بڑے زبردست سمارے کا کام دے رہے تھے ان کی وقت کو دلوں سے مٹایا اور لوگوں کو کم از کم اس قید و مہشت سے خلاصی دی بھی بہت شبہ ہے کہ کھولک دماغ بغیر مشرکانہ لٹریچر اور جھکاؤ اسلام کی اہانت کے کبھی بھی از خود وجود و تار یک نیالی کا جو اپنے کندھے سے ہٹا سکتا۔ شہری زندگی کی توسیع دنیوی دلچسپیوں اور کاروبار میں اضافہ علم و مطالعہ کی تجدید اصحابات صلبی کے سبب پایا یا نہ اقتدار کا ضعف یہ سب چیزیں مل کر کلیسا کی قوت کو توڑنے میں موثر ہوئیں۔ مگر ایک عقیدہ ایسا تھا جو اب بھی مقتدایان کلیسا کے ہاتھ میں جلب زر کا ایک اچھا آلہ بنا رہا اور جس سے ان کی جیبیں عرصہ تک بھرتی رہیں۔ میری مراد عقیدہ عالم برزخ سے ہے۔

ہمارے زمانہ کے فلاسفہ اہل میں آگسٹ کو مٹ قرون وسطیٰ کے بڑے حامی و ہمدرد ہوئے ہیں۔ وہ جہاں اس عہد کی ادبیسیوں خوبیاں شمار کرتے ہیں وہاں اس عقیدہ برزخ کی روح میں خصوصیت کے ساتھ طب لسان ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسے دمیانی طبقہ کا وجود ممکن ہو گیا جو اخلاقی حیثیت خیر محض و شر محض کے مین بین تھا اور اس طرح تخلیف مذہبی کے اشتداد میں نفٹ ہو گئی۔ لیکن میرے نزدیک عقیدہ برزخ کی یہ تعبیر صحیح نہیں جو لوگ کا فر مرتے تھے ان کے لئے تو برزخ کا وجود بیکار ہی تھا کہ ان کی جگہ صرف جہنم تھی۔ البتہ جو لوگ پورے صحیح عقیدہ مگر بد اعمال ہوتے تھے۔ ان کا گزر برزخ میں اس غرض سے ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ کی برداشت صعبات کے بعد یہ قید جھیل جب گناہوں کی آلائش سے پاک صاف ہو جائیں تب جنت میں داخل ہوں۔ لیکن اس سے اشتداد و تخلیف مذہبی میں ذرا بھی تخفیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ برزخ کے جو آلام و شداید بیان کئے گئے ہیں وہ آلام

جہنم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وہی آگ، وہی جلن، وہی عذاب و دردناک۔ البتہ فرق اتنا تھا کہ عذاب جہنم سے پھسکا را پانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اور وہ جگہ کفار کے لئے مخصوص تھی۔ البتہ برزخ میں مسیحی گنہگار مقید رہتے تھے اور انھیں قید سے نجات مل سکتی تھی، اس صورت سے کہ مردہ کے ورثاء، خیر و خیرات، یا نذر و نیاز کے نام سے کوئی قسم لاکر کلید بردارانِ کلیسا کے حضور میں پیش کریں۔ یہ تھا ہمارے نزدیک اصل مدعا بقیۃ برزخ کا! اخلاقی نقطہ نظر سے جو چاہئے کئے۔ مگر اس ہوشیاری و دانشمندی کی داد تو بہر حال دیکھئے کہ اس میں ہی کس حکمت سے اپنی پردامنی کا راستہ نکال لیا۔ ایک نوجوان و شوہر پرست خاتون سے جس کے سر پر ابھی ابھی بیوگی کی مصیبت نازل ہوئی ہو۔ یہ جا کر کہنا کہ اُسے جو ذات و دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی اس وقت برزخ کے شدید غمی میں گرفتار ہو جن سے نجات صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اُس کے کفارہ صما کے لئے کوئی رقم مزدور تحصیل کر لے گا اس سے زیادہ موثر و کامیاب طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

فصل (۱۴)

مغربی یورپ کی اخلاقی حالت

رومی شہنشاہی کے فنا ہونے سے لے کر شارلمین کے وقت تک بازنطینی یا مشرقی حکومت میں جو عہد بہ عہد مذہبی تغیرات ہوتے رہے ان کا ذکر گذشتہ فصلوں میں ہو چکا۔ اب دیکھنا یہ کہ اس زمانہ میں مغربی یورپ کی اخلاقی حالت کیا رہی؟ لیکن اس سوال کے صحیح جواب حاصل کرنے میں متعدد دشواریاں ہیں جن میں سب سے بڑی وقت تاریخی مواد کا فقدان ہے۔ ۱۲۱۵ء سے ایک صدی بعد تک کی تاریخ گو یا مطلق ہی موجود نہیں جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکتا ہے وہ خاتقاہوں کے تذکروں اور شہداء کی سوانح عمریوں میں ضمنی اشارات سے پتہ چلتا ہے۔

البتہ ۱۲۲۲ء سے اُدھر ڈھائی صدیوں قبل کی تاریخ گری گوری آف ٹورس اور فریڈ گیرس کے
 صفحات میں یہ پوری صراحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اٹلی کی سرزمین میں
 شہنشاہی کے حالات و خصائص پھر ایک حد تک عود کر آئے تھے۔ لیکن گال کے علاقہ میں
 کلیسا کی اشاعت بربروں کے درمیان ہو رہی تھی جنہیں علم و تمدن سے کوئی منہ نہ بھتا۔
 معاشری زندگی میں ایک عجیب بنظمی و طوائف الملوک کی بھی جاری تھی۔ ظلم و جبر، مکرو فریب
 آوارگی و ادباشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اُٹکتا جاتا
 ہے۔ ملکہ فریڈیگیو ندو ملکہ بروناٹ کا نمبر اپنی خون آشامیوں اور ہونسا کیوں کے لحاظ سے
 ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا اور خیر یہ دونوں تو ملکہ تھیں۔ ہر طبقہ نے فسق و فحش کاری کو
 اوڑھنا پھوننا بنا رکھا تھا۔ ایک پادری صاحب کا ذکر ہے کہ وہ اکثر اس قدر مخمور ہو جاتے
 تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک دوسرے پادری کا ٹینس کی بہت
 روایت ہے کہ وہ شراب پی کر اس قدر بدست ہو جاتا تھا کہ چار آدمی اُسے پکڑ کر میز پر سے
 اُٹھالے جاتے تھے۔ اسی پادری نے ایک بار اپنے کسی ماتحت کی جائداد پر دست برد
 کرنا چاہی اور جب اُس کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اسے زندہ دفن کر دیا۔ مگر وہ اتفاقاً
 سے زندہ بچ آیا۔ اور جب اُس نے اس جرم کو طشت از بام کیا تو پادری کو صرف تنبیہ کر دینا
 کافی خیال کیا گیا بڑے سے بڑے ظالم و سہ کار تاجداروں کے مصاحبین و حواریں خاص
 یہی پادری ہوتے تھے۔ ملکہ فریڈیگیو ندو کے خاص راز دار یہی پادری تھے جن کے ذلیعہ
 سے وہ ہر طرح کی سفایوں کا ارتکاب کرتی تھی۔ خود مشہور پاپائے اعظم سینٹ گری گوری
 ہر وقت ملکہ بروناٹ کی خوشامدیں لگے رہتے تھے۔ شاہ گونڈی بالڈ نے جب اپنی بیویوں
 بھائیوں کو قتل کر ڈالا تو پادری سینٹ آونیس نے اس پر ملامت کرنا کیسا منایت تھیں
 کی کہ اپنے حریفوں کا خطرہ مٹا کر اس نے اپنی رعایا کی آسائش کی جبر مضبوط کر دی۔ پادریوں
 کا عہدہ اکثر انھیں لوگوں کو ملتا تھا جو حرص و ہوا و عیش پرستی میں خاص شہرت رکھتے

ہوتے تھے اور مذہبی مجالس عموماً مینوشی کے مناظر ہوتے تھے۔ یہ لوگ ایک عرصہ سے
 مسلح رہنے لگے تھے بلکہ سینٹ گری گوری پچھی صدی کے دو پادریوں کا ذکر کرتا ہے جنہوں
 اپنے بہت سے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا تھا۔ غرض اس زمانہ کی تاریخ کے جس کسی
 صفحہ کو ہم کھولتے ہیں ہر جگہ ظلم و شقاوت، سفائی و توحش، بد چلنی و شہوت پرستی کے مناظر
 سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مخالفوں کے ہاتھ پیریا ناک کان کاٹ ڈالنا ایک معمولی بات تھی
 اور ہر بادشاہ کے لئے اپنے اعزہ کو قتل کرنا تو گویا لازمی تھا۔ ایک بادشاہ نے اپنے
 باغی بیٹے، اپنی بیو، اور اپنی پوتیوں کو اپنے سامنے زندہ جلوا دیا۔ ایک ملکہ نے اپنی بیٹی
 کو دریا میں غرق کر دیا اس ڈر سے کہ کہیں اُس کے سوتیلے باپ کی طبیعت نہ اس پر آجائے
 ایک اُسقف صاحب ایک مرتبہ کسی معمولی آدمی کے گھر میں گھس آئے اور اس کو اُس کے
 مکان سے باہر نکل دیا تاکہ اُس کی حسین بیوی کے ساتھ زنا کر سکیں وہ اس میں مشغول
 تھے کہ شوہر واپس آیا اور عین حالت اختلاط میں زانیہ و زانیہ دونوں کو قتل کر ڈالا ایک
 شہزادہ صاحب کا یہ مشغلہ تفریح تھا کہ اپنے غلاموں کو آگ سے جلواتے رہتے تھے اور
 دو غلاموں کو اس جرم میں زندہ دفن کر دیا کہ انہوں نے بغیر اجازت اپنی شادیاں
 کر لی تھیں۔ اس طرح کے واقعات اس زمانہ کی تاریخ کے ہر صفحہ میں نظر آتے ہیں ملکہ بروینا
 جب اپنے طویل عہد حکومت کے بعد اپنے حریف کلوٹیر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئی تو اُسے یہ
 سزا ملی کہ متواتر تین دن تک انواع و اقسام کے شاید و آلام میں مبتلا کر کے اونٹ کے
 اوپر بٹھا کر سارے شہر میں پھرائی گئی اور اس کے بعد ایک شریر گھوڑے کے دم میں
 باندھ کر اُسے تیز دوڑا دیا گیا جس سے ضعیف العمر ملکہ کی لاش کے پرچھے اڑ گئے۔

ایک طرف تو بد اخلاقیوں کے اس مرقع کو پیش نظر رکھو اور دوسری طرف حقیقت
 کو ملحوظ رکھو کہ یہ زمانہ خالص دینداری کا تھا۔ لشر پچر تمام مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا
 الحاد و بیدینی کا نام و نشان بھی نہیں رہا تھا۔ راہبوں اور پادریوں کو ہر طرح کا جاہ و پڑا

واقعدار حاصل تھا۔ متعدد سلاطین نے ترک تاجداری کر کے فقیری اختیار کر لی تھی اور ساتویں اور آٹھویں صدی میں نہایت کثرت سے بزرگانی دین پیدا ہوتے رہے۔

پھر اس زمانہ کے مؤرخین جس خاص طور پر اندراج واقعات کرتے ہیں وہ بھی ہم لوگوں کے لئے عجیب و غریب ہے۔ گری گوری آف ٹورس جس کی تاریخ ہمارا اصل ماخذ ہے۔ بہت مشہور اور بڑا محتاط و متقی پادری تھا۔ جو ہر واقعہ کو مذہبیت کی عینک سے دیکھتا ہے تاہم جب اپنے مخالف عقیدہ والوں کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ تو اس کا جس اخلاق و حریت کے طور پر مُردہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کلو دس ایک مشرک رئیس تھا جو مسیحی ہو گیا۔ اصطبلخ کے بعد ہی اسے یہ دیکھ کر تاسف ہوا کہ گال کے ایک بڑے علاقہ کا تاجدار ایک بعقیدہ شخص ہے۔ چنانچہ اس نے اس کے ملک پر حملہ کا قصد کیا اور اس حملہ کے دوران میں معجزات اس کی تائید کرتے گئے۔ مسیحی ہو کر سب سے پہلے جنگ آزمائی کی ابتدا اسی نے کی۔ بالآخر فتح اسی کو نصیب ہوئی اور اب اس کی نظر میں اور بلند ہوئیں۔ اس جنگ میں اس کو بڑی مدد اپنے ایک عزیز سگبرٹ سے ملی تھی جو ایک اور صوبہ کا فرماں روا تھا۔ کلو دس نے اس کے لڑکے کو ترغیب دی کہ اپنے باپ کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اب یہ پدر کش فرزند تخت نشین ہوا۔ اور کلو دس نے اس کے پاس اظہار محبت و اخوت کے لئے اپنے سفیر بھیجے لیکن درپردہ انھیں یہ حکم دیا کہ اسے قتل کر ڈالنا اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی اور ملک بے والی و وارث رہ گیا اب کلو دس وہاں پہنچا اور ایک تقریر میں رعایا کے سامنے بحال حکمت عملی ان کی طوائف المملوکی و خانہ جنگیوں پر اظہار تاسف و قلق کر کے یہ کہا کہ ”میں خود مہماری حفاظت کے لئے تیار ہوں“ لوگوں نے اس تجویز کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور یوں بے لڑے بھڑے کلو دس ایک اور تخت پر قابض ہو گیا۔ اب طمع اور بڑھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک گال پر قابض ہو کر اور وہاں جائز حکمرانوں کو جو زیادہ تر اس کے عزیز ہوتے تھے قتل و معزول کر کے اُس نے بجز

اپنے بیوی بچوں کے اور تمام اعزہ کو خفیہ طور پر قتل کراڈالا تاکہ کوئی دعویدار سلطنت باقی نہ رہے
 اس کے بعد اپنے ارکان و دربار کے سامنے اس نے اپنی تثنائی پر زار و قطار رونما شروع کیا
 کہ دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار باقی نہیں رہا۔ یہ تقریر بھی مکر سے خالی نہ تھی کہ اس کا اہل مشائخ
 یہ پتہ لگانا تھا کہ اب بھی کوئی ممکن رقیب باقی ہے یا نہیں چند سال کے بعد اس نے
 وفات پائی اور اس سیرت و طبیعت کا تاجدار بحال اعزاز و اعتشام اپنے تعمیر کرائے
 ہوئے قبرستان میں دفن ہوا۔ اور سینٹ گری گوری جوان واقعات کے راوی ہیں انھیں بے
 تکلف لکھتے ہیں اور ناپسند کرنا کیسا اس پر فقر و منہرست کا اظہار کرتے ہیں کہ کفار و اہل ضلالت
 کو شکست ہوئی اور نصرت غیبی سے دین حق کا ہر حکم بول بالا رہا۔ اسی طرح کہ جیسے اس سے
 قبل ابراہیم، یعقوب، موسیٰ، ہارون و داؤد کا رہا تھا۔ خاتمہ کے یہ فقر و منہرست کے قابل ہیں
 ”یہ یس جس نے بدعت و ضلالت کی بنا ڈالی، نعمت اہل ہوتے ہی واصل جہنم ہوا۔ لیکن حامی
 دین حق پلیدی کو اگرچہ حمایت تثلیث میں جلاوطن ہونا پڑا۔ لیکن وفات کے بعد اُموی خلیفہ
 گھرملا۔ شاہ کلہووس تثلیث پر دل سے ایمان رکھتا تھا۔ اسی قوت ایمانی کے اعانت سے
 اُس نے کفار پر فتح پائی اور تمام ملک کال پر قبضہ حاصل کیا۔ الا کہ حق سے ارتداد کا
 کا یہ اثر ملا کہ سارا ملک چھین گیا اور آخرت میں عذاب الیم نصیب ہوا۔“

یہ ایک نمونہ ہے اُس زمانہ کے بہترین مؤرخ کے طرز خیال و تاریخ نگاری کا جس کے صدائے
 نغفایر اور پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن دنیا میں کوئی شے شمر مطلق نہیں ہوتی۔ ہر شے میں
 خیر کے پہلو ضرور شامل رہتے ہیں۔ اس بنا پر باوجود اس کے کہ اُس وقت کا اخلاقی مطلع
 نہایت غبار آلود تھا تاہم فضائل اخلاق کی جگہ کا ہٹ سرے سے فنا نہیں ہو گئی تھی
 یہ ضرور ہے کہ اُس وقت کے حکماء و علماء بجائے اخلاق کے اصولی و اساسی مباحث کے اپنی
 ساری قوت فقہ کے کسی جزئی مسئلہ کی تحقیق میں صرف کرتے رہتے تھے اور لوگ فرائض
 ملکی و خانگی سے غافل ہو ہو کر راہبانہ ریاضتوں میں تصنیع وقت کرتے تھے تاہم اس سے

انکار نہیں ہو سکتا کہ پھر بھی مذہب کے اثر سے بہت سے فوائد مترتب ہو رہے تھے۔ ایک
یہی فائدہ کیا کہ تھا کہ ہزار ہا آدمیوں کو جو دشمنوں کے تائے ہوتے تھے۔ خانقاہوں میں
ایک امن و سکون کی جگہ مل جاتی تھی اور جنگ و جدل کی ہنگامہ آرائیوں میں کم از کم کچھ لوگ
تو یکسوئی و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یا پھر دنیا پرستی کے غوغائے عام میں جب و
اکسی مشہور بزرگ کی زیارت کے مشتاق ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے توقعات
و دستنما کی ایک صورت تو انہیں بہر حال نظر آتی تھی۔ اس وقت دنیا کی بسود و فلاح ہی
میں تھی کہ کلیسا کی عمارات و جائیدادیں استرام و شرف کے پردہ میں ہمیشہ محفوظ رہیں چنانچہ
ان سے بے ادبی کرنے والوں کی غیبی سزاؤں کے جو افسانہ مشہور تھے۔ وہ کوئی خالی از
مصلحت نہ تھے۔ اسی طرح مذہبی شیش اور تواروں کے جو دن مقرر تھے۔ ان کا ہونا بھی
بہت اچھا تھا کہ ان دنوں اسی بہانہ سے غلاموں اور خادموں کو چھٹی مل جاتی تھی۔ اتوار
روز تعطیل منانے کا دستور اگرچہ شروع سے چلا آتا تھا۔ لیکن اب اس پر اور زیادہ زور
دید گیا کہ یہ روز صرف عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ قسطنطین نے یہ قانون نافذ کر دیا
تھا کہ اتوار کو بجز زراعت کے اور کسی قسم کا کام غلاموں اور خادموں سے نہ لینا چاہیے۔
تھیوڈوسیوس نے ملاعب عامہ کی بھی ہمانت کر دی تھی۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا نے اسے اور
زیادہ اہمیت دیدی اور بیسیوں افسانہ اس مضمون کے شائع ہو گئے کہ جن لوگوں نے
یکشنبہ کا روز دنیوی مشاغل میں صرف کیا ان پر عجیب عجیب مصیبتیں اور بلائیں نازل ہوئیں
خیر و خیرات کا رواج حد سے زیادہ تھا۔ بلکہ بعض فرماں رواؤں کے سوانح زندگی تو بجز
اس کے اور کچھ معلوم ہی نہیں کہ انہوں نے فلاں فلاں فیاضیاں کی ہیں۔ خود پادریوں
کی جماعت میں اگرچہ بڑی تعداد و باشوں کی ہوتی تھی۔ تاہم اسی زمرہ میں بعض بعض حقیقی
متقی بھی گزرتے ہیں۔ قیدیوں کو قادیہ دے کر چھڑانا یہ ان کا خاص شیوہ تھا۔ چھٹی صدی میں
پیرس کا ایک پادری سینٹ جرمن اس باب میں خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتا تھا چنانچہ

جب اُس کا انتقال ہو گیا تو بہتے امیروں نے اُس وقت اُس کی نعش سے دعا کی کہ ہمیں رہا کر دیئے۔ اس نعش اس قدر بھاری ہو گئی کہ کسی طرح اٹھائے نہیں اُٹھتی تھی آخر کار جب اُن قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ تب کہیں جنازہ اُٹھ سکا۔ اس طرح کے افسانہ کا ایک طرف غلط فہمیاں ہیں تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی سادگی کے لحاظ سے سچہ و سچہ بھی ہیں۔ مگر اس دور کا سب سے زیادہ نہیں کارنامہ مشنریوں کی سعی تبلیغ و دعوت ہے پہلے مشنریوں کا سیلاب فلسطین و اٹلی سے رواں ہوا تھا مگر اب اس کا دھارا مغرب کے چل رہا تھا۔ اس میں حتیٰ تقدیم آئرلینڈ کے مشنریوں کو حاصل ہے جنہوں نے پہلے اپنے وطن پھر انگلستان اور پھر وہاں سے باہر نکل کر گال، سوئزرلینڈ، اٹلی و برمن کے دور دراز اقطاع تک اپنی سرگرمی دکھانی شروع کی۔ اس تحریک کا چھٹی صدی کی ابتدا میں آغاز ہوا تھا اور ایک صدی بعد دوسرے ممالک کے لوگوں نے اس کی تقلید شروع کر دی، بالخصوص اہل انگلستان و گال نے۔ چنانچہ مشہور پر جوش اینگلو سیکسن مشنری سینٹ بونیفیس کا دائرہ دعوت و تبلیغ جرمنی تک پہنچ گیا۔ یہ سرگرمی تین صدیوں بعد تک پورے جوش و خروش سے قائم رہی اور اس تحریک کے سہارے پر باوجود ہر طرح کے علمی سیاسی و اخلاقی انحطاط کے لومبرڈی سے لے کر سویڈن تک جو تخم ریزی ہوتی رہی، اُسی نے آگے چل کر تمدن کے برگ و بار پیدا کئے۔

الغرض اگرچہ بحیثیت مجموعی، قرون وسطیٰ یعنی زوال شہنشاہی رومہ سے لے کر شارلمین تک کا زمانہ انتہائی جہالت و ظلمت کا دور رہا ہے تاہم اسی کے پہلو پہلو جدید تمدن کے قصر و ایوان کی داغ بیل بھی پڑ رہی تھی۔ اس تحریک کے اخلاقی نقطہ خیال سے دو عنصر تھے۔ ایک مسیحیت میں عسکریت کی روح کا پیدا ہو جانا۔ دوسرے دینیوں کے مناصب میں تقدس و احترام کی آمیزش آئندہ دو فصلوں میں ہم انہیں دونوں چیزوں کو کسی قدر کھول کر بیان کرتے ہیں۔

فصل (۱۵)

کلیسا میں عسکریت کا آغاز اور نشوونما

یونانیوں کا قول تھا کہ دیوتاؤں کو اپنی نذر و نیاز کے لئے جس قدر مال غنیمت پسند ہے اتنی اور کوئی شے مرغوب نہیں۔ شروع شروع میں عسکریت کا اصول و دستور العمل اس بالکل مخالف بلکہ متضاد تھا۔ چنانچہ ابتدا میں عسکریت کا یہ قانون تھا (جیسا کہ پیشتر ذکر چکا ہے) کہ کسی مسیحی کو مسلح نہ رہنا چاہیے اور سپاہی جنگ سے معاودت کے بعد حصول برکات میں کبھی شرکت نہیں کر سکتے تا وقتیکہ ایک مدت تک توبہ و استغفار نہ کر چکیں۔ ہفتیاں شروع کی ایک زبردست جماعت نے جس کے ارکان کلیمنٹ آف الگزنڈریا، ڈیوڈین آریجن، لیکٹینیئس، وکیل ہوئے ہیں یہ حکم لگا دیا تھا کہ مسیحی کے لئے ہر قسم کی جنگ میں شرکت ناجائز ہے۔ چنانچہ اسی فتوے پر عمل کر کے میکزیملینیس نے ڈیوڈ کلیٹین کے زمانہ میں بحیثیت سپاہی کے شرکت جنگ سے انکار کر دیا اور بالآخر اسی جرم میں اسے مرتبہ شہادت نصیب ہوا۔ بلکہ بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہ مسئلہ ایک بڑا سبب تھا۔ ڈیوڈ کلیٹین کی تعدیوں کا بہت پرستوں کی طرف سے عسکریت پر یہ ایک الزام تھا (جسے مسیحی متکلمین صاف تسلیم کرتے تھے اور علانیہ اس کا اعتراف کرتے تھے) عسکریت سپاہیانہ زندگی کے بالکل منافی ہے۔ گو اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مسیحیوں کی دُعا، سپاہیوں کے آلات حرب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا لیکن بائیں ہمہ شروع ہی سے کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو باوجود مسیحی ہونے کے فوج میں بھرتی ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ ڈیوڈ کلیٹین کی تعدیوں کا اصل ہدف مسیحی سپاہی ہی بنے تھے اور قسطنطین کے زمانہ میں تو سپاہ کا بڑا حصہ مسیحیوں پر مشتمل ہو گیا تھا۔ اسی

عہد میں ایک انجمن کلیا نے یہ فتویٰ شائع کیا کہ جو مسیحی سپاہی شرکت جنگ سے انکار کرتے ہیں وہ نمک حرامی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور سینٹ آگسٹائن جیسے ذی اثر شخص نے اس کی تائید کی۔ مگر باوجود اس کے کہ فوج میں داخلہ اب حرام نہیں رہا تھا۔ تاہم مذہبی حلقوں میں اسے پسندیدگی سے اب بھی نہیں دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ مسیحی و مشرکانہ تخیل اختلاف ہی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مشرکوں کا طمع نظر وطن تھا اور ان کے نزدیک وطن پرستی و پسگردی ربدۃ الفضائل تھے۔ بخلاف اس کے مسیحی نصب العین ثواب آخرت تھا اور اس نقطہ خیال سے ترک دنیا اور رہبانیت کو اس الحسنات کا مرتبہ حاصل تھا چنانچہ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں جو انان صالح کی تعداد کثیر برابر فوج سے منتقل ہو کر زاہد و زاہبوں کی صف میں شامل ہوتی جاتی تھی۔

پہلی شے جو مذہب و عسکریت کے درمیان مصالحت کا باعث ہوئی وہ یہ عقیدہ تھا کہ ہر دنیوی معاملہ براہ راست کسی مداخلت غیبی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی تمام قومی مصیبتیں کفر یا فسق و فجور کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کے مقابلہ میں جاہ و ثروت امارت و حکومت غرض ہر دنیوی خوشحالی خوش اعتقادی و نیک عملی کا انعام ہوتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر جنگ میں فتح و کامیابی بھی انہیں لوگوں کو حصہ آسکتی تھی جو با ایمان و خوش اعمال ہوں۔ چنانچہ ہزار ہا اشخاص نے اسی لالچ میں اصطبلغ لے لیا۔ خود قسطنطین کے لئے تو قطعاً اور کلودی کے لئے غالباً یہی محرک قبول مسیحیت کا تھا اور بربروں پر تو یہ محرک جس بڑی حد تک موثر ہوتا تھا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ پھر جب کچھ روز میں قسطنطین کو خواب میں فتح کی بشارت ملنے لگی جب صلیب فوج کے علم پر آویزاں کی جانے لگی اور صلیب کی کیلیں اٹھا ڈال کھاڑ کر تبرک کی طور پر زرہ و خودیں لگائی جانے لگیں تو مذہب و عسکریت کا اتحاد ایک بالکل غیر مخفی حقیقت بن گیا۔

اس تحریک عسکریت کی رفتار کو بعض خارجی واقعات نے اور تیز کر دیا مثلاً ایک

بڑا سبب یہ ہوا کہ شمال کے جنگجو قبائل تعداد کثیر میں مسیحیت قبول کرنے لگے۔ تبدیل مذہب سے ان کی سرشت کیونکر بدل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی جنگجوئی کو اس نئے مذہب میں بھی داخل کر دیا۔ ایک طرف یہ ہوا اور دوسری طرف بہتے راہبوں اور پادریوں نے زمانہ کی نزاکت کو دیکھ کر جبورا فوج کشی میں اپنے متبعین کی قیادت و سرکاری شروع کر دی۔ مگر ان سب اسباب سے بڑھ چڑھ کر جو مذہب مسیحیوں میں حکمرانیت کی رُوح پھونکنے کا ہوا وہ اسلام کی تقلید تھی کہ اسی نے درحقیقت مسیحیوں کی سی نرم و انشتی سرشت جماعت کو محاربات صلیبی کا پُر جوش مجاہد بنا دیا۔

اس عظیم الشان مذہب نے جو اتنے عرصہ تک مسیحیت کا مد مقابل رہا ایک زمانہ میں دنیاے مسیحیت کے دلوں پر اپنی شدید ترین ہیبت بالکل سجا طور پر بٹھا دی تھی۔ اس نے بغیر اصرام و تماشیل کی مدد کے اور بغیر عبد و معبود کے درمیان اشتخاص متوسط کا سلسلہ قائم کئے لجاہلوں اور بربروں کے سامنے خالص ترین توحید اور بحیثیت مجموعی اعلیٰ ترین نظام اخلاق کی تعلیم پیش کی اور اپنے متبعین کے قلوب میں وہ بوش خلوص و انہماک پیدا کر دیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ اس نے اس حقیقت اہم سے واقف ہو کر کہ نجات کو محض ایمان پر منحصر کر دینا نفس بشری پر خصوصیت کے ساتھ موثر ہوتا ہے اس عقیدہ کو مسیحیت سے اخذ کیا اور جنت کے جہان فی لذائذ و نعائم اور جہنم کے مادی آلام و شدائد اس جزئی تفصیل سے بیان کئے کہ تاثر بہت نفوس کا متحیلہ ان سے بالکل مسجور ہو کر رہ گیا۔ اس مذہب نے جو صحیفہ ربانی پیش کیا وہ گوانجیل کے مقابلہ میں کتنے ہی کم تر درجہ کا ہوتا ہے صدیوں تک لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے اس سے تسکین و تسلی حاصل کی ہے۔ اس کی ایک خالص تعلیم مسئلہ تقدیر ہے۔ جس نے گو آج پیر و ان اسلام کے قولے عمل کو شل کر رکھا ہے۔ تاہم اول اول اس کا یہ اثر نہ تھا۔ بلکہ قرون اولیٰ میں اسی عقیدہ نے مسلمانوں کو جرأت و شجاعت کا جسمہ بنا دیا تھا۔ اور خیر یہ چیزیں تو تھیں ہی

سب سے بڑھ چڑھ کر اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جہاد (یعنی مقاتلہ کفار) کو اس الفضائل
 کے درجہ پر رکھ دیا۔ اسے اولین فریضہ مذہبی قرار دیا اور مجاہد کو قطعاً جنتی ہونے کی
 دستاویز دیدی۔ یہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں برگزیدگی و سپہگری کے ڈانڈے
 مل گئے اور پیر و ان محمد میں وہ عظیم النظیر جوش پیدا ہو گیا کہ اپنے نبی کی وفات کی اس
 صدی کے اندر ہی انھوں نے مشرقی حکومتوں کو مسخر کر لیا۔ مسیحیت کو اس کے وطن
 اصلی سے تقریباً خارج البلد کر دیا۔ ان کا پرچم ایشیا و افریقہ سے لے کر اسپین
 تک لہرانے لگا۔ بلکہ اگر چارلس مارٹل نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو قریب تھا کہ وسطی یورپ
 کی حکومتیں بھی ان کے زیرِ تیغیں آجائیں۔ یہاں اس امر پر قیاس دوڑا کہ تحصیل صل
 ہو کہ یہ یونینِ نسلِ کاتوئیں جن کے اوپر موجودہ تمدن کی ترقی کا اس قدر دار و مدار رہا
 ہے۔ اگر اسلام کے زیرِ نگیں آگئی ہوتیں تو آج تمدنی زندگی میں کیا کیا انقلابات
 ہو گئے ہوتے۔ ہم صرف واقعات کو دیکھتے ہیں اور واقعۃً اسلامی فتوحات کے
 اثر سے عملاً ابنائے مسیحیت میں ایک انقلاب تو ہو ہی گیا اور وہ یہ ہوا کہ اسلام کی
 جنگی و عسکری ریح رفتہ رفتہ مسیحیت میں سرایت کر گئی۔ یہ معلوم ہے کہ بہت مسیحی اللہ
 قویں بالطبع جنگجو و محاربہ پسند تھیں اب جبکہ انھوں نے اپنی حریف جماعت کی جنگجوی
 کے مناظر دیکھے تو اس مثال سے غیر متاثر نہ رہ سکے۔ کچھ یہ اور کچھ اس جوش انتقام سے
 کہ جس نے ہم کو بے خانماں اور ہمارے دین کو بے حرمت کیا ہے ہم بھی اُسے بے خانماں
 اور اُس کے دین کو بے حرمت کر دیں گے۔ ہزار ہا پادریوں نے کلیسا کی بلند یوں سے
 وعظ کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں سے لڑنا فرض عین ہے اور جنت کا راستہ میدانِ
 جنگ میں ہو کر ہے۔ یہ وعظ و صدیوں تک قائم رہا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مسیحیوں میں
 بھی مسلمانوں کے مساوی جنگی جوش پیدا ہو گیا۔ اور اب جب شام کے وقت ایک
 مسیحی صلیب کے سلسلے عبادت کے لئے سر جھکاتا تھا تو جانستے ہو کہ وہ صلیب کیا ہوتی

تھی وہ صلیب تلوار کا قبضہ ہوتی تھی۔

مسیحیت کے اس دوزخِ عکسیت کا اُس کے اُس ابتدائی دُور سے مقابلہ کر دیا جب امن و آشتی، صلح و سکون سے اُس کا خمیر سمجھا جاتا تھا تو اس کی اس انقلابی حالت پر تاسف ہوتا ہے۔ کہاں ایک وہ زمانہ تھا جب مسیحیت سے غایت فقہانِ عکسیت کی بنا پر جنگجو مشرک اقوام اپنے مُردوں کو بجائے لٹانے کے ہمیشہ کھڑا کھڑا دفن کرتی تھیں تاکہ مسیحیوں سے التباس نہ ہونے پائے اور کہاں اب یہ وقت آگیا کہ جنگ و جدل کشتِ خون جزو مسیحیت بن گئے۔

مسیحیت کا اثر جنگ کیا پڑا؟ یہ ایک مہتمم بالشان مسئلہ ہے۔ مگر مختصر ہم اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ

(۱) مسیحیت کے اثر سے مسیحیان قرونِ اولیٰ کی پیشین گوئیوں کے علی الرغم جنگ کا انسداد یا وقوعات جنگ میں تخفیف بالکل نہ ہو سکی۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قسطنطین کے بعد سے کوئی زمانہ ایسا نہیں ملتا ہے جس میں مقتدا یا ان کلیسا نے جنگ کے انسداد کی کوشش کی ہو۔ بلکہ بخلاف اس کے وہ اپنے مبتعین کو ہمیشہ محارباتِ صلیبی پر اکساتے ہی رہے۔ لے دیکے انھوں نے اُن خانگی لڑائیوں کو جنھیں انگریزی میں ”ڈویل“ کہتے ہیں بند کرنا چاہا۔ لیکن یہ بھی اُن کا کوئی خاص احساں نہیں یہ طریقہ مشرکین کے زمانہ میں سرے سے مفقود تھا یا دریوں کے سامنے جاری ہوا اور وہ اسے نہ روک سکے، اب اس کا انسداد ترقیِ تمدن سے خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی حیثیت تو آئمہ مسیحیت نے انسدادِ جنگ میں حصہ لیا نہیں بلکہ یہ بحیثیتِ مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیرہ اسلام کے اور کسی مذہب کے

نام سے دنیا میں اتنا کشت و خون نہیں ہوا جتنا مسیحیت سے ہوا۔ امن و آسشتی کی تعلیمات قدیم تقویم پارینہ ہو گئیں تھیں اور صدیوں تک قتل و خونریزی کے وعظ ہوتے رہے۔ اب آخری زمانہ میں البتہ صلح و آشتی کی تحریک کی پھر تجدید ہو رہی ہے مگر اس تحریک کے بانی محض دنیا دار لوگ ہیں جنہیں مسیحیت کوئی واسطہ نہیں۔

(۲) مگر مسیحیت کے اثر سے جنگ کی وحشت و بربریت میں ضرورت حیرت انگیز کمی ہو گئی۔ اگلے زمانہ میں جنگ مرادف تھی ہر قسم کی اخلاق شکنی و قانون شکنی کے مگر مسیحیت نے اسے بالکل بدل دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کس کس قدر مار کے ہاں بھی اسیران جنگ و مفتوحوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایات ملتی ہیں مثلاً فلاطون نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ یونانی اسیران جنگ کو ایک رقم متعین بہ طور فدیہ لینے کے بعد چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر اس پر عمل ایک آدھ بار سے زائد نہیں ہوا۔ یا مثلاً رومہ میں سرور و مسائٹ نے یہ کہا تھا کہ جنگ کا مقصد ہمیشہ قیام امن ہونا چاہیئے اور اس کے سوا فوج کشی ہر حالت میں ناجائز ہے۔ بلکہ پلینی محض اس بنا پر سیزر کے ساتھ ”اعظم“ کا لقب نہیں استعمال کرتا تھا کہ اُس نے اس قدر خونریزی کی تھی اور مارکس آریلیس تو فاتحین اور رہنوں کو ایک درجہ میں رکھتا تھا میں سپاہیوں کے ہاتھوں عورتوں کی آبروریزی بھی ایک سخت بزم بھی جاتی تھی۔ لیکن مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ ورنہ دنیا کی عام حالت اُس وقت یہ تھی کہ فاتحین کے اوپر کوئی ذمہ داریاں و فرائض عاید نہ تھے وہ ایک غیر مسئولانہ اقتدار کے ساتھ جو چاہتے مفتوحوں کے ساتھ سلوک کرتے اور یہ سلوک کیا ہوتا تھا؛ قتل غلامی یا سستیانی

لے ضمیریت پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ وہاں ایک ہشتاد اس واقعہ سے

مسیحیت نے اگر یہ ورق الٹ دیا۔ اُس نے مفتوحوں کے حقوق قائم کئے۔ پس باب خاص میں مسیحیت کے کارناموں کو ہم عنوانات ذیل کے تحت میں رکھ سکتے ہیں۔
 (الف) اس نے نیانی کا بالکل سد باب کر دیا۔ اور یوں ہزار ہا جانیں بچا لیں۔
 (ب) کچھ روز کے بعد رفتہ رفتہ اس نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ مسیحی اسیران جنگ تو کسی حالت میں بھی غلام نہیں رہ سکتے ہیں اور غیر مسیحی اسیران جنگ فدیہ دے کر رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔

(ج) قدما کے ہاں سپاہیانہ زندگی کا جو تخیل تھا وہ بالکل درشتی اور کھڑے پن کا تھا مسیحیت نے اس تخیل میں نرمی لینت و خلق و آدمیت کی آمیزش کر دی۔ اور مسیحی سپاہی کے لئے یہ وصف امتیازی قرار پا گیا کہ وہ نہ صرف شجاع و دلیر ہوتا ہے بلکہ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم کرتا ہے۔ اور مفتوحوں سے بہ حسن سلوک پیش آتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) یہی کیا جاتا ہے کہ اگر اس اخلاق فطری ہوتا تو مختلف قوموں میں اسیران جنگ کے ساتھ مختلف برتاؤ نہ ہوتے۔ لیکن ہم اس قسم کے تمام اعتراضات کی جڑ پہلی جلد کی فصل اول میں کاٹ چکے ہیں۔ جہاں ہم نے تفصیل سے یہ بتا دیا کہ انسان میں نفس ضعیف تو فطرۃً اور خود غرضی و نفع اندوزی کے حص سے متمایز و ممتاز موجود ہوتا ہے۔ لیکن یہ مادہ فطرۃً و دبعثت میں ہو تا کہ اس کا رخ کس سمت کو رکھنا چاہیے اس کا تین تین گروہ پیش کے حالات اور ماحول کے اثرات پر ہے۔ چنانچہ عالم تو خوش و بربریت میں انسان یہ سمجھتا کہ اُس پر صرف اُس کے خاندان و قبیلہ کے حقوق ہیں اور بس۔ اسی بنا پر وہ غیر قبیلہ کے لوگوں کے قتل کو اُسی قدر غیر معیوب نہ ضرر سمجھتا ہے جتنا جانوروں کے شکار کو البتہ جب تمدن و روشن خیالی کے اقتضات اُس کے خیالات میں وسعت آتی ہے تب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ نوع انسان کے بھی کچھ حقوق اس کے اوپر ہیں۔

فصل (۱۶)

دنیوی مراتب کا مذہبی احترام

عسکریت کے علاوہ دوسرا نیا عنصر اب مسیحیت میں یہ بڑھا کہ دنیوی مراتب کا مذہبی احترام ہونے لگا۔ یہی وہ شے ہے جس نے آگے چلکر کبھی رعایا سے امراء کی غلامی کرائی اور کبھی بادشاہ کو ظل اللہ کا لقب دلوا دیا۔ گزشتہ صفحات سے معلوم ہی ہو چکا ہے کہ رومی شہنشاہی کی طبعی رفتار شہنشاہی اقتدار کی جانب تھی، آگٹس کے بپتی ابتداء کی جگہ ڈیوگنیس کے استبداد نے لی تھی سینٹ کی حیثیت مجلس ملازمان سرکار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی اور ریڈیہ کے ساتھ ساتھ رومی حریت کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہ انقلاب حالات کیوں ہوا؟ یہ کوئی ایسا غامض مسئلہ نہیں۔ یہ فطرت بشری کا اقتضا ہے طبعی ہے کہ استبداد جہاں ماتریت یافتہ ولایت دماغ قوموں کے حق میں بہترین نظام حکومت ہے، وہاں تمدن و تعلیم یافتہ جماعات کی زندگی کے لیے یہ ایک مرض ہے، اور مرض ہی کیسا؟ سخت اور معتدی جب تمدن مذہب جماعتیں ایک مرتبہ سیاسی غلامی کے پھندے میں آجاتی ہیں تو ان کی رگ رگ میں استبداد کی روح حلول کر جاتی ہے، بلند جو صعلگی و خواہش حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور انحطاط و انحلال لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ اقوام مثل افراد کے ذی حیات ہوتی ہیں۔ حرکت ان کا لازمی خاصہ ہے۔ اگر یہ حرکت ترقی کی طرف نہ ہوگی تو انحلال و تنزل کی طرف ہوگی۔

اس خاص انقلاب کی تشکیل میں مسیحیت کا کچھ ایسا اثر نہیں ابتدا میں اس کی سیدھی دہائی تعلیم یہ تھی کہ امور دنیوی میں عالم دقت کی بیچون و چرا تا بعد اری کر دو، اور امور مذہبی میں کی دست اندازی کو بالکل گوارا نہ کر دو۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ نقطہ خیال بدل گیا۔ قسطنطین کے

بعد ان کی خالص بے آمیز مذہبیت مدہم پڑ گئی۔ البتہ اُس کی جگہ پایا یاد و اجارہ نہ خود غرضوں نے لے لی۔ اب ان کا اصول یہ قرار پایا کہ اگر کوئی تاجدار کلیسا کا ہمدرد ہو تو فرشتہ ہی، اور اگر مخالف ہو تو شیطان ہو، اس سے بالکل قطع نظر کر کے کہ فی نفسہ اس کی سیرت و اخلاق کیا ہے مثلاً ایک شاہ قسطنطین ہی کو لیجئے جس کے اصل اخلاق کا اندازہ ایک اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قبول مسیحیت کے بعد اس نے بہ کمال وثقات و سفاکی اپنی بیوی لڑکے اور بھتیجے کو قتل کر ڈالا۔ مگر پادری پولیس اُس کی مدح و ثنائیں استعد رطب اللسان نظر آتا ہے کہ گویا وہ طفل اللہ تھا۔

اس نقطہ خیال کے سبب بہتر نظائر دو بالکل مختلف سیرتوں کے تاجدار جولین و فوکس کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ جولین کی خانگی زندگی بیلغہ تھی، رواداری آگے خمیر میں تھی، اور اُس کی طرزِ فکرانی بالکل حکیمانہ انداز کی تھی، تاہم چونکہ کلیسا کے ساتھ اُس کا سلوک اچھا نہ تھا، اس لیے وہ ہر طرح کے سب و شتم کا ہدف بنا رہا۔ یہاں تک کہ جب اپنے ملک کی حمایت میں وہ میدانِ جنگ میں کام آیا، تو اُس کے مارنے کے بعد بھی بدگوئیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُس کی موت پر تاسف کیا معنی، اس پر اظہارِ مسرت و شادمانی کیا۔ اس کی شجاعت، جانبازی و وطن پرستی میں سے کوئی شے اس کی شمعِ نوکی، متعدد مقامات پر مسیحیوں نے ٹھٹھروں اور گرجاؤں میں جمع ہو کر، اُس کی موت پر خوب جشن کیے۔ اور سینٹ گرگوری اعظم نے اپنی پیغمبروں میں جی کھول کر اُسے کوسا، اور اس پر اظہارِ انوس کیا کہ اس کی نعش دفن کیوں ہو گئی، وہ تو اس قابل تھی کہ مرید میں پینک دیجاتی، بلکہ اُس زمانہ کے بعض مشرکوں کا تو یہ بیان تھا کہ جولین ہمارے ہاتھ سے قتل نہیں ہوا، بلکہ اسی کے فوج کے کسی شخص نے اُسے مار ڈالا۔ یہ الزام اگرچہ کوئی بنیاد نہیں رکھتا، تاہم مسیحیوں کو اس کے تسلیم کرنے میں کچھ غار نہ تھا۔ وہ عذاری اور کوئی کی اس روشن تصویر کو میوب ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کی اُفتیت کو تسلیم کر کے اُس کے جواز بلکہ استحقاقِ کُناہت کرتے تھے۔

ایک سی مورتی کتا ہے کہ

”لیبا نہیں نے یہ دعویٰ کیا ہر کہ بادشاہ کسی عیسائی کے ہاتھ سے قتل ہوا،
اور یہ دعویٰ غالباً صحیح ہے۔ یہ بالکل قرن قیاس ہے کہ خود رومی فوج کے کسی
شخص نے اُن قدامت کی تقلید کی ہو جو ملک قوم کی حریت کے خاطر اپنے
مستبد فرماؤں و اُنوں کو ہلاک کر ڈالتے تھے۔ توجہ ملک قوم کی حمایت میں
بادشاہ کشتی قابلِ ملامت نہیں توجہ اسیت دین حق میں لے کون معیوب
کہہ سکتا ہے؟“

ایک طرف توجہ لین کے ساتھ یہ سلوک تھا۔ دوسری طرف تو کس کی وہ اُدبھگت نشا
وصفت تھی کہ گویا وہ خدائی کے درجہ پر تھا، حالانکہ قسطنطنیہ کے تحت پرشاید اس سے زیادہ
ذلیل اخلاق کا کوئی شخص نہیں بیٹھا ہے۔ گمرات کیا تھی کہ یہ ہر وقت گرجاؤں کی نشت پناہی پر
مستعد رہتا تھا، اور اسی کے صلہ میں اس کی یہ ساری قصیدہ خوانی تھی۔ یہ ابتدائی بہت حالت
سے ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن بیٹھا۔ اور سلطان جلیز شاہ مارس کو مغرول کر دیا۔ اس کے
بعد اس نے شاہ مغرول کو مع اُس کے پانچویں بیٹوں کے اپنے سامنے پابزنجیر بلایا، اور جب لاد
کو حکم دیا کہ ان سب لڑکوں کی ان کے باپ کے اکھنوں کے سامنے گردن مارے شاہ بازر
کے صبر و ضبط کی یہ حالت تھی کہ یکے بعد دیگرے اپنے سب بیٹوں کو قتل ہوتے دیکھتا تھا، او
زبان سے یہ کہتا جاتا تھا کہ ”اکی تیرا نام عادل ہے۔ تو عدل و انصاف ہی سے فیصلہ کرتا ہے،“
چار لڑکے اسی طرح قتل ہو چکے تھے کہ جب پانچویں لڑکے کی جو بالکل خور و سال تھا باری آئی
تو اُس کی دایہ نے نکال شفقت اُسے چھپا کر اپنے لڑکے کو لگے کر دیا۔ مگر مارس بے اختیار
پچھڑا اٹھا کہ اس معصوم کو کیوں مارتے ہو، یہ میرا لڑکا نہیں۔ چنانچہ بالآخر وہ پانچواں لڑکا بھی تیغ
کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر چونکہ مارس نے پایا یا نہ اقتدار کو توڑا تھا، اس لیے اُس کی یہ تمام
منظومیت و سبکی غیر موثر رہی، اور ہر طرف سے حیوان سیرت و سفاک فوکس کی واہ داہن ہوتی
رہی۔ بلکہ سینٹ گرگوری نے شاہ فوکس اور اس کی ملکہ کو نہایت مبالغہ آمیز تہنیت نامہ لکھے

جن میں یہ تک تحریر کر دیا کہ آپ کے کارناموں پر آسمان وزمین فخر و مسرت کرتی ہیں اور ان دونوں کے بت پرستش کے لیے رکھوئے کا حکم دیدیا۔

مگر واقعات کی یہ رفتار مشرق و مغرب دونوں جگہ بالکل یکساں نہ تھی، بلکہ ایک زمانہ تک ان میں کافی اختلاف رہا۔ مشرق میں قسطنطین نے بالکل مشرقی تنزک و احتشام اختیار کیا، اور اپنی ایسی دھاک بٹھائی کہ سارے اہل کلیسا اس سے مرعوب ہو گئے اور اس وقت سے مشرقی کلیساؤں کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا، لیکن مغرب میں کلیسا نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا، اور کئی پادریوں نے یہی نہیں کہ شاہی اشاروں پر چلنے سے انکار کر دیا بلکہ متعدد مواقع پر علانیہ شاہی احکام کی مخالفت کرتے رہے۔ روم سے شہنشاہانہ دار الحکومت کے قسطنطنیہ منتقل ہو جانے سے وہی پادریوں کے اقتدار و مطلق العنانی میں اور اضافہ ہو گیا، کہ اب اس مشہور قدیم تاریخی شہر میں کجبر ان کے اندر کوئی صاحب اقتدار رہ ہی نہیں گیا تھا۔ اب وہ میں حکمران طبقہ جو تھوڑے برسوں کا تھا، جو فوجی طبیعت کے آدمی تھے، انھوں نے بارہا شاہانہ تحکفات و تنزک و احتشام کی نقل کرنا چاہی مگر اسے نباہ نہ سکے، اور اپنا کوئی خاص اثر و اقتدار نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ گال میں دو دہائیوں کا خاندان کے سلاطین کا یہ حشر ہوا کہ چند روز کے بعد سارا اقتدار شاہی محل کے داروغہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ سلاطین برائے نام حکمران رہ گئے، ورنہ دراصل سیاہ و سفید کے مالک یہی داروغہ ہو گئے۔

اس صورت حال سے بادشاہ پرستی یا بادشاہ کی نیابت الہی کا مسئلہ کیونکر پیدا ہوا؟ اس کی سرگزشت گوعام طور پر معلوم ہر تاہم مختصر اہم ہی بیان کیے دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی میں شاہ لیبو نے چاہا کہ کچھ جاؤں سے بت بالکل اٹھا دیئے جائیں تاکہ شرک کا احتمال باقی نہ رہے۔ قسطنطنیہ کے پادریوں نے اس کی کچھ مخالفت کی، مگر بالآخر شاہی اقتدار کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن پاپائے روم نے اس کی پُر زور مخالفت کی، اور جب دیکھا کہ بادشاہ اپنی ضد سے باز نہیں آتا، تو خود اس کے ارتداد کا فتویٰ دیا، اور اس طرح اٹلی بالکل

خود مختار ہو گیا۔ اس کارنامہ جرات سے پایا کے اقدار و نفوذ کو چار چاند لگ گئے۔ اب وہ سارے دنیا کے مسیحیت کا رہبر و محافظ تسلیم کیا جانے لگا۔ لوگ بحیثیت اٹلی کے نجات دہندہ کو اس کی بے حد تعظیم کرنے لگے اور نظام خاندانیت جس کی شاخیں گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھیں، صدر تو وہ پہلے ہی سے مسلم تھا۔ پھر اس نے اپنی اس مستحکم عظیم کے موقع پر جس مقامات، وقار و عالی ظرفی سے کام لیا، اُس نے اس کی عظمت کا سکھ اور بھی لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔

لیکن ایک بڑا خطرہ اب بھی باقی تھا، اور وہ لومبرڈی کے بربری حکمرانوں کی طرف سے تھا، ان کے پہلے ایک آدھ فرماؤں اور توپا پیا نے جبروت و مظنہ سے ذرا دب گئے تھے، لیکن موجودہ تاجدار اسٹولفس کسی کو خاطر میں لانے والا نہ تھا، اس کی طرف سے پایا کو ہر وقت دھک لگتا رہتا تھا، اور خود پایا کی جنگی قوت اس کے مقابلہ میں شہمہ برابر بھی نہ تھی۔ اور اگر رومہ کی بقا و بقا نظر تھی تو خارجی استعانت گزرتی تھی۔ ایسی حالت میں پایا نے سب سے پہلے قدرتی طور پر جارجس ماریل سے استدعا، امداد کی کہ اسی نے یورپ کو مسلمانوں کے قبضہ سے بچایا تھا مگر اُس نے ادھر ذرا توجہ نہ کی، بلکہ خوش اعتقادوں کے نزدیک اسی جرم کی پاداش میں اس کی موت ہوئی۔ اور بعد موت۔ واصل جہنم ہوا، اس کی فات پر پایا نے اس کے فرزند و جانشین پاپا کی طرف رجوع کیا۔ اس نے کچھ تو ہوس ملک گیری اور کچھ اپنی بڑی ہوئی خوش اعتقادی کی بنا پر اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اس میں اور پاپا میں ایک معاہدہ ہوا جو آئندہ تاریخ پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے یہ عہد کیا کہ پایا کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکھیں گے۔ اور پاپا نے یہ عہد کیا کہ اسے وہ مذہبی حیثیت سے تخت نشین کرے گا جو بخین خاندان کو معزول کر کے اسے ملک کی حکومت مذہبی حیثیت سے اُس کے ہاتھ میں آجائے گی۔

فریقین میں سے دونوں نے اپنے اپنے شرائط کو پوری طرح پورا کیا۔ ادھر پاپا نے وہ مرتبہ فوج کشی کر کے پاپا کو اُس کے دشمنوں سے مستقل طور پر نجات دلا دی، اور خود اُس کے تفویض ایک ایسا کر کے اسے پہلی مرتبہ ملکی حیثیت سے بالکل خود مختار کر دیا۔ اور پاپا نے

خاندان مروغین کی مغزولی کے بعد پین کو سارے گال کا فرما دے غیر مسئول بنادیا تخت نشینی کے بعد خود اپنے ہاتھ سے اُس کے سر تاج رکھا اور یہ فتویٰ دیدیا کہ یہ نائب خدا ہی جو شخص اس کے یا اس کے ورثا کے احکام سے سر تاج کرے گا وہ خلیفۃ اللہ سے بغاوت کرے گا۔ اس واقعہ کا ظاہری پہلو تو یہی تھا کہ ہر دو فریق اپنی اپنی جگہ پر شاد کام رہے۔ لیکن حقیقت تاریخ پر اس کا وسیع مستقل اثر یہ پڑا کہ ایک طرف پایا گو سلاطین کے عزل و نصب کا اختیار حاصل ہو گیا، جس نے آگے چل کر بڑے بڑے اثرات پیدا کیے، دوسری طرف سلاطین کی نیابت و خلافت الٰہی مستلزم ہو گئی یہ حیثیت مشرک سلاطین نے بھی اپنی رعایا کی زبان سے کہلا کر پیدا کرتی چاہی تھی۔ مگر ظاہر یہ کہ اس کو اتنا استحکام نصیب نہیں ہو سکتا تھا جتنا پایا کی زبان سے ان الفاظ کے نکلنے سے ہوا۔

مگر یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس قدر متہم باشان مسئلہ محض ایک اتفاقی واقعہ کا معلول نہیں ہو سکتا۔ پایا کا فتویٰ اگرچہ بجائے خود نہایت قوی اور موثر تھا، تاہم اُس کی تائیدیں کچھ اور دلائل بھی تھے، جب جا کر نیابت و خلافت الٰہی کا مسئلہ دلوں میں راسخ ہو سکا۔ یہ خاص تائیدی موثرات ہمارے نزدیک یہ دو تھے:-

(۱) اول تو نظام خانقاہیت۔ خانقاہیت رہبانیت کی بنیاد ہی نفس کشی خود فراموشی، تذلل، انکسار، فروتنی پر مبنی، اور چونکہ تعلیم و تربیت دلیہ پر مبنی تھی انہیں خانقاہ نشینوں رہبوں کے ہاتھ میں ملت سے چلی آتی تھی، اور انہیں کے تربیت دادہ آگے چل کر مدبرین مملکت و ضمیر قانون ہوتے تھے، اس لیے جذبات مذکور کی بنا پر ملک کی خود داری و حریت پہلے ہی رخصت ہو چلی تھی، اور اس عقیدہ کو قبول کر لینے کے لیے وہ تیار ہو چکا تھا۔

(۲) دوسرے نظام جاگیر داری۔ پہلے صرف رعایا و سلطان ہی حاکم و محکوم کے دو طبقہ تھے لیکن اب کچھ عرصہ سے جاگیر داروں معافیوں کا دستور نکلا تھا، یعنی بادشاہ، کچھ حصہ ملک کا اُمرا سلطنت کو بطور جاگیر و معافی کے دیدیتا، یہ لوگ اپنے متوسلین کو جاگیر دیتے، اور وہ پھر اپنے متوسلین کو۔ اس نظام کا یہ اثر ہوا تھا کہ ہر شخص اپنے آقا کو براہ راست اپنے سے

قریب پاتا تھا، اور اس طرح بھی خود داری و مطلق العنانی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کاشتکار اپنا آقا پٹی اور کسمپوش پٹی دار زمیندار کو، اور زمیندار خود بادشاہ کو۔ غرض اس طرح کوئی شخص آزاد و خود مختار نہیں رہ گیا تھا۔

لیکن یہ سب چیزیں مل کر بھی اس عقیدہ کی عام اشاعت کے لیے کافی نہ تھیں۔ عوام پر قبضہ اثر حال کا ہوتا ہی، قال کانیں ہو سکتا۔ اُن کے لیے زبانی تعلیم و ہدایت بالکل ناکافی ہی تھی۔ تعلیم علی نمونہ موجود نہ ہو۔ خود رہبانیت کی اشاعت جس وقت و ارشاد سے اُس وقت تک ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔ جب تک اس کی تائید میں بعض راہبین عظام کے نمونہ اور زندگیاں دنیا کے سامنے نہ پیش کی جا چکیں۔ یہ ضروری ہے کہ شروع میں زبانی تعلیم و ہدایت لازمی ہوتی ہو تاکہ لوگوں کو توجہ ہو، اور بعض یوں تیاری کیے ہوئے کوئی بڑا شخص پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن پھر اشاعت عام بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی بڑا علمی نمونہ پیش نظر نہ ہو، کہ عوام کا متخیلہ صرف علی نمونہ ہی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عقیدہ زیر نظر کا ایک علمی نمونہ بھی بالآخر پیدا ہو گیا، اور وہ شارلمین تھا۔

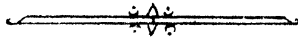
شارلمین حقیقہً رجال عظام میں سے گزرا ہی۔ تاریخی حیثیت سے بھی، اور اساطیر مذہبی کے نقطہ خیال سے بھی، گو ان دونوں کے حدود بالکل علیحدہ اور باہم مختلف ہیں۔ تاریخی حیثیت سے دیکھئے تو یہ شخص عجیب جامع و ہمہ گیر دماغ کا تھا۔ مذہب، علم، معاشرت، سیاسیات، ہر صیغہ میں اس نے کافی اصلاح کی، باوجود متعدد اسباب مخالف، و نامساعدت زمانہ کے اس نے نہ گرد پیش کے برابر اقبال پر بار بار بذات خود فوجبندی کی، انہیں شکست پر شکست دی، سلطنت کی رونق و شان میں اضافہ کیا، بہت سے مفید قوانین وضع کیے، اہل کلیسا کے ساتھ احسانات بھی کیے، مگر ہمیشہ انہیں اپنے انکار پر چلایا، تعلیم کی اشاعت و تحفظ میں سسر گرمی دکھائی، درگاہیں اور کتب خانہ قائم کیے۔ اپنے گرد و پیر کے بھروسے علماء و فضلاء کا مجمع رکھا، ملک کی تجارت کو فروغ دیا، انجمن کی اصلاح کی، غرض کوئی صیغہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے مفید خدمات انجام نہ دی ہوں، اور پیشیت مجموعی اُس کے کارناموں نے نہایت بڑے متخیلہ کو اقتدار متاثر کیا کہ ہر زبان پر اس کی عظمت کے صد ہا افسانہ بھاری ہو گئے۔

اور جن مانگوں میں پہلے راہبوں نے زاہدوں کی پرستش جاگزیں رہتی ہی ان میں اب وہ جگہ ایک تاجدارِ عظیم کے تخیل نے لے لی۔ رہبانیت کا ناقہ ایشیائی کا اثر اسی وقت سے ماند پڑنے لگا، اور اس کے بجائے جہاد و غزا کو اہمیت و تقویت حاصل ہوتی گئی۔

یہ کارنامہ اگرچہ اس کی تاریخی عظمت کے لیے بالکل کافی تھے، لیکن عوام کا تخیل اس کی ہر شہرت سے قاصر تھا، وہ اس حیثیت سے نہ تھی۔ اس کی بنا ایسی دایات پر تھی، جنہیں تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مثلاً یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شارلمین کی ساری عمر قوم سیکسن سے لڑتے پھرتے گزری، جن کے اوپر اس نے ۴۸۱ء تک حکم کیا، مسلمانوں سے اس نے بہت ہی کم تعرض کیا۔ مدہ لہر میں صرف ایک بار اس سے اور مسلمانوں سے مقابلہ ہوا، وہ بھی بہت چھوٹے پیمانہ پر، اور پھر اس میں بھی اسے ناکامیابی ہوئی۔ مسلمانوں کا زور توڑنے والا اصل میں چارلس ٹاٹل تھا۔ یہ سب تاریخی حقائق ہیں۔ لیکن شہرتِ عالم کی باطل پرستی دیکھو، کہ چارلس ٹاٹل کے سائے کا زمانہ شارلمین کے نامہ اعمال میں لکھ دیے گئے۔ دنیا نے مسیحیت کو مسلمانوں کے پنجے سے آزادی دلانے والا شارلمین قرار پایا۔ اور چونکہ چارلس ٹاٹل اہل کلیسا کا دوست نہ تھا، اس لیے اس غریب کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا، بلکہ یہ عام اعتقاد شائع تھا کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر جہاد و غزا میں گزاری وہ شارلمین تھا۔

شارلمین کا عہد قرون وسطیٰ کے دورِ اول کا خاتمہ، اور مسیحی عیسویت کا بانی تھا۔ اور اسی عہد پر ہم تاریخ ہذا کو ختم کرتے ہیں۔ صفحات گزشتہ میں میں معلوم ہو چکا ہے کہ غلطی سے لیکر شارلمین تک عہدِ بعدِ اخلاقی تخیل میں کیا کیا تغیرات ہوتے رہے۔ ہر زمانہ میں لوگ کن کن چیزوں کو اپنا منہا کے مقصد سمجھتے رہے۔ یورپین طبائع پر رومی سلطنت کے کیسے وسیع اور یونانی تمدن کے کیسے دقیق اثرات ہوتے رہے؛ اور یہ کہ رومانی، فلاطونی، و مصری، فلسفہ اور اخلاق میں کیا تعلقات رہا کیے۔ ہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یورپین مسیحیت کا کیونکر نشوونما ہوا؛ معاشری، سیاسی، قانونی تغیرات اس کی بنا پر کیا کیا ہوئے؛ اخلاق کے شعبہ میں اس نے

کیا کیا اصلاحیں کیں، اور پھر اس میں انخطا کیونکر پیدا ہوا، رہبانیت و عدم رواداری کیونکر پیدا ہوئی، اور بالآخر بربری قبائل کی آمیزش نے اس کی اصلی صفائی و پاکیزگی میں کتنی گندگی پیدا کر دی۔ لیکن خاتمہ سے قبل ایک ضروری باب کا اضافہ لازمی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر جا بجا ضمنی اشارات کیے ہیں، لیکن اس کی اہمیت اس کی مقاضی ہے کہ ایک مستقل باب اس کی مذکور کیا جائے۔ یہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا ہر زمانہ میں کیا مرتبہ (پوزیشن) رہا ہے، اور اس کا اثر مرد و عورت کے اخلاقی تعلقات پر کیا پڑتا رہا ہے۔



باب پنجم

عورت کا مرتبہ

فصل (۱)

انسان کی طرز معاشرت، جب تک بربریانہ و خانہ بدوشانہ رہی اُس وقت تک حالات کے لحاظ سے یہ ناگزیر تھا کہ عورت کا مرتبہ پست ہے۔ اُس وقت کے انسانی مشاغل کی کوئی فہرست تیار کرنا چاہے، تو صرف دو عنوانات کافی ہونگے: جنگ و صیدِ فگنی۔ لڑنا بھڑنا، ایک قبیلہ کا دوسرے پر دھاوا کرنا، حیوانات کا قدم قدم پر مقابلہ کرنا، بس یہی وہ چیزیں تھیں جن میں وہ لوگ تامل مشغول رہتے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس میدان میں عورت مردوں سے بازی نہیں لے جاسکتی تھی۔ عورت کا سب سے زیادہ قوی حصہ یہ اُس کا حسن ہے، لیکن حیوانِ خصلت و حشی انسانوں کو حسن و جمال، رعنائی و نزاکت کے معنی ہی سے کوئی واسطہ نہ تھا، عورت کی زندگی کا اصلی دائرہ عمل، فوجی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی و خانگی زندگی ہے۔ لیکن خانہ بدوش صحرائیوں کے ہاں اپنی خانگی زندگی کا سرے سے کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ اُس وقت عورت کے وجود کے صرف دو مقاصد سمجھے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ مرد کی خدمت گزار بن کرے، دوسرے یہ کہ اُس کے قوائے شہوانی کو تسکین دے۔ اول الذکر حیثیت میں اس کی زندگی غلامی کی انتہائی سختیوں اور ذلتوں کا نمونہ تھی، اور دوسری حیثیت میں اُسے اُن قابل بیان مصائب و آلام کا تحمل ہونا پڑتا تھا جن کا نمونہ آج بھی مادہ جانوروں میں نظر آتا ہے۔ غرض یہ حیثیت مجموعی عورت کی پستی، عالم وحشت و بربریت کا عین اقتضا تھا۔ تاہم اُس وقت بھی وہ جذبات جو لگے چل کر عورت کی عظمت کے عناصر قرار پائے۔ سرے سے معدوم نہ تھے۔ و

موجود تھے، گونا گویا ناممکن صورت میں۔ نخل کی رسم، عفت و عصمت کی خوبی، زنا کاری پر تعزیر، ان میں سے کوئی شے غیر موجود نہ تھی۔ اور عورت کے لیے اپنے جذبات شہوانی پر قابو رکھنا سب سے بڑا وصف امتیازی سمجھا جاتا ہے۔ گو اس کے مقابلہ میں مرد کو بدظنی سے رکھنے کے لیے براہ راست کوئی قانون نہ تھا۔ عام ارتقاء تمدن کے ساتھ، عورت کے مرتبہ میں جو ارتقاء ہوا، اُس کی ابتدائی گزلیاں یہ دو تھیں:-

(۱) رسم خرید از دواج کا انسداد:

(۲) وحدت ازدواج، اور اس کی بنا پر خاندان کی تائیس۔

قدیم ترین زمانہ میں شادی کا طریقہ یہ تھا کہ لڑکی کے والد اور اُس کے آئندہ شوہر کے درمیان ایک قرار داد ہو جاتی جس کی رو سے آخر الذکر اپنے خسر کو ایک رقم معین دیتا، اس کے بعد وہ لڑکی اسکی کینز زر خرید ہو جاتی۔ اور وہ رسم اُس کی قیمت سمجھی جاتی، ہندو قانون کو چھوڑ کر، جس نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ اس سے لڑکی فروخت ہو جاتی ہے، باقی تمام زمانہ میں ایک وقت یہ دستور علم تھا، چنانچہ اسرائیلیوں اور یونانیوں میں تو ردواج کے عام ہونے کی تحریری شہادت موجود ہے۔ رفتہ رفتہ یونان میں اس دستور میں یہ ترمیم ہوئی کہ یہ رسم بجائے لڑکی کی قیمت کے اُس کے ہمیر کے نام سے موسوم کی جانے لگی، یعنی اب اس سے والد اپنی لڑکی کو فروخت نہیں کرتا تھا بلکہ سسرال میں اس کے مصارف کے لیے اپنے پاس سے کچھ رقم دیتا تھا۔ اس ترمیم و ردواج سے عزت نسواں کی تاریخ پر جو جسم اثرات پڑے وہ دو تھے:- ایک یہ کہ عورت کی حیثیت غلامانہ نہیں رہی، بلکہ معاہدہ ازدواج میں اس کی حیثیت بھی ایک فریق کی ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ افراق کے وقت، ارمہ و ولولہ کے قانون کے بموجب اُسے یہ رقم واپس پانے کا استحقاق ہو گیا۔ جرمنی میں اس سے کسی قدر مختلف دستور رائج تھا۔ وہ یہ تھا کہ شادی کے وقت نہ لڑکی اپنے ساتھ ہمیر لاتی تھی نہ داماد اپنے خسر کو کچھ قیمت دیتا تھا، بلکہ شب نخل کی صبح کو شوہر خود بیوی کے ہاتھ میں کچھ رقم دیتا۔ اور یہی رقم اُس کے چکر بھر کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس سے بھی اہم تر تاج، وحدت ازدواج کی رسم سے پیدا ہوئی، جس کی بنا پر یونان کو اپنے پیشرو مشرقی تمدن پر ہمیشہ سے تفوق حاصل رہا ہے۔ اس رسم کو خواہ صمیریت کے نقطہ نظر سے دیکھئے، خواہ افادیت کی عینک سے، اس کی برتری ہر صورت نظر آئے گی۔ کثیرالازدواج قوموں میں نواح کا ہمیشہ شہوت انی سمجھا گیا ہے، یہ خلاف اس کے مغربی قوموں میں محرک عقدناکحت فریقین کی آفت و محبت اور حیات منزلی کی تکمیل رہی ہے، جس سے صاف عیان ہے کہ وحدت ازدواج فی نفسہ کثرت ازدواج سے اعلیٰ، اشرف و افضل ہے، پھر اگر حشیت افادی کو پیش نظر رکھئے۔ تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کائنات میں مذکور اثاث کی مساوات تعداد، مرد و عورت کی مساوات حقوق اور امن و خوش فطی خاندان کو ملحوظ رکھنے کے لیے اس سے بہتر شادی کی کوئی صورت خیال میں ہی نہیں آتی کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تزدوج ہو۔

یونان کے عہد اولیٰ میں وحدت ازدواج کا دستور عام تھا، جس میں شاذ و نادر مستثنیات واقع ہوتے تھے، وہ بھی کسی اہم ضرورت کے وقت جب ملک کی آبادی میں اضافہ ناگزیر ہو جاتا تھا، لیکن اس موقع پر ناظرین کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یونان قبل التاریخ میں جس کی تصویر ہومر کے صفحہ میں ملتی ہے، اور تاریخی یونان میں اس خاص حشیت سے بہت بڑا فرق ہے، درحقیقت یونان قدیم میں عورت کی جو غفلت مسلم تھی وہ اپنی نظیر آپ ہی کمی جاسکتی ہے۔ اور گو تمدن جدید آج غفلت نسواں کے صدمہ مختلف اسالیب بیان اختیار کرے، اور ان میں ہر طرح کا تنوع و تبدل پیدا ہو، تاہم اسکے جو اصول اساسی یونان قبل التاریخ نے مقرر کر دیئے تھے ان میں سرسرو اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ہلڈر داندوگلا کی ازدواجی آفت، پینیلوپ کی وفا شعاری، ایٹس کا جاننا زانہ عشق، انٹی گن کی پدر پرستی، پالینکس کی جاننا زاری، ایجنیٹا کا ملکوتی صبر استقلال، ناسیکا کی عصمت آبی، یہ تمام قدیم یونانی خواتین ایسی گزری ہیں کہ ان پر تفوق کیا معنی، ان کی ہمسری تک دمہ یورپ کی بہتر سے بہتر مثالیں ہی نہیں کر سکتیں۔ کنواریوں کی عصمت شعاری اور بیاہیوں کی شوہر پرستی تو یونان قدیم کی سی کہیں دنیا میں کبھی پائی ہی نہیں گئی۔ شاہسیر کی فہرست میں جب قدر ممتاز نام رجال کے نظر آتے ہیں اسی قدر

خواتین کے بھی ہیں۔ خود جنگ ٹرے، جس نے مذہب یونان کی سرزمین کو انسانی خون سے لالہ زار بنائے رکھا، کیا قہر صرف ایک رشتہ ازدواجی کی بے حرمتی کا نتیجہ تھی۔ لیکن بہاں ان تمام حیثیات سے عورت کی عظمت مسلم تھی، وہاں عورت کی زندگی میں ذلت آمیز غماص صریح موجود تھے۔ شوہر یعنی ناگیاں چاہتا، بے روک ٹوک رکھ سکتا تھا جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں کتنے ہی معزز طبقہ کی ہوں بخت سے سخت برتاؤ کی مستحق سمجھی جاتی تھیں۔ ایک عورت نیڈورا کی بابت عام اعتقاد تھا، کہ وہی تمام دنیوی آفات و مصائب کی جڑ تھی۔ عورت کی پستی مرد کے مقابلہ میں علانیہ تسلیم کی جاتی تھی اور اس پر یہ عجیب غریب طبی استدلال پیش کیا جاتا تھا، کہ قوت ناسل صرف مرد میں ہے، اور عورت عمل تولید میں ایک بہت ہی ادنی حصہ رکھتی ہے۔

یہ یونان قبل التاریخ کا حال تھا۔ تاریخی یونان میں عورت کا قانونی مرتبہ گو کسی قدر بلند ہو گیا تھا، تاہم ساتھ ہی اس کی اخلاقی زندگی میں نمایاں انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ اب باعصمت عورتوں نے بالکل پریشانی اختیار کر لی، اور اس زمانہ سے خواتین یونانی کے مرقع میں جو سب ممتاز و تفریب تصور ہری۔ وہ وہاں کے طوائف کی ہی۔ مردوں کے لیے بھی، اسی زمانہ سے بدچلنی یعوب نہیں ہی کسی ملک کی تاریخ اخلاق میں جن حقایق پر روشنی ڈالنا سب زیادہ دشوار ہوتا ہے، وہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق احساسات سے ہوتا ہے، یہ بتا دینا نسبتہ نہایت آسان ہے کہ کسی ملک کے باشندے فلاں فلاں اعمال و اشغال میں مصروف رہتے تھے، یا ان کی فلاں فلاں تعلیمات تھیں، لیکن ان احساسات و جذبات کا پتہ لگانا جو ان اعمال و اشغال کے محرک تھے، سخت دشوار ہے اور پھر خصوصاً ایک ملک کے باشندوں کی کیفیات نفسی کی تشخیص کرنا جن کی طرز معاشرت اور موجودہ طرز معاشرت میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اقوام میں شہوت پرستی و ذہانت کے اجتماع کی مثالیں تو متعدد ملتی ہیں، اور خود فرانس و اٹلی نے اس کے متعدد دشواہد ہائے پیش نظر کر دیے ہیں کہ نہایت پست اخلاق جماعت میں عیسلم و تخیل بدرجہ کمال موجود رہا ہے۔ لیکن یونانی زندگی کی بوالعجبی یہ ہے کہ یہاں شہوت پرستی اپنے شباب پر مشاہیر مجاز اخلاق کی نظروں کے سامنے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھیں کے ظل عاطفت میں پھی

اگر آج ہم سے کوئی یہ بیان کرے کہ فرانس کی مشہور طوائف دنیا ڈی انکلو کے کمرہ میں پیرس کے دیندار اساطین مسیحیت بیٹھے ہوئے اُسے اُس کی دوکان عصمت فروشی کی رونق و ترقی سے متعلق مشورہ دے رہے ہیں تو ہم میں سے ایک شخص کو بھی اس روایت پر یقین نہ آئیگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعینہ یہی تعلق سقراط اعظم اور طوائف تھیوڈوٹا کے درمیان تھا!

لیکن اگر ہم اخلاقیین یونان کی حیات نفسی کو صحیح طور پر سمجھنا مقصود ہے تو چاہیے کہ سب سے پہلے کچھ اُس موضوع اہم پر گفتگو ہو لے جس کا اخلاق و قانون سے کیسا تعلق ہے، یعنی یہ کہ خود طوائفوں کے پیشہ عصمت فروشی کا اخلاقی نقطہ خیال سے کیا مرتبہ ہونا چاہیے؟

قدیم علماء مسیحیت کا یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ جذبہ شہوت انسان کی مصیبت اولین ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ علم و سائنس کی موجودہ ترقیوں نے بھی اس راہبانہ خیال کی عملاً تصدیق کر دی ہے کہ انسان میں یہ جذبہ فطرتاً اس سے زیادہ رکھ دیا گیا ہے، جتنا کہ نظام عالم کے بہبودی کے لیے لازمی تھا۔ مائتس کی تحریروں نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر انسان اپنے فرائض ازدواجی کو پابندی و اعتدال کے ساتھ ادا کرتا رہے، تو کچھ عرصہ میں دنیا کی مروجہ شہاری میں اسقدر غیر محرو و اضافہ ہو جائیگا کہ آدمی کو سانس لینا دشوار ہو جائیگا، اور دنیا انواع و اقسام کے فتنہ و فساد، مصائب و آلام کی آماجگاہ بن جائیگی۔ نیز یہ کہ گو انسان میں بہت ہی نوعمری سے تو والد و نسل کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تاہم ترقی تمدن کا تقاضا یہ ہے کہ وسیع و گنجان آبادیوں میں نخل بہت سن پر پہنچ کر ہوا کریں۔ چنانچہ یہ دستور کسی بھی تمدن جماعت میں نہیں پایا جاتا کہ ابتدائی علامات بلوغ کے ظہور پر نخل ہو جایا کرے، اور سائنس کی روز افزوں ترقی مغربی کی شادیوں کو شاذ سے شاذ تر کرتی جاتی ہے پھر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جھکار اخلاق عصمت و عفت کے مناقب پر کتنا ہی زور دیں، علماء اُن کے معیار پر پورا اترنا کیسا، دنیا کبھی اُس کے لگ بھگ بھی نہیں پہنچ سکی ہے، بلکہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانہ میں ایک عظیم الشان تعداد اُسے افراد کی پائی جاتی ہے جو قوانین عصمت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں اور دنیا کی موجودہ

خوابوں اور اترہوں کے اسباب کی اگر تحصیل کی جائے، تو ہر دوسرے سبب کے مقابل میں یہ سبب نہایت قوی ثابت ہوگا۔ ان حقایق کو لہتس نے بے نصیر بن ثابت کیا ہے، لیکن کیا عجب ہے کہ اخلاقیین یونان کی نظر سے بھی یہ مخفی نہوں۔

حکماء اخلاق اس مسئلہ کو حل کرتے وقت د چیزوں کا خصوصیت سے لحاظ رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ پرورش و اولاد کا بار والد کے سر ہے جو دنیا میں اس کے وجود کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ خاندان کا امن و نظام قائم و برقرار ہے۔ کہ حقیقہً ملک کی خوش نظمی و امن منحصر ہے خاندان کی خوش نظمی و امن پر، اور اجتماعی مسرت کار از خانگی خلوص و وفا کے اندر مضر ہے۔ اس کے ساتھ محبت از دو حاجی کا یہ خاصہ ہے اور انسان اس پر محبول ہے کہ جس بچہ کی پرورش و تربیت اس کے سر پر پڑی ہے، اس کی بابت اسے اطمینان کامل ہو کہ وہ اسی کی اولاد ہے اور یہ اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ جہاں شوہر کو اپنی بیوی کی عصمت پر کچھ بھی شبہ ہو جاتا ہے، جیسا منزلی میں امن و سکون کی جگہ ایک سخت تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ جذبہ جنسی کی قوت اس قدر شدید ہے کہ جماعت کی طرف سے یہ تمام بندشیں یہ ساری روک تھام نے آ ہو جایا کرتی ہے، اور ایسے واقعات ہر جگہ کثرت پیش آتے رہتے ہیں جن سے امن و نظم خانگی مختل ہو جاتا ہے۔

ان تمام حالات کی کشمکش کے درمیان وہ ہستی معرضِ وجود میں آگئی، جو اخلاقی نقطہ نظر سے یقیناً سب سے زیادہ مذموم اور بعض حیثیات سے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ بد نصیب ہستی جو بجائے خود فحش کے مراد ہے، وہ ناپاک ہستی جو عشق و محبت کے پاک و لطیف جذبات کو جلبِ منفعت کا آلہ بناتی ہے وہ ہستی جو اپنے تئیں تمام دوسروں کی شہوتِ رانی کے لیے وقف رکھتی ہے، وہ ہستی جس کا وجود صنفِ نازک کے لیے باعثِ توہین کما جاتا ہے، اور وہ ہستی جس کی زندگی ذلت و احرافِ خبیثہ سے لبریز ہوتی ہے، ہمیشہ سے ہر ملک میں موجود رہی ہے، اور اس کا وجود ہر زمانہ میں جہین انانیت پر بصیرت کا ایک مستقل نمایاں داغ رہا ہے۔ یہ گواہی ذاتِ

ایک مجموعہ معاصی ہے تاہم اس کا وجود ہیئت اجتماعیہ کے قیام کا ضامن اور سب سے بڑا معنفا عصمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کج جو شوہر اپنی بیویوں کی عفت شعاری پر نازاں ہیں، ان کی زبانوں پر کلمات محبت و فخر کی جگہ ان کی گردنیں شرم و پشیمانی سے خم ہوتیں اور ان کے دل رشک و انتقام کے جذبات سے جوشن بن ہوتے۔ بچان شہوت کا وہ طوفان جو ایک خاص پیشہ کی عورتوں کے حلقہ کے اندر محدود ہو کر رہ گیا ہے، کسی عورت کا پردہ عصمت باقی نہ رہنے دیتا، یہ پیشہ وہ ہے جس کی عمر انسانیت کے دامن سے بندھی ہے۔ مختلف تمدن مختلف مذاہب و مختلف اصول اخلاق پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے، لیکن یہ پیشہ جوں کا توں قائم و زندہ ہے۔

عیسائی قوموں نے اس طبقہ کی (اور اس طبقہ پر کیا موتوف ہے ہر ایسی عورت کی جس نے قانون عفت کو ملحوظ نہیں رکھا) قسمت کا فیصلہ کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا ہے۔ اور ایٹھ سو تو ام تو اس باب میں اتنی متشدد ہیں کہ ان کے نزدیک اگر کسی عورت ایک مرتبہ بھی یہ مجرم نہ ہو جائے تو اسے ایسا داغ لگ جاتا ہے کہ کوئی توبہ و استغفار، کوئی امتداد زمانہ، اور کوئی کفارہ اسے نہیں مٹا سکتا۔ اور اس تعزیر شدید کی بنا محض نقل پر نہیں، بلکہ عقل پر بھی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جماعت کے نظام کا دار و مدار تا مہرجات منزل کی خوش نظمی پر ہے، اور اسے قہراً رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ جو چیزیں اس میں خلل انداز ہوتی ہیں، انھیں پوری قوت و شدت سے روکا جائے اور جماعت کے ہاتھ میں دولت و تحفہ کی جو آخری جگہ ہے، یہ مجرم اس کے مستوجب قرار دیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے اوصاف مخالف یعنی عصمت و عفت کی خوبیاں از خود عورتوں کے ذہن نشین نہ ہوں گی اور انھیں بصمت و عفت رکھنے کے لیے شوہروں کی نگرانی بالکل غیر ضروری ہو جائیگی اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ان کی اخلاقی زندگی کے دوسرے شعبے بھی ایک بڑی حد تک اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔

(براین بالا کے جواب میں فریق ثانی جو دلائل پیش کرتا ہے وہ خالی از وزن نہیں۔ یہ مندرجہ دلائل ذیل میں کرتا ہے: (۱) اول یہ کہ یہ دستور مٹنے والا نہیں۔ پھر استدلالی سے کیا فائدہ؟ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ پہلے جو چیز کھلے خزانہ ہوتی وہ اب منافع انداز سے چڑھا چکا کر کی جاتی ہے، اور یہ اخلاقی حقیقت گماہ کو بھڑا دیتی ہے۔)

کو وزن کو اور زیادہ بھاری کئے دیتا ہے۔ طوائفوں کا شمار روز افزوں ہے۔ رشتہء اہل کی
مردم شماری کے لحاظ سے انگلستان میں صرف اُن طوائفوں کی جن کا نام درج رجسٹر تھا
تعداد ۵۰۰۰۰ تھی اور جو چوری پھیسے یہ پیشہ کرتی تھیں اُن کا تو کوئی حساب ہی نہیں اور اب
تو یہ تعداد بدربارہ گئی ہے۔

(۲) غیر معتدل شرم و حجاب کا نتیجہ یہ ہونا ہے کہ وہ خبیث و موزی مرض جو زانی شوہر
سے معصوم بیوی بلکہ اُس کے بچوں تک منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یعنی آتشک، اس کی رفتا
شرعت کے ساتھ برعصتی جاتی ہے اور قانون اس کے اسباب کی مضابطہ تحقیقات اور اس
انسداد کی تدابیر اختیار کرنے سے بھجکتا ہے۔

(۳) وہ خفیف اخلاقی لغزشیں جو دیگر ممالک یورپ میں قابل اعتبار بھی نہیں سمجھی جاتیں
بلکہ جو اکثر روزندگیوں کی باہمی محبت، مسرت و پاک بازی کا مقدمہ ثابت ہوتی ہیں
اُن کا ارتکاب انگلستان میں دائمی بربادی کا پیش خمیہ ہوتا ہے۔

(۴) ایک نتیجہ اس طرز عمل کا یہ بھی ہے کہ اطفال کشی کا شمار روز افزوں ہے۔

(۵) اس حقیقت کے شمار نظیریں ملتی ہیں کہ پاکباز و عصمت مند لڑکیاں جن سے محض ایک
اتفاقاً لغزش ہو گئی۔ انھیں سوسائٹی کی اس شدید رائے کے خوف سے اپنی زندگی دائمی
عصمت فروشی کی نذر کر دینا پڑی ہے۔

(۶) پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ اس متروک و مردود طبقہ میں
اکثر لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فطرتاً نہایت سلیم الطبع، ذکاوت و نیک نصال ہیں
اور جنہوں نے محض کسی مجبوری سے اس پیشہ کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنے
فاقد کش والدین کے لئے ذریعہ معاش اس صورت سے بنتی ہیں یا بعض خود فاقہ کشی کی
حالت میں اس پر مجبور ہوتی ہیں و قس علیٰ ہذا۔

ان مختلف خیالات سے جنھیں میں نے بغیر جرح و تنقید محض نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو اس کا

اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مسئلہ زیر بحث کس قدر اہم و مختلف فیہ ہو۔ یونانی مقنین و اخلاقیین نے اس کے حل کی یہ صورت نکالی کہ جنس نسوان کو دو بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گھر والیاں جو شوہروں کی حد درجہ وفادار بیویاں ہوتی تھیں۔ دوسرے باہر والیاں جو آشنائی کرتی پھرتی تھیں۔ گھر والیاں سخت پردہ کے اندر رہتی تھیں اور عموماً بہت کم سنی میں بیاہری جاتی تھیں۔ ان کے رہنے کے لئے مکان کا ایک پردہ دار حصہ مخصوص ہوتا تھا اور ان کے مشاغل یہ ہوتے تھے۔ چرخہ کا تنا۔ سینا پر ونا۔ خانہ داری کا انتظام۔ اور بیمار غلاموں کی تیمارداری۔ ان میں سے جو خوشحال ہوتی تھیں وہ بہ استثناء شاذ، کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں اور جب کبھی نکلتیں تو خادمہ کو ساتھ لے کر عام مجالس و ملاعب میں کبھی شرکت نہیں کرتی تھیں، اور تا وقتیکہ ان کے شوہر موجود نہ ہوں کسی مرد سے نہیں ملتی تھیں۔ اجنبی مرد کے سامنے کھانا تک نہیں کھاتی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا جوہر عصمت تھا جسے انھوں نے غالباً ہمیشہ قائم رکھا۔ اور اس حفظ ناموس کے بعض خارجی مویدات بھی تھے۔ مثلاً یہ کہ انھیں جادہ عفت سے ہٹنے کے موقع بھی بہت کم چل جاتے تھے یا یہ کہ جو مرد انھیں خراب کرنے کی کوشش کرتے تھے سو سائٹی ان کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آتی تھی، نیز یہ کہ مردوں کو جب حفظ نفس کے اور وسائل حاصل تھے تو ادھر متوجہ ہونے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کی یہ طرز زندگی گویا ایک طرف ان کی عصمت و ناموس کی سب سے بڑی محافظ رہی لیکن دوسری طرف اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ ان کے قوائے ذہنی کی تربیت نہ ہو سکی اور بہرہ لو نڈیوں باندیوں کے درمیان گھرے رہنے سے ان کی نظریں لازمی طور پر پست ٹنگ ہو گئیں۔ گھر والیوں کی خوبی کا بڑا معیار یہ تھا کہ ان کی بابت نیک یا بد کسی حدیث سے بھی سو سائٹی میں کہیں ذکر نہ آنے پائے۔

اپنے اس محدود دائرہ زندگی کے اندر بیویاں غالباً بہت خوش رہتی تھیں۔ عادت اور رسم و رواج نے اس مقید خانگی زندگی کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا تھا۔ اپنے شوہروں کی

غیر معتدل بد چلنیوں پر یہ عوامانہ ابر رہتی تھیں۔ گھر کے اندر جو اخلاق و آداب رائج تھے وہ بہت ہی شریفانہ تھے۔ بیویوں پر کسی طرح کے مظالم کا پتہ نہ تھا۔ شوہر زیادہ تر باہر رہا کرتے تھے جس سے ان کی بیویوں کو رشک و رقابت کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ اور وہ ان کے ساتھ دلی الفت و محبت رکھتی تھیں۔ زنا فن کے ذریعہ سے ہیں ایک شوہر کی طرز زندگی کی یہ تصویر نظر آتی ہے کہ اس نے ایک پانزدہ سالہ لڑکی سے شادی کی جو بالکل اگھڑ اور دنیا کے حالات سے ناواقف ہو۔ شوہر اس کی طرف انتہائی لطف و شفقت سے مخاطب ہوتا ہے۔ لیکن انداز خطاب یہ ہے کہ گویا کسی بچہ سے گفتگو کر رہا ہے وہ اسے سمجھاتا ہے کہ شہد کی مکھوں کی ملکہ کی طرح اُسے بھی مسرت و دقت گھر کے اندر اور انتظام خانہ داری میں مصروف رہنا چاہیے۔ لونڈی غلاموں کو ان کے کام پر مقرر کرنا، خانگی مصارف میں کفایت پر نظر رکھنا، اسباب خانہ داری، کپڑے، جوتے، ظروف وغیرہ کو قریب سے رکھنا، یہ سب اُس کے فرائض ہیں۔ ان کے علاوہ اسے اپنے بیمار غلاموں کی تیمارداری بھی کرنا چاہیے۔ جب شوہر اپنی تقریر کے اس حصہ پر پہنچتا ہے تو بیوی ایک طفلانہ بے اختیاری کے ساتھ بول اٹھتی ہے کہ ”ہاں مجھے یہ کام سب سے زیادہ پسند ہے۔ اگر وہ غلام مجھے زیادہ چاہتے لگیں“ پھر شوہر نہایت ملایم لہجہ میں اُسے سمجھاتا ہے کہ اونچی ایڑی کے جوتے پہننے اور چہرہ پر سُرخ اغازہ لگانے کی عادت کو ترک کر دینا چاہیے۔ خاتمہ تقریر پر وہ اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ اپنے ان فرائض میں پوری طمع مشغول رہی تو وہ خود اس کا سب سے زیادہ اطاعت کیش و وفا شعار غلام بن جائے گا۔

حیات ازدواجی کی ایک تصویر پلٹاؤ کے صفحات میں بھی ملتی ہے۔ مگر وہ بہت آخر زنا کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بیوی کی حیثیت محض مکان دار یا داروغہ کی نہیں رہ گئی تھی بلکہ وہ شوہر کی زندگی میں اس کی شریک و ہم جو گئی ہے۔ اب شوہر یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ ہو اور وہ خود اسے اس کے حقوق کی پُر زور طریقہ پر

تعلیم دیتا ہے۔ نکل کا طریق و اسلوب جو وہ بیان کرتا ہے اُس کا بھی معیار اسی قدر بلند ہے جتنا موجودہ زمانہ کا ہے۔ بچہ کی وفات پر شوہر بیوی کے نام تعزیت نامہ لکھتا ہے جس کے حرف حرف سے محبت و الفت نکلتی ہے۔ اسی شوہر سے اور اس کے سسرالی اعزہ سے کچھ بے لطفی ہو گئی تھی۔ بیوی کو خیال گزرا کہ کہیں اس کا اثر خود ان دونوں کے باہمی تعلقات پر نہ پڑے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے شوہر کو اپنے ہمراہ سفر پر آمادہ کیا۔ آگے کر مقدس پہاڑی کوہ ہیلیکون پر گئی۔ جہاں عشق کی دیوی کا مندر تھا۔ اس کے آگے قربانی چڑھائی اور دونوں نے مل کر یہ دعا کی کہ ان کی باہمی الفت و محبت تازہ زیست کبھی نہ کم ہو۔

بائس ہمہ بحیثیت مجموعی، باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا۔ اس کی زندگی مدۃ العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکیں میں اپنے والدین کی جوانی میں اپنے شوہر کی اور بیوی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں اس کے مقابلہ میں اس کے مرد اعزہ کا حق ہمیشہ سراج سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اُسے قانوناً ضرور حاصل تھا۔ تاہم علاوہ اس کے بھی کوئی فائدہ نہیں آتا سکتی تھی کہ عدالت میں اس کا اظہار دینا یونانی ناموس حیا کے منافی تھا۔ البتہ وہ اپنے ساتھ جینے ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جینے دینا اس کے فرایض میں داخل تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ایشینیا کا قانون یتیم لڑکیوں پر خاص طور سے مہربان تھا۔ لیکن اس میں دو باتوں کے سوا اور کوئی شے حقوق انہوں کی تائید میں نہیں پیش کی جاسکتی۔ فلاطون نے بے شبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی۔ عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور زوج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظت ملک کے کام آئے۔ اور اسپارٹا کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ مُرنِ وضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمزور بیویاں کسی نوجوان کے جبالہ نکاح میں دیدینا چاہیے۔ تاکہ فرج

میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ یہ نقطہ خیال گو جذبات محبت والفت کا قاطع تھا، تاہم اس سے اہل اسپارٹا میں ایک مردانہ حب وطن ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ ایسی اسپارٹن عورتوں کی بہ کثرت مثالیں موجود ہیں جنہوں نے وطن پرستی کے بزم پر اپنی اولاد کو قربان کر دیا۔ اور جنہوں نے راہ وطن میں ان کی شہادت پر علانیہ اظہارِ فخر و مسرت کیا۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن یونانی تاریخ کے صفحات میں باعصمت گھروالیوں کے نام شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ ایک آئینیا کے سردار تو کیون کی بیوی اور گنتی کی چند اور بیویوں اور بیٹیوں کے ایثار کے واقعات بس یہی ساری یونانی تاریخ میں شریف گھروالیوں کے کارناموں کی کائنات ہیں البتہ صنفِ نازک کے جس طبقہ کی تعداد کثیر ہے اس وقت شہرت و امتیاز حاصل کیا وہ تمام تر دوسرے طبقہ کی عورتیں تھیں جن کا نام اوپر گزر چکا، یعنی باہر والیاں یا بازاریاں۔

اس طبقہ کو یونانی حیات اجتماعی میں جو مرتبہ حاصل تھا۔ اُسے پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تئیں ایک ایسی فضا کے اخلاق میں موجود فرض کرنا چاہیئے جو موجودہ اخلاقی فضا سے بالکل متباین و متضاد تھی۔ مکملہ اخلاق بشری کا تخیل یونانیوں کے ذہن میں یہ تھا کہ انسان بلا کسی زہد و رہبانیت کی آمیزش کے اپنے تمام قوائے فطری و عقلی مقتضیات و مطالبات کو پورا کرتا رہے۔ اس قدر انہیں بلاشبہ مسلم تھا کہ انسانی قویٰ میں فرق مراتب ہی۔ اور یہ کہ ادنیٰ خواہشات کا دل و دماغ پر غالب آجائے تو نفس کی علالت تھی۔ لیکن یونانی دماغ کے لئے یہ عقیدہ بالکل غیر مفہوم تھا کہ کسی فطری خواہش کو سرے سے دبائے رکھنا چاہیئے۔ یقیناً حکماء اخلاق، اور عام افراد اس تخیل کے نہ صرف دل قابل تھے، بلکہ جہاں تک حیات جسمی کا تعلق ہے اس پر بے تکلف عامل بھی تھے چنانچہ ان کے مقدس ترین اشخاص مادۃً بالاعلان ایسے افعال کے مرتکب ہوتے تھے جو ہمارے نقطہ خیال سے سیدھی میوب و شرمناک خیال کے جائیں گے۔

قطع نظر اس عام سبب کے کہ ایک جنس کی غیر محدود آزادی عموماً جنس مقابل کی سلب
حریت کا باعث ہوتی ہے۔ یونان میں اور بھی متعدد اسباب ایسے جمع ہو گئے جنہوں نے وہاں
زنا بازاری کے مرتبہ کو اس قدر ممتاز و بلند کر دیا کہ دنیا کی کسی جماعت میں اس کی نظیر
نہیں ملتی۔ عشق کی دیوی ایفرودایت کی پرستش نے گویا ان کے پیشہ پر مذہبی استناد کی
نہر لگا دی تھی۔ اس کے مندر کی منجاریاں، زناں بازاریاں تھیں۔ اور کارنتھ کی درگاہ
کے مجاور بھی اسی طبقہ کی عورتیں تھیں جن کی بابت روایت ہے کہ انھیں کی دُعاؤں سے
شہر مصائب شدیدہ سے محفوظ و مصنون رہا۔ بلکہ منقول تو یہ ہے کہ بابل بابل میں ساپرا
و کارنتھ میں عصمت فروشی، ہزنو مذہب بن گئی تھی۔ اور ان مقامات کے علاوہ۔ میطس
تیندوس، لیبسوس، وابیڈوس عصمت فروشی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے جو معاہدہ
کے ظلِ عاطفت میں پروان چڑھ رہی تھی۔

مذہبی عنصر کے ثنول کے علاوہ ایک اور بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ یونان میں حُسن پرستی
کا جو مذاق رائج تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ اس خیال کی صورت میں ظاہر ہوا کہ جو سب سے زیادہ
حُسن پر۔ وہ سب سے زیادہ مغز پر و مناظر طبعی قدرِ ثناء و ثنا، اہل صنائع حُسن کی مرقع نگاری پر
لگے ہوئے غرض ہر شے حُسن و جمال کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتی تھی۔ دنیائے ادب کی
جان حُسن ادا تھی۔ اہل صنعت کا کمال فن یہ تھا کہ نقاش یا دستکار حُسن صورت کی نقل کو حاصل سے
المانے۔ مایں اپنی دُعاؤں میں سب سے مقدم مایہ رکھتی تھیں کہ اولاد حسین پیدا ہو۔ خود اہل حکمت
و معلمین اخلاق فضیلت اخلاقی کی تعریف کے لئے پیرایہ بیان یہ اختیار کرتے تھے کہ وہ نام ہے
ایک غیر مادی و اکمل ترین حُسن و جمال کا غرض ہر شعبہ حیات میں حُسن و جمال کو استثنائی عظمت و
احترام کا مُراد سمجھا جاتا تھا، اور جو طوائفین ہوتی تھیں وہ گویا حُسن کی پتلیاں ہوتی تھیں
یہ اسی کا اثر تھا کہ عشق کی دیوی کا بُت جو سارے ملک کا برجِ عظمت و معیت تھا، ایک
طوائف کی شکل میں تھا مشہور نقاش پرکیزتیس اپنی آشنا فرایینی کے عجبہ تیار کرتا تھا جس کا ایک

طلانی، تہہ اپالو کے مندر میں بھی رکھا گیا۔ اس پر لوگوں نے غل چایا کہ اس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑے جاتے ہیں اور بالآخر عدالت سے چارہ جوئی کی فریبتی مدعا علیہا قرار پائی۔ لیکن عیس وٹان مقدمہ میں وکیل مایپرڈیس نے دفعۃً اپنی پری جال موکلہ کو حاکمان عدالت کے سامنے لا کر بے نقاب کر دیا۔ حکام اس کے فرط حُسن سے مہبوت ہو گئے، اور مایپرڈیس کو فوراً بری کر دیا۔ اپلیں اس زمانہ میں بہت مشہور نقاش تھیں۔ سکندر اعظم نے اُسے اپنی خاص محبوبہ لالیں کا مجسمہ تیار کرنے کو بلوایا۔ اپلیں نے مجسمہ تیار کر دیا۔ لیکن اس اثنا میں خود بھی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی محنت کا سب سے بڑا اصلہ جو سکندر نے دیا وہ یہ تھا کہ خود لالیں کو اُس کے حوالہ کر دیا۔ اسی طرح اس وقت جو شخص پھولوں کی تصویر کشی کا سب سے بڑا اُستاد گننا جاتا تھا، اُسے اپنی صنعت میں کمال یوں حاصل ہوا تھا کہ وہ ایک پھول بیچنے والی لڑکی پر مضمون تھا، اور پھولوں سمیت اُس کی تصویر کھینچا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس طرح اُس کو خاص پھولوں کی مصوری میں ماہر فن کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ پندرہ سوئیس جیسے مشاہیر شعراء علانیہ طالعوں کی مدح و ثنائیں قصائد کہتے تھے، اور بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ زنانہ بازاری سے بالکل غیر مخفی راہ و رسم رکھتے تھے۔

ایسی حالت میں اگر اُس وقت کی اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ و بلند نظر خواتین زنانہ بازاری کی صف میں شامل ہو جاتی تھیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہو؟ پردہ میں مقید رہ کر سوسائٹی میں نام و منو و حاصل کرنا ناممکن تھا۔ درحقیقت سارے اہنیا میں جو عورتیں آزاد و کمی جاتی تھیں، وہ صرف اسی طبقہ کی ہوتی تھیں اور وہ خود اس آزادی سے یہ فائدہ اٹھاتی تھیں کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت سے اپنی دلچسپیوں کی فہرست میں ایک اور عنوان کا اضافہ کر لیں۔ لیکن اگر وہ وقت مشاہیر شعراء، ماہرین فنون لطیفہ، مؤرخین و فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ اُن کے علمی و ادبی مشاغل میں حصہ لیتی تھیں اور اکثر ان کا مکان ایک بہترین علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا۔ مشہور مدبر و خطیب پیریکلس کی مشوقہ حُسن و جمال کے ساتھ علم و فضل میں بھی یکساں تھا۔ بلکہ روایت تو یہاں تک ہو کہ پیریکلس کو فن خطابت کی تعلیم اسی اسپسیا نے دی تھی

اور اُس کے بہترین خطبات اسی کے املا کئے ہوئے ہوتے تھے۔ اہم ملکی معاملات میں یہ میٹر کا کام دیتی تھی، اور دیگر حکماء سے قطع نظر اس کے خود سقراط اس کی مجلس میں شریک ہوتا تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سقراط خود اپنی تعلیم کے لئے جس کا بہت زیادہ ممنون تھا وہ بھی ایک طوائف دیونیا تھی۔ اور اپیکورس (بابی فریڈلڈتہ) کے ممتاز ترین تلامذہ بھی ایک طوائف لیونیم کا نام نظر آتا ہے۔ اسباب بالا کے علاوہ ایک اور سبب قوی بھی اُس وقت موجود تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہم چکچکاتے ہیں۔ لیکن تاریخ نگاری کے فرایض پر بھی شرم و حیا کا جذبہ غالب نہیں آسکتا اور اس لئے ہمیں بادل ناخواستہ ذکر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے ہماری مراد محبت خلاف وضع فطری سے ہے جو مرد و مرد کے درمیان پائی جاتی تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں زنا کاری یقیناً باغینمت تھی اس بیہودگی کا پتہ ہومر دہیڈ کے صفحات میں نہیں چلتا، لیکن عام مرد و رز نشوں کی کثرت نے جن میں مرد بالکل برہنہ ہو جاتے تھے۔ لوگوں کی طبیعت کو اس جاہل کر دیا، تا آنکہ کچھ روز میں یہ عادت خبیث یونانی تمدن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی اور اس سے محترز رہنا ایک غیر معمولی زہد و اتقا کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی عنصر کی اس میں بھی آمیزش ہو گئی یعنی دیوتاؤں کے خدام۔ مردوں کی شکل میں دکھائے جانے لگے۔ اور بڑے بڑے صنائع اپنی صنایعوں کا نمونہ انھیں کے مجسموں کی تعمیر میں ظاہر کرنے لگے۔ اصولاً اسے جو از کامرتہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ یہ ناجائز ہی قرار دیا گیا۔ لیکن علما یہ عادت اس قدر عام تھی کہ ہمارا وہم و گمان بھی وہاں تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سب سے پہلے یونانیوں نے اپنے جن دیوتوں کے مجسمہ بطور یادگار نصب کر لئے وہ ارموڈی و اسٹو جیش وہ دومر تھے جن کے درمیان یہی غیر فطری تعلق تھا!

ہر بڑی بُرائی کے مقابلہ میں چھوٹی بُرائی قابلِ تہجج ہوتی ہے۔ اِعلام کے مقابلہ

میں زینو، باقی فرقہ رواقیہ زہد و اتقا، خشک مزاجی و تسبی کی تصویر تھا۔ اُس کی بابت دیوجانس لیرٹیس نہایت مستحکم لکھتا ہے کہ ”وہ اِعلام سے برائے نام شوق رکھتا تھا“ مشہور شاعر سوتھلس کو اس کا خصوصیت کے ساتھ شوق تھا۔

میں زنا کاری بدرجہا بہتر تھی، اسی سبب طوائفوں کا مرتبہ اتنا پست نہیں ہونے پایا
 جس کی وہ سچی تھیں تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اخلاقی نقطہ سے وہ انتہائی پستی و تذلل کے غار
 میں دھنسی ہوئی تھیں اور ان میں شاذ و نادر ایسی نکلتی تھیں جنہیں ہم خانگیوں کے درجہ میں بھی
 رکھ سکیں۔ یونانی، حرص زر، شہوت پرستی وغیرہ جو اوصاف اس طبقہ کی عورتوں میں
 عموماً ہوتے ہیں وہی ان میں بھی تھے۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس کلیہ میں متعدد مثبتات بھی
 تھے۔ مثلاً ہارموڈیس کی آشنا لینا اس قدر با وفا تھی کہ پولیس کی سختیوں سے مر گئی۔ مگر
 اپنے آشنا کے جرایم کا کسی طرح افشاء نہ کیا۔ اس کی یاد گاریں یونانیوں نے ایک شہر نی
 کا مجسمہ نصب کرایا، جس کے دیوانہ تھی۔ اسی طرح ایک اور طوائف بیک کس کی خوش اخلاقی
 و ہر دلغری بھی مشہور ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوسائٹی نے گھروالیوں اور بازاریوں کے چونکہ
 فرائض وحدود عمل بالکل علیحدہ قرار دیئے تھے۔ اس لئے بازاریوں سے ان اوصاف
 کی توقعات ہی نہیں رکھی جاتی تھیں جو گھروالیوں کے ساتھ مخصوص تھے اور نہ ان سے
 ان کے پیشہ سے متعلق گفت گو کرنا کچھ معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ زمانہ روایت
 کرتا ہے کہ مقررہ کے کان تک جب مشہور طوائف ہیتوڈیٹا کے حسن و جمال کا شہرہ پہنچا تو وہ
 اس کی تصدیق کے لئے خود اس کے مکان پر مع اپنے تلامذہ کے پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے
 ہیتوڈیٹا سے اس کے نفیس مکان و سامان آرائش وغیرہ سے متعلق استفسارات کئے۔ اور
 جب ان کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ سب اسی پیشہ کی آمدنی سے ہوا ہے تو مقررہ نے طوائف
 کو بجائے کسی قسم کی اخلاقی پند و موعظت کے اس کے پیشہ کے فروغ کی تدبیر بحال فصاحت
 بیان کرنا شروع کیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے چاہیے کہ بدتمیزوں کو اپنے یہاں نہ آنے دے اپنے
 عاشقوں کی بیماری میں عیادت کرے۔ اپنے چاہنے والوں کو خود بھی چاہا کرے۔ دس علیٰ ہذا
 اس لکچر کے خاتمہ پر یہ حکیم عظیم طوائف کے حسن و جمال کا اعتراف کرتا ہے اور بحال سنجیدگی و منانت
 واپس چلا آتا ہے!

ان ناخوش گوار واقعات کا ذکر مجھے اپنے فرائض کے خیال سے مجبوراً کرنا پڑا کہ بغیر ان کے تاریخ اخلاق اجمالاً بھی نامکمل رہ جاتی۔ اب ناظرین کے سمجھ میں یہ مسئلہ اگیا ہو گا کہ جس سرزمین سے اس قدر مشاہیر رجال پیدا ہوئے وہاں بالکمال خواتین کیوں اس قدر کمیاب ہیں؟ اس دور کی یونانی اخلاقی زندگی کی اہم دفعات کو ہم بطور خلاصہ یوں رکھ سکتے ہیں:-
(۱) یونانی اخلاقیوں کو بھی گہواری طرح جذبات بشری میں اصولاً فرق مراتب تسلیم تھا تاہم اس کی یقین میں ہمارے مطمح نظر سے ان کا معیار اخلاق بالکل جدا لگانا تھا۔

(۲) یہ سچی تعلیم کہ بجز النح کے اور ہر صورت سے مرد و عورت کا تعلق ناجائز ہے، یونانی دماغ کے لئے بالکل غیر معلوم تھی۔

(۳) بیویوں پر سخت فرائض و ذمہ داریاں عاید تھیں شوہروں پر بھی یہ ذمہ داریاں عاید کی گئیں، مگر بہت ہلکی اور بہت آخر زمانہ میں۔

(۴) ہر ایم خلاف وضع فطری کی وہ گرم بازاری تھی، کہ ہم اُس کے سننے کی بھی تاب نہیں لاسکتے۔

(۵) شادیوں کا رواج کم ہوتا گیا اور لوگ ناجائز تعلقات کھلے خزانہ رکھنے لگے۔

(۶) خانگیاں و بازاریاں، اگرچہ گھر والیوں کے مقابلہ میں عزت و عظمت کچھ بھی نہیں رکھتی تھیں، تاہم کوشش ان میں تھی اور جو مقبولیت انھیں حاصل تھی اُس سے بیویاں بالکل محروم تھیں۔

فصل (۲)

رومہ کی اخلاقی زندگی کی فضیلت

رومی تمدن کی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی اخلاقی زندگی یونان سے بدرجہا برتر تھی۔ یہ ہم کہیں پہلے کہہ آئے ہیں کہ عفت و عصمت کی خوبی پر دو مختلف پہلوؤں سے نظر کی جاسکتی ہے۔ ایک مادیات کے نقطہ خیال سے دوسرے روحانیت کے پہلو سے مادی پہلو جو ان ممالک میں غالب ہے جہاں مذہبیت کم اور سیاست زیادہ ہے یہی ہے کہ کھج اشرف الاعمال ہے کہ حکومت کا قیام نظام و فلاح اسی کے دم سے وابستہ ہے۔ روحانی عقیدہ جو ان ممالک میں شایع ہے جہاں سیاست کا زور کم اور مذہب کا غلبہ زیادہ ہے یہ ہے کہ شرم و حجاب ام الفضائل ہے عورت کا مطمح نظر مدت العمر کی دوشیزگی ہونا چاہئے اور نکاح دیگر بکارت شکن صورتوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔ بس ٹھیک انہیں دونوں خیالات کی مطابقت میں رومہ میں دو مختلف مذہبی سلسلہ قائم تھے۔ ایک مردانہ سلسلہ تھا جس کے ارکان فلمین کہلاتے تھے دوسرا زنانہ سلسلہ تھا جو کنواریوں پر مشتمل تھا۔ دونوں کا انتہائی احترام و تقدس ملحوظ رکھا اور دونوں کو یا مذہب کے کلید بردار سمجھے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اول الذکر حرمت ازدواجی کا منظر تھا اور آخر الذکر دوشیزگی و کنوار پن۔ پاک کنواریوں کے چھڑنے والے کو سخت سے سخت ممکن سزائیں دی جاتی تھیں اور ہر فلمین کے لئے متاہل ہونا لازمی تھا بیوی کو وہ کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اور اگر بیوی فوت ہو جائے تو وہ اپنے عہدہ ہی ہٹا دیا جاتا تھا۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سلسلوں میں سے سلسلہ 'فلمین' رومی جذبات کا بہتر و صحیح تر ترجمان تھا۔ کیونکہ رومی مذہب تا مگر ایک خانگی مذہب تھا۔ اور قانون کا مدعا سے خاص یہ تھا کہ رسم ازدواج کو ہر قسم کے شرف و احترام کا مرکز رکھا جائے۔

وحدت انواج کا دستور قدیم سے چلا آتا تھا اور پوری پابندی کے ساتھ، بلکہ یہ رومی ہی تمدن کا ایک احسان ہے کہ یورپ میں بھی یہی دستور رواج پا گیا۔ رومہ کے جو قدیم ترین افسانہ ہیں، ان میں بھی عورت کے مرتبہ عالی اور رومی زندگی میں اُس کے نمایاں حصہ لینے کی صاف تعلیم نکلتی ہے۔ لکڑی شیاؤں اور جینیا سے زیادہ کس نے دنیا میں ناموس شوہری کی عظمت میں جان باری سے کام لیا ہے؟ یا سابی عورتوں اور کوریولینس سے بڑھ کر کون حب وطن کا ثبوت دے سکتا ہے؟ ایک مند رومہ میں اُن خواتین کی یادگار میں تعمیر تاجنوں نے اپنی زلفیں کاٹ کاٹ کر سپاہیوں کو دیدیں تاکہ کمالوں کی ڈوریوں کا کام دے سکیں۔ ایک اور مند ر ایک ایسی خاتون کے نام کو قائم کئے ہوئے ہے جس کی ماں قید خانہ میں گر شکی سربلاک ہونے کے واسطے رکھی گئی تھی، مگر جس نے تنہا اندر جا کر اُسے اپنا دودھ پلا کر زندہ رکھا۔ عورت کا مرتبہ رومی قانون نے البتہ ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ فہرہ خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اُسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا جہیز یا دھن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرلی شا دی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانہ مابعد یعنی دور تاریخی میں جی بپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل تک کر سکتا تھا۔ ۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہیں سنا۔ آدمی بے شرت اس قدر سخت تھے کہ ایک ممبر سینٹ کو محض اس سبب میں سزا ملی کہ وہ اپنی لڑکی کو سامنے اُس کی ماں یعنی اپنی بیوی کا بوسہ لے کر خوش کامرنگ ہو اور کسی مان کے لئے اپنے بچہ کی رضاعت داپہ سے کرنا سخت توہین کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ غامگی زندگی کے جزئیات تک قانونی تشکیج میں گئے ہوئے تھے کہ بیویوں کا طبقہ گو بہ لحاظ تعداد بہت بڑا تھا لیکن نہایت ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے لئے جو نو کے مندر کی قربان گاہ کو چھونا ممنوع تھا۔

اور ان کے لئے سب سے بڑی لعنت یہی سمجھی جاتی تھی، کہ انہیں اپنی زبان سے اپنے شہرِ مناک
 ہمیشہ کا اعتراف کرنا پڑے۔ ایک سرکاری انسر کی بابت یہ واقعہ منقول ہے کہ اُس پر حملہ ہوا
 مگر اس کا استغاثہ محض اس لئے غیر مسموع رہا کہ محل واردات ایک کبھی کا مکان تھا
 عورت کے ناموس و حیا پر تمام کا رخا نہ فطرت گواہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے وحشی و خونخوار جانور
 باکرہ عورت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے تھے۔ برہنہ عورت اگر کسیت کے گرد پھپھرتی
 تو حشرات الارض مرجاتے، غرق شدہ مردوں کی لاش سیدھی تیرتی، لیکن غرق شدہ عورتوں
 کی لاش اوندھی تیرتی، جو بقول رومی سائیں دانوں کے عورت کی افضلیت کی دلیل تھی
 ارسطو کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وحشیوں پر یونانیوں کی افضلیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے
 کہ ان کی طرح یونانی اپنی بیویوں کو غلام نہیں سمجھتے بلکہ بہ طور اپنے رفیق و شریک زندگی کے
 رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بجائے یونانیوں کے رومیوں کے منہ پر زیادہ
 کھلتا ہے اور جیسا کہ ایک رومی مصنف نے لکھا ہے یہی ایک امر یونانی تمدن کے مقابلہ میں
 رومی تمدن کے شرف و فضل کے لئے بس کرتا ہے۔ بہ قول اس کے یونانیوں کا طرز عمل اپنی بیویوں
 کے ساتھ یہ تھا کہ انہیں اپنی مجلسِ راؤں کے اندر مقید رکھتے تھے اور بجائے اس کے اور کسی مرد
 کے ساتھ کھانے نہیں دیتے تھے۔ بہ خلاف اس کے رومی شوہر نے اپنی بیوی کو ہر طرح کی
 آزادی دے رکھی تھی۔ ہمیں اس امر کا صحیح علم نہیں کہ جس زمانہ میں رومی بیویاں تمام تر اپنے
 شوہروں کی مملوک ہوتی تھیں، اس وقت خانگی زندگی میں سترت کمان تک رہتی تھی، لیکن یہ
 تقریباً یقینی ہے کہ ازدواجی خلوص و وفا شروع سے رومی زندگی کا جزو رہی ہے اور جس
 رومی مقصد نے نکاح کی یہ تعریف کی کہ وہ دینی و دنیوی حقوق کے دائمی اتحاد و اشتراک
 کا نام ہے اس نے اپنے ہموطنوں کے ہر دور کے تخیل و طرز عمل کی صحیح ترجمانی کر دی۔
 جمہوریت کے خاتمہ پر اور قیصرہ کے عہد میں رومی اخلاق میں جو انحطاط عظیم پیدا ہو گیا
 اس کے اسباب اہم کا ذکر ہم کہیں پیش کر چکے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا جامع و ہمہ گیر تھا جو مذہب

معاشرت، سیاست، غرض ہر شعبہ حیات میں سرائیت کر گیا تھا۔ فلاسفہ کی تشکیک نے قدیم مذاہب کی جبر کا سٹا دی تھی مشرقی تفسیر و مشرقی بد اخلاقیوں کا ایک سیلاب آگیا تھا اور ایسی حالت میں دنیا کا رسی کے واقعات خاص طور پر نمایاں و کثیر القیاد ہو گئے تھے۔ غلاموں کی گھر گھر کثرت اور غلام ہی ایسے جو دنیا بھر کے آوارہ خانہ دوزوں کے چھٹے ہوئے، یونانی و ایشیائی خانگیوں کا داغہ، ہر گھر میں فحش تصاویر لگانے کا دستور، تھئیٹروں میں ایکٹروں کی نہایت جیاسوز حرکات و افعال، دولت و ثروت میں دفعۂ افزائش، استبداد حکومت کے باعث سیاسی مشاغل کا سدباب، ان تمام چیزوں نے مل ملا کر سیہ کاری کی وہ گرم بازاری کر دی جس کی کوئی انتہا نہیں بے شبہ ایسے دور تاریخ میں بہت سے طیس گے جنہیں فضائل اخلاق کا اس زمانہ سے بہت زیادہ قحط تھا لیکن ایسا کوئی زمانہ تاریخ پر ہرگز نہیں گذرا، جس میں زوایل اخلاق کی یہ کثرت و فراوانی رہی ہو، جو قیصرہ کے عہد میں تھی یونانیوں کی شہوت پرستی پھر بھی غنیمت تھی، کہ کم از کم اس میں لطافت و نفاست تو تھی، لیکن یہاں تو یہ قیامت تھی کہ اس کا بھی پتہ نہ تھا بلکہ خاص قسم کی شقاوت و قساوت بھی شہوت پرستی و سیہ کاری کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ نوجوان سلاطین امرا و خوشامدی ارکان دربار سب اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور بڑے بڑے مصنفین دہل ادب مثلاً مارٹیل، اپولس و ونس و لوسین تک کے صفحات فحش سے لبریز ہیں!

اس زمانہ سے کچھ تو مذکورہ بالا حزب اخلاق موثرات کے اثر سے اور نیز اس سبب سے کہ معاشرانہ بیلک نظامات کا رجحان بھی اس جانب تھا ایک عام ہوا یہ حل گئی تھی کہ نکاح کی طرف سے لوگوں کو بے رغبتی و بے التفاتی ہونے لگی اسٹس نے اس کے روک تھام کی بڑی کوشش کی، مجرور کے خلاف تعزیری قوانین نافذ کئے جو شخص تین بچوں کا باپ ہو ان کے لئے خاص انعامات تجویز کئے لیکن یہ ساری کوشش ناکام رہی اس زمانہ کی ایک تحریر دستیاب ہوئی ہے جو رنم نکاح کی حمایت میں کی گئی تھی اس کا ایک دلچسپ فقرہ یہ ہے:

لئے برادران وطن، اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ بغیر بیویوں کے رہ سکیں، تو ہم ہرگز اس تکلیف دہ شے کو گوارا نہ کرتے لیکن چونکہ نصرت نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ نہ بغیر بیویوں کے گزر ہو سکتی ہے اور نہ ان کے ساتھ کافی لطف حاصل ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں ہم اپنی تھوڑی سی بے لطفی گوارا کر کے آئندہ نسل کے بقا و تئام کے خیال سے اس دستور کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ اخلاقی اخطا ہوتا لیکن اسی کے پہلو پہ پہلو دوسری طرف قانون کی نظر میں عورت کے مرتبہ کو ثرتی ہو رہی تھی۔ پیشتر عورت کی زندگی کیسر غلامانہ تھی، لیکن اب اسے اتنے حقوق حاصل ہو گئے جو پھر کبھی زمانہ مابعد میں نہیں نصیب ہوتے۔ رومنہ میں شروع سے ازدواج کے دو بالکل مختلف طریقہ رائج تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ عورت کا ہاتھ شوہر کے ہاتھ میں دیدیا جاتا جو اس وقت سے ہر طرح پر اس کی جان و مال کا مالک ہو جاتا تھا۔ یہ طریقہ بہت مضبوط و مستحکم خیال کیا جاتا تھا اور جمہوریت کے زمانہ میں اسی کا عام رواج رہا۔ اس کی تین مختلف صورتیں تھیں ایک وہ جس میں کبھی علیحدگی ہو ہی نہیں سکتی تھی اور جو بالکل ایک مذہبی رسم تھی۔ دوسری ایک محض معاشری رسم تھی۔ اور تیسری کا مدعا یہ تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد کو سال بھر کی مدت تک بغیر کسی دوسرے کے دخل و تصرف کے مباشرت کا حق حاصل رہتا تھا۔ جمہوریت کے خاتمہ کے ساتھ اس طریقہ ازدواج کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اب ایک دوسرا طریقہ عام ہو گیا جس میں کوئی مذہبی یا معاشری رسم وادائیں کی طاعت تھی اور جس کے لئے صرف ذیقین کی رضامندی کافی تھی۔ اس طریق ازدواج سے قانوناً عورت اپنے باپ ہی کے خاندان میں شامل رہتی تھی۔ شوہر کو اس پر کوئی حق نہیں حاصل ہوتا تھا۔ اور وہ قانونی حیثیت سے خود مختار رہتی تھی۔ ایک جہیز کو چوڑ کر کہ وہ البتہ شوہر کے قبضہ میں ملایا جاتا اور باقی اپنی تمام جائیداد کی مالک وہ خود رہتی تھی۔ اپنے باپ کی وراثت میں پورا حصہ پاتی تھی غرض ہر حیثیت سے وہ آزاد و خود مختار رہتی تھی۔ اس دستور کا ایک خاص اثر یہ ہوا

کہ بڑی بڑی جاہلادیں عورتوں کے قبضہ میں آگئیں ملک کی ثروت کے بڑے حصہ کی وہ مالک ہو گئیں اپنے شوہروں پر حکومت کرنے لگیں۔ شوہروں کی حیثیت محض اُن کے کارکن یا کارندہ کی رہ گئی بلکہ مشہور توہیاں تک سب کہ اکثروں نے اپنے شوہروں کو گراں شرح سود پر قرض دینا شروع کیا۔

عورت کی اس قانونی آزادی اور جدید طریقہ ازدواج کے دو خاص اثرات یہ ہوئے: (۱) اول عورت کی عظمت میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ پہلے نظام خاندان کی بنیاد انفسری و ماتحتی پر تھی اب اشتراکِ معادنت پر قائم ہو گئی۔ تداامت پرست طبائع کو یہ قدر ثاناگو اگر گزرا اور بعض قوانین ایسے منظور کرائے گئے جن کی بنا پر عورت کی آزادی کو محدود کرانے کی کوشش کی گئی لیکن ان قوانین کا بعض حالتوں میں نفاذ ہی نہیں ہوا اور جب کہی ہوا بھی تو بعد چندے منسوخ ہی ہو گئے۔

(۲) دوسرا اور اہم تر اثر یہ پڑا کہ اب نکاح کا انحصار زن و شوہر کی موافقت پر رہ گیا جب اُن کی خوشی ہوئی شادی کرتے اور جب چاہتے انفرق کر لیتے اور اس طرح طلاق کی گرم بازاری ہو گئی۔ بات بات پر شوہروں نے اپنی بیویوں کو چوڑا شروع کر دیا۔ ایک صاحب جو اس معاملہ میں بہت ہی آزاد تھے اُن پر لوگوں نے اعتراض کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ”حضرت آپ تو چمڑے کی چمک دمک و خوش بختی کو دیکھتے ہیں آپ کو یہ کیا خبر کہ جو تہ کے اندر کون سی کیل میرے پیر میں چھ رہی ہے“ ایک عورت نے ۵ سال کے عرصہ میں ۸ شوہر کئے ایک اور عورت نے ۱۰ نکاح کئے سب سے بڑھ کر سینٹ جروم کی یہ روایت ہے کہ ایک عورت نے جو ۲۲ شوہروں کے عقد میں رہ چکی تھی ایک تیسواں نکاح کیا ایسے شخص کے ساتھ جو ۲۰ بیویاں چوڑ چکا تھا اور یہ اُس کی اکیسویں بیوی ہوئی!! بڑے بڑے مشاہیر یہ کرتے تھے کہ جو عورت غیر کی منکوحہ پسند آگئی اُس کے شوہر پر دباؤ ڈال کر اُس سے طلاق دلا کر خود شادی کر لی۔ اکثر ایسے ہی تھے جو اپنے احباب و اعزہ کی خاطر سے خود اپنی بیویاں چوڑ چوڑ

انہیں بیاہ دیتے تھے طلاق کی اس غیر معمولی گرم بازاری کو تا مگر قانون مردوجہ کا معطل نہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں بہت بڑا دخل معاصرانہ بد اخلاقیوں کو بھی ہوتا تھا۔ جب طینت خراب ہو جاتی ہے اور طبیعت اخلاق شکنی پر مائل رہا کرتی ہے تو قانون ایک بہانہ مل جاتا ہے۔ اس بد اخلاقی کے سیلاب کو اگر قانون دبا جا رہتا ہے تو نہیں دبا سکتا تھا۔ اگر اس وقت قانون نے طلاق کو جائز نہ کر دیا ہوتا تو یہ لوگ یقیناً چوری چھپے آشیائوں اور بد چلنیوں میں مصروف رہتے۔

میں جلد گزشتہ کی کسی فصل میں کہہ آیا ہوں کہ ماضی میں برخلاف زمانہ حال کے بہ مقابلہ رذائل کو مغلوب رکھنے کے فضائل کو اُبھارنے کی قوت زیادہ تھی اسی لئے اس وقت جہاں معاصی کی کثرت تھی وہاں اُن کے پہلو بہ پہلو محاسن کو بھی خوب فروغ رہتا تھا۔ اس کلیہ کی ایک اور شہادت اعمال متعلق بہ جذبہ جنسی میں ملتی ہے۔ آوارگی، بد چلنی، شہوت پرستی، شاہ بازی، وجہ ایم خلاف وضع فطری کی جس قدر گرم بازاری دومہ کے دربار میں تھی، آج یورپ میں کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی سکتی۔ تاہم اس اخلاق شکنی کے سیلاب عظیم کے درمیان وفاداری، ناموس پرستی، عصمت طینتی کے بھی حیرت انگیز نمونہ بکثرت ملتے ہیں معاشرت کی لوگی کا یہ عالم تھا کہ آگسٹس کی لڑکیاں اور پوتیاں سینے پر دسے کا کام کرتی تھیں اور اُس کی پوشاک کا اکثر حصہ اس کی بیوی اور بہن کے ہاتھ کا بنا ہوتا تھا۔ امور خانہ داری خصوصاً کپڑے بننے میں سیدقہ عورت کا خاص جوہر تھا جاتا تھا۔ علم و تعلیم کا چرچا خواتین میں بہ کثرت تھا اور ازدواجی الفت کا بیک محجم خواتین ذیل میں نظر آتا ہے۔ پاپی کی بیوی کا رنیکیا، سنیکا کی دوست مارسیا، اور سنیکا کی والدہ ہلویا مثالی امی کے متعدد شہر خصوصاً پیڈوا اور بریسیا طبقہ نوبل کی عفت شکاری کے باب میں شہرت رکھتے تھے۔ اسی کے زمانہ میں ایک امیر لیڈی میلوینا پر جب نا ابرائیس نے دراز دستی کرنا چاہی تو اُس نے اپنے شکم میں خنجر بھونک کر اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا۔

پورٹیا (زوجہ بروٹس) پالینا (زوجہ سنیکا) اور آیریا (زوجہ پیٹس) سے بڑھ کر دنیا میں
کس خاتون نے استقلال ناموس پرستی و جانبازی کی مثال پیش کی ہے؟ ناظرین ان کے
مختصر حالات حاشیہ میں ملاحظہ کریں۔

شوہر کی وفات پر خودکشی کر لینا شوہر کی ساتھ از خود جلا وطنی میں چلے جانا اور نازک
نازک موقع پر بھی شوہر کا ساتھ دیئے جانا یہ ایسے واقعات ہیں جن کے متعدد شواہد اسی زمانہ

۱۷ بروٹس جب انقلاب حکومت کے متعلق گہری سازشوں میں مصروف تھا تو اسے مفکر و چکر پورٹیا کو یہ فکر پیدا
ہوئی کہ وہ بھی اس کی پریشانیوں میں شرکت کرے لیکن رازداری کی شرط پڑی سخت تھی بروٹس کو اس کا یوں کر اطمینان ہو سکا
تھا کہ پورٹیا کبھی اور کسی حالت میں اس کے راز کا افشاء نہ کرے گی؟ اپنے استقلال و ہمت کا ثبوت دینے کے لئے اس نے
خود اپنی رائے میں چھپی ماری۔ اور اس امتحان مضبوطی میں جب پوری اتر چکی جب جا کر اس نے اپنے شوہر سے محرم راز سننے
کی خواہش کی۔

۱۸ سنیکا جب غلاموں کے ہاتھ سے مارا گیا ہے تو پالینا نے مٹا اپنی ویدوں کے منہ بھی کھول دیئے تاکہ خون نکلے
نکلے خود بھی وفات پا جائے۔ خون کی دہار جاری ہو گئی اور بہت سا خون نکل گیا اس وقت اس کے غلاموں کی
نظر پڑی۔ انہوں نے جھپٹ کر ویدوں کے منہ بند کئے اور زخم کی مرہم پٹی کی۔ مگر پالینا کو اس سے جولا غری و
نقاہت ہو گئی تھی وہ مدت العمر قائم رہی۔

۱۹ پیٹس کو یہ حکم نادر دی ملا کہ اپنے ہاتھ سے اپنے تئیں ہلاک کرے اور خچر ہاتھ میں دے دیا گیا۔ آیریا وہاں موجود
نہ تھی جو فنی اُسے یہ خبر پہنچی اس ارادہ سے پہلی کہ شوہر کے ساتھ ہی اُس کے پہلو پہ پہلو اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کرے گی
اعزہ نے بہت روکنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ داماد نے آکر عرض کیا کہ ”اگر مجھے مزا سے موت کا حکم ملے تو کیا آپ
اپنی لڑکی کی خودکشی جائز رکھیں گی؟“ اس جواغزو خاتون نے جواب دیا کہ ”بیشک اگر اُسے مٹا رہے ساتھ ایسا
ہی جین اور شکمل چکا ہو جیسا مجھے اپنے شوہر سے ملا ہے“ جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو اعزہ نے اُسے
کرہ میں بند کر دیا۔ بیاں اس نے اپنے سر کو دیوار پر اس زور سے دے مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑی اور ہوش
میں آئے ہی کہا کہ مجھے عزت کی موت سے روکنے ہو تو ذلت کی موت سے تو ہنس روک سکتے“ بالآخر ضعیف
چیرتی ہوئی اُس مقام پر پہنچی جہاں پیٹس خنجر بکھٹ کھڑا ہوا تھا اور حب حیات ہاتھ کو جنبش نہیں ہونی دیتا تھا آیریا
نے اسکی لکٹکش دیکھ کر معاذہ خنجر اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سینہ میں بہنک لیا اور وہی خوں افشان خنجر اُسکے
ہاتھ میں دے کر بولی کہ ”دیکھا پیارے پیٹس اس میں ذرا بھی کلیفت نہیں ہوئی؟“

کی رومی بیویوں میں ملتے ہیں۔ رومی تاریخیں اس طرح کے متعدد تذکروں سے پڑھیں اور ان سے زیادہ بلیغ وہ یاد گاری کتبائے ہیں جن میں بیوی کی عاشقانہ و دالمانہ وفاداری کو ان کا سب سے بڑا جوہر دکھایا گیا ہے۔ رومی تابوت سنگین پر جو تصویر کھینچی رہتی تھی اس سے زیادہ پُر اثر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ یہ کہ میاں بیوی دونوں نہایت سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح زندگی میں دونوں ایک جان دو قالب رہے اُسی طرح موت بھی انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔

شہنشاہیت کے آخری دور میں حکومت نے سیہ کاریوں کا سد باب کرنا چاہا۔ چنانچہ ڈومینین نے جرایم خلاف وضع فطری سے متعلق تعزیری قانون نافذ کیا، دسپیسین نے دربار کے نقیش کو گٹھایا، میکینٹیس نے زانی و زانیہ کو ایک میں بند ہوا کر زندہ جلائے جانے کا حکم دیا، مرد و عورت کے ساتھ نہانے کے دستور کو ہیڈرین و الگزنڈر سیورس نے کم کیا اور قسطنطین نے بالکل بند کر دیا۔ اور دتالوں اور میر شکاروں کے قلع قمع میں الگزنڈر سیورس و فلپ نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہ تمام یہود گیاں اتھونانیس کے عہد کے بعد سے ازخود بہت گھٹ گئیں تاہم ان کے استیصال میں بہت بڑا دخل اس امر کو ہے کہ پایہ تخت روم سے قسطنطنیہ کو منتقل ہو گیا اور مسیحیت نے بڑا اصلاحی اثر ڈالا۔

خالص اخلاقی حیثیت سے اس دور میں جو تغیرات ہوئے ان میں سے ایک اہم تغیر یہ تھا کہ شروع میں جو وفا شعار بیوی کے لئے مخصوص تھی وہ اب شوہر پر بھی واجب سمجھی جانے لگی۔ یونانیوں میں یہ خیال بیشک ابتدا سے موجود تھا لیکن رومیوں کے ذہن میں اگر یہ تخیل تاہی تو کم از کم اس پر عمل کبھی نہیں تھا۔ زنا کاری کا مفہوم ان کے یہاں صرف اس قدر تھا کہ بیوی نے امانت میں خیانت کی لیکن اب یہ صورت حال تبدیل ہو گئی۔ ارسطو تو شروع ہی سے اس کا مؤید تھا لیکن اب پلوٹارک و سینیکا بھی پوری قوت و زور کے ساتھ ہی تعلیم دینے

لگے کہ شوہر پر حقوق کے ساتھ فرائض بھی عاید ہیں اور حقد بر بیوی پر ازدواجی امانت ادا
فرض ہے اسی قدر شوہر پر بھی۔ انٹونینس پی اس نے ایک عورت کے مقدمہ کے فیصلہ میں
اس کے شوہر کے استغاثہ پر یہ فقرہ کیا خوب لکھا کہ

”ہاں اس عورت پر زنا کاری کی حد ضرور جاری کی جائے بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ تم نے

خود اپنی زندگی سے اسے وفاداری و امانت کا سبق دیا ہے۔ بیوفا شوہر کو بیوی سے وفاداری
کی توقع رکھنے کا کوئی حق نہیں۔“

اسی زمانہ کی ایک خاتون زوجہ سیپیو کا یہ ایک پُر اثر واقعہ منقول ہے کہ اُس کا شوہر
ایک لونڈی پر فریفتہ تھا جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو اُس نے لونڈی کو بھی یہ لکھر فوراً آزاد
کر دیا کہ میں اپنے پیارے شوہر کی معشوقہ پر حکومت نہیں کر سکتی۔

دوسرا اہم تغیر فلسفہ فینا غورث و فلاطونیت جدید کے اثر سے یہ ہوا کہ عصمت و عفت
قطع نظر ان پیسید نتائج کے بجائے خود مستحسن و محمود سمجھی جانے لگی۔ ورنہ پیشتر بت پرستوں کا یہ
عام اعتقاد تھا کہ بے عصمتی صرف ازدواج کے بعد محبوب ہے کہ اس سے نظام خاندان میں اتاری
پہلے ہی ہے کیٹو دسترس وغیرہ کے نزدیک قبل ازدواج کے کسی بد چلنی میں عیب نہ تھا۔ خود
ستسہرہ کی تقریر کا یہ فقرہ موجود ہے۔

”اگر ہم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ نوجوان کو طوائفوں کی صحبت سے بالکل محترز رکھنا

چاہئے تو میں کہوں گا کہ اس کا خیال بہت ہی سخت ہے کچھ تک کس نے اس کی پابندی کی

ہے؟ اور آج کل کیا قدامتیں کب کوئی اس خیال کا گزرا ہے؟ کب اور کس زمانہ میں کسی نے

اس کے جواز پر شبہ کیا ہے؟“

خود ایسکینیس جیسا نشک فلسفی بھی اسے کچھ زیادہ معیوب نہیں قرار دیتا۔ اور الگزٹڈر سیور

جو بد چلنیوں کے استاد میں نسب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، جب کسی ناکھدا شخص کو صوبہ کی

گورنری تفویض کرتا تھا تو جہاں اُس کے خدام وغیرہ کا انتظام کرتا تھا وہاں اُس کے لئے ایک

کنیز کا بھی اہتمام کر دیتا تھا کیونکہ یہ قول مورخین کے بلا اس کے گزر ممکن ہی نہ تھا۔

اس عام حالت کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ بعض مثالیں اس کے مخالف بھی ملتی ہیں گو شمار میں قلیل ہیں تاہم وزن سے خالی نہیں۔ موسونیس رومن اس کی بالخصوص دتیرزوں تعلیم دیتا تھا کہ جب زچ کے تمام تعلقات مابین مرد و عورت ناجائز ہیں۔ دیون کریر وسم چاہتا تھا کہ طوائفوں کا پیشہ قانوناً ممنوع قرار پا جائے۔ اپولونیوس نے ساری عمر اس خیال سے تجرد میں گزاری کہ ازدواج بھی اخلاق کے اعلیٰ معیار سے پیست ہے۔ ملکہ زویہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت پر راضی نہ ہوئی بجز اس صورت کے جب ایسا کرنا ولیعہد سلطنت کو وجود میں لانے کے ضروری ہو گیا۔ ہاپشیا کی گو شادی ہو گئی تھی تاہم وہ عمر بھر باکرہ رہی یعنی شوہر کو کبھی اپنے ساتھ صحبت نہ کرنے دی۔ تیسری صدی میں یہ خیال ان لوگوں میں عام ہو گیا تھا کہ ازدواج بھی ایک دنیوی آلائش ہے اور آلائش دنیوی سے جہاں تک ممکن ہو بچنا چاہئے۔ مارکس آریلیس جولین دونوں کی بیویوں کا انتقال ہو گیا تھا اور دونوں بڑے پاکباز و متقی تھے تاہم اتفاقاً کے نخل میں اس عرصہ میں اتنا فرق ہو گیا تھا کہ مارکس آریلیس نے ایک کنیز رکھ لی۔ یہ خلاف اس کے جولین نے بقیہ عمر بالکل تجرد میں گزاری۔

فصل (۳)

مسیحیت کا اثر

واقعات بالا سے جنہیں بیان بغیر کسی حرج و تنقید کے صرف نقل کر دیا گیا ہے ناظرین کو اس کا اندازہ ہوا ہو گا کہ ابتداءِ رومہ کے جذبات اس بارہ میں کیا تھے اور اب انہیں رفتہ رفتہ کیونکر ترمیم ہوئی جاتی تھی۔ اس تغیر و ترمیم میں مشرقی مذاہب فلسفہ کی کافی تائید شامل تھی تاہم اس میں سب سے زیادہ دخل جس سے کہ تہا وہ مسیحیت تھی مسیحیت نے عصمت

کو اتم الفضائل قرار دیا تھا اور عملاً اسے قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کی تدابیر و وسائل سے کام لیا تھا۔ سلاطین نے اس باب میں سخت سے سخت قوانین نافذ کئے۔ میر شکاروں کے لئے یہ سزا قرار پائی کہ کچلا ہوا سیسہ انھیں پلایا جائے لگا۔ زنا بالجبر کے جرم میں زانی اور اگر زانیہ کی کچھ بھی رضامندی پائی گئی تو اس کی بھی سزا موت قرار پائی۔ ایک ٹرسوں کو اس کی اجازت مل گئی کہ پیتمہ لینے کے بعد فوراً اپنا پیشہ چھوڑ سکتی ہیں۔ رقاہ لڑکیوں کے پیشہ کو پہلے تو پادریوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پھر آخر میں اسے بند ہی کر دیا۔

مسیحی قانون کی تائید مسیحی شریعت نے کی۔ بے عصمتی سخت سے سخت عذاب کی سختی قرار دی گئی۔ جرایم خلاف وضع فطری کو نپولے اور توحہ مائیں جو اپنی لڑکیوں کو طوائفوں کے پیشہ میں شامل کراتی تھیں حصول تبرکات سے محروم کر دی گئیں۔ مردوں کی نخیل پر کنواری شہیدانہ کلیسا کے تقدس و احترام کی تصویر کا بچہ اثر پڑا۔ غریب خادمہ لمبٹڈینا جو کلیسا میں شہید ہوئی اس سے روشن تر زندگی کس کی ہوگی؟ یاسینٹ پر پیٹوا کی عین شہادت کے وقت جو واقعہ پیش آیا وہ کس قدر موثر ہے! یہ پاک و معصوم کنواری جب ایک سانڈ کے آگے ہلاک ہونے کو ڈال دی گئی اور اس نے اپنے سینگوں سے اچھال کر اسے اکھاڑہ کی زمین پر پھینک دیا تو اس حالت بیہوشی و نزع میں جو کام اس خاتون نے کیا وہ یہ تھا کہ جلدی سے اپنی پوشاک برابر مگر لی کہ بے پردگی نہ ہونے پائے۔

یہ تو تاریخی واقعات تھے، لیکن ان کے پہلو بہ پہلو صد ہا قصہ و افسانہ بھی ایسے مشہور ہو گئے، جو اگرچہ روایتاً بالکل ناقابل اعتبار ہیں تاہم ان سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کی تخیل اب کن روایات کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھی ان میں سے ہم بعض یہاں نقل کرتے ہیں سینٹ جروم کی روایت ہے کہ ڈایو کلیٹین کی قدیوں کے زمانہ میں ایک نوجوان مسیحی ریشمی ڈوریوں میں کسا ہوا ایک نہایت خوش نمایاں کے اندر تنہا بیٹھا ہوا تھا، جہاں ہر قسم کا سامان عیش و عشرت موجود تھا اتنے میں ایک حسین طوائف آئی اور لگا وٹ کی باتیں کرنے

لگی مگر مسیحی نے اس کے سارے اظہار عشق کا جواب یہ دیا کہ اپنی زبان دانتوں سے کاٹ
 کر اس کے اوپر تھوک دی انجمن مسیحی نوجوان عورتوں کا بھیس بدل کر ان عورتوں کے
 ہاں جاتے تھے جنہیں مجبوراً طواہف کا پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا اور اپنا لباس انھیں پہنا کر انہیں
 آزادی دلا دیتے تھے۔ خاتون سینٹ الگنس کی بابت یہ روایت تھی کہ جب اُسے برہمنہ
 کر کے اُس پر ہانپانوں کی مار پڑنے لگی تو ہر شخص نے اپنی انگلیں بند کر لیں مگر ایک نوجوان
 اسے دیکھتا رہا۔ اس عجیبائی کی سزا اُسے یہ ملی کہ بصارت جاتی رہی۔ ایک اور خاتون کے
 سینہ میں پھوڑا پیدا ہوا اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ کسی طبیب کو دکھائے آخر اسے خدا نے خود بخود
 اچھا کر دیا۔ چلن عورتوں اور شیاطین میں خاص تعلق سمجھا جاتا تھا۔ ایک عورت کے سر پر
 آسیب تھا اُسے ایک سینٹ کے پاس لائے۔ اُس نے فوراً بتا دیا کہ اُس کا کوئی آشنا موجود
 ہے۔ ایک طواہف نے ایک اور سینٹ پر اہتمام لگایا کہ وہ اُس کے عاشق ہیں مگر جو فیس
 دینے کو کمی تھی وہ نہیں دیتے۔ سینٹ موصوف نے جب یہ سنا تو رستم مطلوبہ تو فوراً ادا کر دی
 مگر ساتھ ہی طواہف کے سر پر آسیب بھی آگیا۔ متعدد خواتین جو آگے چل کر سینٹ ہوئیں ابتداء
 طواہفیں تھیں سینٹ ڈیٹیلیس ہر شب کو اپنے ہمسایہ کے طواہفوں کے یہاں جاتے تھے انھیں
 روپیہ دیکر اس کا عہد لیتے تھے کہ وہ کم از کم اس رات کو حرام کاری سے محترز رہیں گی۔ اور خود
 ان کے حق میں دعا کرتے تھے۔ سینٹ سر اسن کی بابت یہ روایت منقول ہے کہ جب وہ بصرین
 دورہ کر رہے تھے تو ایک طواہف نے انھیں اپنے پاس بلایا۔ یہ وقت مقررہ پر اُس کے پاس
 گئے مگر یہ کہہ کہ میں ایک شغل سے فائز ہوں تو مخاطب ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے زانو
 کے بل کھڑے ہو کر باؤ ازل بند اپنے اور اپنے میزبان کے حق میں بہ کمال تضرع و الحاح دعا مانگنا
 شروع کر دی۔ اس منظر سے طواہف بغایت متاثر ہوئی، یہاں تک کہ اُس کے آنسو نکلنے لگے اور
 وہ خود بھی سینٹ کے ہمراہ زانو ٹیک کر دعا مانگنے میں شریک ہو گئی۔ سینٹ کا خضوع و خشوع
 بڑھا گیا اور لہجہ و آواز میں زیادہ رقت و درپیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ ساری شب اسی عالم

میں گزر گئی اور جب صبح طلوع ہونے لگی تو طوائف نیم مردہ ہو کر سینٹ کے قدموں پر یہ چلائی
 ہوئی گر پڑی کہ میں اپنے سارے گناہوں پر توبہ و استغفار کرتی ہوں مجھے اللہ بچا لو۔
 لیکن رہبانیت کے یہ اثرات جہاں ایک طرف عصمت و عفت کی ترقی دینے کے حق
 میں نہایت مفید تھے، وہاں دوسری طرف نکاح کی وقعت کو بھی لوگوں کی نظر میں بہت
 گھٹانے والے ثابت ہوئے اس وقت کے سارے پادریانہ لٹریچر کے ضخیم دفتر میں صرف دو تین
 اقوال نکاح کی تائید میں ملتے ہیں ورنہ عموماً یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ازدواج ایک طرح کی معصیت
 ہے جو صرف اس لئے جائز ہے کہ اس کے وساطت سے آدمی بزرگ تر معاصی سے محفوظ رہے
 نیز اس لئے کہ بھائے نسل ہو ورنہ تقویٰ تو اسی میں ہے کہ انسان ہمیشہ مجرد رہے اس نقطہ
 خیال سے اولاً تو نکاح فی نفسہ معیوب تھا اور پھر اگر کہیں ہو بھی جاتا تو اس کی کوشش ہوتی
 کہ افتراق ہو جائے اور یہ بھی نہ سہی تو میاں بیوی تو بہر حال اتنا تو ہو کہ میاں بیوی ہمبستر سے
 محترز رہیں شہنشاہ دوم ہنری ثانی، شاہ انگلستان ایڈورڈ تیسرا، شاہ اسپین الفاسونانی
 ان سب کی شادیاں اس اصول پر ہوئیں۔ اس سلسلہ میں گال کے ایک فوجوان امیر کا قصہ
 بہت دلچسپ ہے۔ شادی کی پہلی رات کو اس کی محبوبہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے
 کہا کہ میں نے ہمیشہ باکرہ رہنے کا عہد کیا ہے اور شادی صرف تمہاری محبت کی خاطر سے کی
 ہے عاشق شوہر نے کہا کہ مجھے تیرے عہد کا پاس ہر طرح منظور ہے۔ چنانچہ سالہا سال گزر گئے
 اور عاشق و معشوق دونوں اپنے عہد پر قائم رہے۔ اس کے بعد جب بیوی کا انتقال ہو گیا اور
 شوہر اُسے قبر میں اتارنے لگا تو یہ کمال قناعت کہا کہ ”پروردگار میں نے اُسے جس طرح باکرہ
 پایا تھا اسی طرح باکرہ بھی واپس کرتا ہوں۔“ اس پر عورت کی لاش متبسم ہوئی اور بولی کہ بھروسہ
 شے کی بابت تم سے سوال نہیں کیا جاتا اُس کا کیوں اظہار کرتے ہو؟ کچھ روز کے بعد جب ہر
 کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ علیحدہ مدفون ہوا، تو ملائکہ نے اس کا تابوت اٹھا کر اُس کی بیوی کے
 پہلو میں رکھ دیا۔ بہت سی مثالیں ایسے لوگوں کی بھی ملتی ہیں جو اپنی بیویوں کو چوڑ چوڑ کر

صحرانین ہو گئے۔ اور بہت سے ایسے افراد بھی گزرے ہیں جنہوں نے گو اپنی بیویوں کو باضابطہ طلاق نہیں دی لیکن ان سے کسی قسم کا تعلق بھی نہیں رکھا۔ بعض ایسے مصنفین جن کی شادی ہو چکی تھی فضیلتِ تجرد پر تصانیف لکھتے اور اپنی ذاتی بد قسمتی پر سخت ماتم کرتے۔

ان عقاید و تعلیمات سے خانگی زندگی میں سخت اتبری پھیل گئی اور اس خوف سے دشمنہ مقتدایانِ کلیسا نے یہ فرمان جاری کر دیا کہ جب تک میاں بیوی دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن جو راہبانہ نصب العین چل پڑا تھا وہ اس فرمان سے نہ بدل سکا اور وہ مدتوں کسی نہ کسی شکل میں گر جا رہا تھا۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ میں صدیوں تک یہی اعتقاد قائم رہا کہ کسی مذہبی رسم و جشن میں شریک ہونے کی رات سے پشتر زن و شو کو ہمبستری سے محترز رکھنا چاہئے اور اگر کوئی اس کے خلاف کرے گا تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ چنانچہ خوش اعتقاد دی نے ایسی عورتوں کی مثالیں بھی گناہیں، جنہوں نے اس شرط کو پورا نہیں کیا اور اس کی پاداش میں دنیا ہی میں انھیں سزا مل گئی اور بارہویں صدی میں البیرک نے خواب میں جہنم کا وہ پرہیزگار منظر دیکھ لیا جس میں طرح طرح کے دردناک و دہشتناک عذاب ان لوگوں کے لئے تیار ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے۔

ازدواج کو اس راہبانہ نظر سے دیکھنے کے دو اور خاص اثرات پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ عقد ثانی بالکل ممنوع قرار پا گیا اور دوسرے مقتدایانِ کلیسا میں تجرد کا شوق بہت پیدا ہو گیا۔ ان میں سے اول الذکر یعنی عقد ثانی کی کراہت کا پتہ قدیم رومیوں کے ہاں بھی چل رہا ہے جن کا خیال یہ تھا کہ مرد کو بیوی کے ساتھ اس درجہ الفت و شفیقتی ہونا چاہئے کہ اس کی موت کے بعد دوسری شادی کا تصور بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ درجہ انیکٹس، وغیرہ کے صفحات میں جا بجا یہ خیال پایا جاتا ہے۔ ایک اور رومی شاعر کہتا ہے کہ بیوی کی زندگی میں اس سے محبت رکھنا ہماری راحت ہے لیکن اس کی موت کے بعد اس محبت کو قائم رکھنا ہمارا مذہبی فرض ہے۔ اس رومی خیال کی پابندی علی زندگی میں بیوی کے اوپر نہایت لازمی تھی، لیکن

شوہر ہر چندان ضروری نہ تھی اور جہاں کہیں تھی بھی تو صرف اس بنا پر کہ اگر اس کے اولاد موجود ہے تو سوتیلی ماں کے آنے سے اُسے تکلیف ہوگی۔

رومیوں کے اس خیال کو مسیحیت نے بیحد تقویت دیدی۔ گو اس نتیجہ کے مقدمات اُن کے پاس بالکل مختلف تھے، پہلے شوہر کی محبت کا اُن کے یہاں کہیں ذکر بھی نہ تھا۔ اُنہوں نے اس رسم کی جو مخالفت کی تو اس بنا پر کہ اُن کے نزدیک عقد ثانی و ثالث کے محرکات ضرر جذبات شہوانی ہو سکتے تھے بعض گروہوں نے تو اُسے بالکل ممنوع ہی قرار دیدیا۔ لیکن گروہ کثیر جس نے اسے جائز رکھا اُس نے ہی بہ اکراہ اور بادل ناخواستہ ایک پادری صاحب کا مقولہ تھا کہ عقد ثانی ایک دوسرا نام ہے زنا کاری کا۔ ایک اور پادری صاحب فرماتے ہیں کہ ”عقد ثانی کرنے والے کی نجات تو مسیح کی سفارش سے ہو جائے گی، لیکن اُسے مسیح کی خوشی کہی حاصل نہیں ہو سکتی۔“ اس طرح کے اور بہت سے اقوال موجود ہیں۔ مذہبی مراسم کے مقتدا بعض مخصوص حالات میں وہ لوگ ہو سکتے تھے جو خود پادری نہ تھے، لیکن جو شخص عقد ثانی کا متکب ہو چکا ہوتا وہ کہی اور کسی حالت میں یہ اعزاز نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ غرض اس طرح عقد ثانی مسیحوں کے یہاں گویا بالکل ممنوع ہو گیا۔

اب دوسرے اثر یعنی ارباب کلیسا کے تجرد کو لیجئے جس پر میری گفتگو لا محالہ بہت مختصر ہوگی کیونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس پر بہت بڑی بحث ہی شاید کافی نہ ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قابل لحاظ یہ حقیقت ہے کہ گوارا دواج کا جواز شروع سے مقدس ایمان مسیحیت کے لئے موجود تھا تاہم ازدواج کی کراہت بھی شروع سے مسلم تھی اور کلیسا کی مقدس جماعت کا دامن خصوصاً اس کراہت سے پاک رہنا چاہئے تھا۔ یہ خیال ان دو تقریبات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اول یہ عام اعتقاد کہ پادریوں کے لئے عقد ثانی یا عقد بیوگان قطعاً ناجائز ہے یہ اعتقاد اوایل مسیحیت سے موجود تھا اور متعدد صدیوں تک قائم رہا۔ ثانیاً یہ خیال کہ پادریوں کے لئے یہ بشرط تقویٰ ہے، بلکہ آگے چلکر تو یہ اُن کے فرائض میں داخل ہو گیا کہ اپنی بیویوں کے ساتھ مہبتری

سے محرز رہیں۔ شروع شروع میں یہ شرط لازمی نہیں قرار پائی، لیکن چوتھی صدی میں پادریوں کے لئے اہل ایک جرم قرار پا گیا۔ تاہم شادی کا دستور عملاً مسدود نہ ہو سکا، بلکہ بڑے بڑے زور شور سے جاری رہا۔ کلیسا نے اس بارہ میں جو عجیب و غریب مختلف طرز عمل اختیار کئے، اُن کے مطالعہ سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ بخرد۔ یہ کیا کیا نقصانات پیدا ہوتے رہے ہیں بعض ناواقفوں کو خیال ہے کہ اصلاح کلیسا سے ذرا پیشتر جو بد اخلاقی خائفا ہوں میں شائع تھی وہ عیدم النظیر تھی، لیکن دراصل یہ خیال بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جن لوگوں نے چند صدیوں پیشتر کے کاغذات و مواد تاریخی کا براہ راست مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے لیکر بارہویں صدی تک جو بد اخلاقی و بد چلنی رائج رہی اُس سے زائد ہرگز بعد کو نہیں ہوئی خصوصاً دسویں صدی میں تو خود پاپاؤں کی زندگی فسق و فجور کی زندگی ہوتی تھی بد چلنی و درشت ستانی کا بازار گرم تھا۔ چشتی سردار نو عمری میں متاہل ہو کر ضبط نفس بالکل کو بیٹھے تھے اور کلیسا کے مقتدی بن بن کر طرح طرح کی حرام کاریوں میں مصروف رہتے تھے یہ قول دسویں صدی کے ایک اطالوی پادری کے، اگر فطری اصول کے نظر سے دیکھا جاوے تو ایک پادری ہی اپنے عہدہ کا اہل نہیں تھا۔ پادریوں پر ایک خاص ٹیکس اس معاوضہ میں لیا جاتا تھا کہ انہیں کینزوں کے رکنے کی اجازت رہے۔ شادی کی اب بھی بعض استثنائی صورتوں میں اجازت مل جاتی تھی لیکن متعدد مجلسان کلیسا اور بڑے بڑے مشاہیر پادریوں نے اسے اصولاً بالکل ناجائز ہی رکھا اور اس سے بد اخلاقی کو جتنی تحریکیت ہوئی رہی وہ اظہر من الشمس ہے۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی طرز زندگی کو فاسقانہ سمجھ لیتا ہے تو پھر اُسے کسی گناہ میں باک نہیں رہ جاتا۔ پاپاؤں نے جب بار بار کہہ کہے پادریوں کی نظر کے سامنے اُن کی زندگی کو فسق و فجور کا مجسمہ بنا دیا تو ان کی زندگی واقعہ ہی ایسی ہی ہو گئی۔ خود پاپا سے اعظم جان بست سوم جون کاہری اور خود اپنی مان بہن کے ساتھ زنا کاری کے مرتکب ثابت ہوئے کسٹری کے اسقف جو اسلئے اع میں صرف ایک موضع میں، ناجائز بچوں کے والد بن گئے! اسپن کے

ایک اُسقت جو ۳۰ سالہ میں ۱۰ کنیزیں رکھے ہوئے تھے ہنیری سوم سینٹر کے پادری جن کی ۵۰ ناجائز اولادیں ۳۰ سالہ میں نکلیں! آں سب کو مستثنیات سمجھ کر تھوڑی دیر کے لئے ان سے قطع نظر بھی کر لیجئے۔ تاہم اسے کیا کیجئے گا کہ اس زمانہ کے پادریوں کی عام بدچلنی و شہوت پرستی کے ثبوت میں مستند شواہد کے دفتر کے دفتر موجود ہیں۔ اچھوتیوں کی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں، بلکہ حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے، حرام کاری و شہوت پرستی کے جوش میں محرمات و غیر محرمات کی تمیز اٹھ گئی تھی، چنانچہ بار بار اس طرح کے قوانین کو نفاذ کی ضرورت پیش آتی رہی کہ پادری اپنی ماؤں اور بہنوں سے الگ رہیں۔ اعلام اور شاہ بازی کی گوسمیت نے بیخ کنی کی، لیکن خانقاہوں کی چار دیواری کے اندر اس کی سرپرستی قائم رہی۔ خود ناچین کی یہ حالت تھی کہ وہی سب سے زیادہ آلودہ معاشی رہتے تھے بارہویں صدی میں بابا صاحب کے ایک سفیر انگلستان میں وعظ کے لئے تشریف لاتے۔ کلیسا کے اخلاقی انحطاط پر انہوں نے شدید سے وعظ کیا لیکن ابھی اس کو چند گھنٹہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ لوگوں نے دیکھا وہ اپنے خلونکہ ایک طوائف کے ساتھ لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے ہیں! یہ سب کیا ہوتا؟ وہی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھی کہ شادی و نکاح کے پاک و فطری طریقہ کے انسداد کی کوشش کی جاتی تھی۔ پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستہ کو روکنے کا تو وہ حوض کے اندر لاجالہ گندگی و تعفن پیدا کر کے گا۔

اسطین دین کی یہ بد اخلاقی لازمی طور پر متعدی ثابت ہوئی۔ اب یہ بد اخلاقی گویا ساری فضا میں سرایت کر گئی اور عوام و خواص سب لاسی رنگ میں رنگ گئے۔ پروٹسٹنٹ ممالک میں جہاں ازدواج کا عام دستور ہے، اس رسم سے نہایت مفید اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عادات و اطوار کی نفاست و نزاکت بچوں کی تعلیم و تربیت، مریضوں کی تیمارداری، صفائی و پاکبازی، علم و آشتی، رفق و مروت، شفقت و ہمدردی یہ تمام چیزیں پرستِ خانگی زندگی کے جلو میں آتی ہیں۔ مصائب زندگی میں بجائے تلخی کے خوش مزگی پیدا کر دیتی ہیں اور علمی، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی

غرض ہر شعبہ حیات میں ایک نسبت و ملاحظت کی آمیزش کر دیتی ہیں۔ بہ خلاف اس کے کہ کیتھولک اصول پر تجویز کی زندگی بسر کرنے سے انسانی دماغ ایک بالکل ہی مختلف سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس سے غم پر بخ کو موت سے بے خوفی، دنیا سے بے تعلقی، ثبات و استقلال اور ایثار و مردانگی کو قوت پہنچ جاتی ہے، تاہم دوسری طرف مزاج میں خاص طرح کی سختی و خشکی، خشونت و آشفٹگی بھی آجاتی ہے اور تعصب، تنگ نظری و عدم رواداری بھی لازمی طور پر شامل ہو جاتی ہے جس سے اُن میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذرا بھی اہمیت نہیں باقی رہ جاتی، حالانکہ انہیں اسی کا بڑا دعویٰ ہے۔

چنانچہ علمائے بھی اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہوا کہ گو قرون وسطیٰ میں بہت سے زاہدان متراض عابدان تارک الدنیا پیدا ہوتے رہے، تاہم اکابر کلیسا کی بد اخلاقیوں ساری دنیا سے مسیحیت میں سرایت کر گئیں اور مسیحیت کی اصلاحی قوت کو کیتھولک ازم نے مدتوں معطل رکھا۔ نہایت کی شدت کا رد عمل یوں ظاہر ہوا کہ لوگ اخلاق شکنی پر ٹوٹ پڑے اور ازدواج کا ساک معصوم و پر محبت رشتہ معصیت سمجھا جانے لگا۔ پروٹسٹنٹ ازم کا حقیقت یہ بہت بڑا احسان دنیا پر ہے کہ اُس نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے مسیحیت کی اصلاحی قوت کو از سر نو قائم کیا۔

ایک اور مضر اثر جو زیادہ تر رہبانیت کا معلول تھا، یہ پیدا ہوا کہ عورت کی سیرت و مرتبہ کی انتہائی پستی کا تخیل قائم ہو گیا یہ تخیل بالکل نیا نہ تھا کیونکہ اس کے ابتدائی آثار کتب یہود میں موجود تھے۔ دہلن کے باپ کو قمیٹ دینے کا دستور اور تعدد ازواج کی رسم علی العموم جاری تھی۔ عورت تمام قبایح کی مبدی سمجھی جاتی تھی۔ وضع حل کے بعد ایک خاص زمانہ تک وہ ناپاک خیال کی جاتی تھی جو لڑکی پیدا ہونے کی حالت میں یہ مدت بہ مقابلہ لڑکے ہونے کے ڈگنی ہوتی تھی۔ اگلی یہودی تاریخ میں فضیلت نسوانی کی جس قدر نظریں ملتی ہیں وہ سب بہت کم درجہ کی ہیں اور رومہ و یونان کے مقابلہ میں تو یقیناً نہایت پست ہیں۔ بلکہ خود توریت میں جس عورت کی

سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہے وہ وہ ہے جس کے پاس ایک شخص اگر پناہ لیتا ہے اور وہ اُسے بہ کمال مکاری قتل کر ڈالتی ہے۔ غرض یہودیوں کے ہاں یہ مواد تو موجود ہی تھا اس پر سچی رہبانیت نے اور جلا کر دی۔ اس وقت کے پادریوں کی نصایف کی ورق گردانی سے عورت کے باب میں عجیب عجیب تعلیمات آشکار ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت کا وجود جہنم کا دروازہ اور تمام قبائح انسانی کی جڑ ہے۔ عورت کو ہمیشہ ذلیل اور شرمندہ رکھنے کے لئے اس کا یہی خیال کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔ اس کا درجہ ایک دایمی محکومیت کا ہے اُسے اپنے لباس و حسن سے خصوصیت کے ساتھ محبوب رہنا چاہئے کیونکہ صید معاصی کے لئے احسن ہی اس کے پاس سب سے قوی حربہ ہے۔ حسن صورت اس زمانہ میں عام طور پر گرجا کے نزدیک مذموم سمجھا جانے لگا۔ بجز پادریوں کے حسن کے کہ اُس کا ذکر اُن کے مقبروں کے کتبہ پر فخر کے ساتھ ہوتا تھا۔

ان تعلیمات کا اثر قانون پر بھی پڑا۔ بت پرستوں نے اپنے آخر زمانہ میں قدیم مخالف نسوان قوانین کی بہت کچھ ترمیم کی تھی اور اصلاح کا یہ سلسلہ قسطنطنیہ سے لے کر جینیوا تک جاری رہا تھا، لیکن اس دور کے قانون نے عورت کی قانونی ترقی کو پھر کئی صدیوں پیچھے ہٹا دیا۔ طلاق و دیگر حیثیات سے سختیوں کے علاوہ خود وراثت میں عورت طرح طرح کے مظالم کی ہدف رکھی گئی، چنانچہ اکثر حالتوں میں عورت اس پر مجبور ہو جاتی تھی کہ یا شادی کرے یا عمر بھر کے لئے تن بن جائے یہ قوانین اور ان بندشوں کا سلسلہ اٹھارہویں صدی تک قائم رہا، تا آنکہ اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر انقلابیئن فرانس نے گو عورت کو سیاسی آزادی نہیں بخشی، تاہم اولاد و کور وراثت میں مساوات تو ریٹ قرار دیکر آئینہ کی بڑی بڑی اصلاحات کے لئے داغ بیل ڈال دی۔ -

مسیحوں کو عصمت و عفت کا معیار بلند کرنے میں بہت بڑی مدد بربروں کے حملوں اور فتوحات سے ملی۔ غلاموں و خاندان زادوں کی تعداد میں کمی، مناظر تفریح و ملاعب کا تعطیل اور ملک کا عام افلاس یہ سب چیزیں اس باب میں معین ہوئیں۔ اور بربری کو کتنے ہی جاہل و غیر متدین ہوں تاہم

اس خاص حیثیت سے ان کے اخلاق کی سطح بہت کافی بلند تھی۔ ٹیکلیس اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ زنا کاری ان میں الشاذ کا معدوم کی مصلحت تھی، زانیہ کا سرمونڈ کر اُسے مارتے ہوئے، گاؤں میں پھرایا جاتا تھا اور پھر اُس کے ساتھ بدست العمر کوئی شخص شادی نہیں کر سکتا تھا خواہ وہ کتنی ہی نوجوان حسین و صاحب ثروت ہو۔ تعداد ازدواج صرف سلاطین کے لئے مخصوص تھا اور اُن کا بھی اس سے مدعا شہوت رانی نہیں بلکہ انبار نام و نمود ہوتا تھا۔ مائیں خود اپنے بچوں کی رضاعت کرتی تھیں طفل کشی ممنوع تھی۔ عقدہ بیوگان ناجائز تھا۔ مرد عورت کا ادب و احترام کرتے تھے اور اسیری کے وقت خود اپنی ذات سے زیادہ اپنی بیویوں کے گرفتار ہو جاتے۔ کوہ ڈرتے تھے۔

ٹیکلیس کی غرض چونکہ اپنے ہم وطنوں کو اس مثال سے وعظ و تلقین کرنی تھی۔ اس لئے غالباً ان بیانات میں کچھ مبالغہ ہو۔ تاہم ان کی اہلیت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا۔ سیلوئس نے تین صدیوں بعد لکھا ہے اور وہ بھی اسی طرح بربریوں کے مناقب عصمت و عفت کی طرح میں رطب اللسان ہے۔ اسکینڈینیویا کے اساطیر میں متعدد جوائے اس قسم کے پائے جاتے ہیں کہ عورت کو راہ ہدایت سے ہٹانے والوں کو آخرت میں سخت سے سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ بربریوں کے ہاں عورتیں تعمیر خواب کا کام انجام دیتی تھیں، دوا علاج کرتی تھیں خود جنگ میں شریک ہوتی تھیں اور آٹماں شکست کے وقت پانیوں کو از سر نو ہمت و جوش دلاتی تھیں۔ بربریوں کی شدت و فاشکاری کو دیکھ کر آگسٹس نے یہ اصول بنالیا تھا کہ وہ ضمانت کے وقت بربری مرداران قبائل کے بجائے اُن کی بیویوں کو حراست میں لیتا تھا کیونکہ اُنکے لئے اُن سے دست برداری کسی حالت میں ممکن نہ تھی۔ ماریس نے جب ایک بار ان پر فتح پائی تو اُن کی بیویوں نے محض حفظ ناموس کے خیال سے یہ استدعا کی کہ انہیں ”نہیہی“ اچھوتوں میں شامل ہونے کی اجازت دیدی جاوے اور جب یہ التجا نامنظور ہوئی تو سب فی اکبارگی خود کشی کر لی۔ ازدواجی و فاجرستی کے دوا و نقص ہم یہاں مختصر درج کرتے ہیں جن

سے عام حالت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ایک نامی گرامی امیر نے ایک بار ایک شادی شدہ
 بربری عورت کا تاسے اظہار عشق کیا اور جب دیکھا کہ وہ اور کسی طرح رام نہیں ہوتی تو اس
 کے شوہر کو قتل کر ڈالا۔ بیوہ نے ڈیانا کے مندر میں جا کر پناہ لی۔ لیکن یہاں بھی امیر کے
 فرستادوں نے پچھانے چھوڑا یہاں تک کہ ایک روز امیر موصوف بہ نفس نفیس تشریف لے
 آئے۔ اب بیوہ نے بھی اظہار رضامندی کیا، خود بھاری کا لباس پہن کر دیہی کی عورت کے
 سامنے آئی۔ ہاتھ میں جام شراب تھا نصف خود پی لیا، اور نصف عاشق صاحب کو پلا دیا،
 اور جب وہ بھی ختم کر چکا تو جوش مسرت سے چلا کر کہا کہ ”شکر ہے اپنے شوہر کے قاتل سے
 میں نے انتقام لے لیا، شراب میں زہر ملا ہل ملا تھا“ دوسرا واقعہ ایک اور بربری ایوٹینا کا
 ہے۔ اس کے شوہر نے شہنشاہ اسپین کے خلاف بغاوت کی، مگر شکست کھائی۔ مفور ہو کر جان
 بچانا بالکل ممکن تھا، لیکن پیاری بیوی کو چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ خود ایک گائول میں جا کر تہ خانہ کے
 اندر رُپوش ہو گیا، اپنی موت کی خبر مشہور کرادی اور اپنی لاش کی معدومیت کے سوال کو یوں
 حل کیا کہ اس گھر میں آگ لگا دی، تاکہ سب سمجھیں لاش بھی جل کر خاکستر ہو گئی۔ بیوی نے سنا تو
 تین روز تک بے آب و دانہ زمین پر پڑی رہی۔ مگر بالآخر معلوم ہوا کہ یہ غلط خبر قصد امشہور
 کر دی گئی ہے۔ غامری سوگ اس نے اب بھی برقرار رکھا، لیکن شب کو جا کر شوہر سے
 چھپ کر مل آیا کرنی بھئی۔ کچھ روز میں حاملہ ہوئی اور مدتوں حمل کو دواؤں سے چھپائے
 رکھا۔ بالآخر وضع حمل کا وقت آپہنچا۔ اور وہ تنہا جا کر تہ خانے کے اندر دو توام بچے جن آئی
 ایک دو روز نہیں پورے ۹ برس تک بچہ وہیں پلے رہے تا آنگہ یہ راز طشت از باہم ہو گیا،
 باغی پھر گرفتار ہو کر قتل ہوا اور ایوٹینا کی یہ آخری التجا رد کر دی گئی کہ وہ اپنے شوہر کے
 ساتھ جان دے سکے۔

بربریت درہمانیت کی پاکبازی کے درمیان ایک اصولی فرق تھا۔ درہمانیت تجرد
 کے حق میں معین تھی، لیکن بربری پاکبازی کا رخ آفت و غلوں از دواجی کی جانب تھا۔ اور

تعدا ازدواج کا دستور تو بربری سلاطین میں برابر جاری رہا۔ کیرسبرٹ و کلفرک کے متعدد یونان تھیں کلوئیر نے اپنی بیوی کی حیات میں اپنی سالی کو بھی عقد میں لے لیا۔ تھیوڈورسبرٹ بایں پاکبازی دو دو بیویاں رکھتا تھا۔ ڈاگوبرٹ کی تین بیویاں اور متعدد کنیزیں تھیں اور کنیزیں تو خود شاعرکین کے پاس بھی بکثرت تھیں باوجود دو بیویوں کے پایان دوم اور پادری اس وقت اخلاق خانگی کے محافظ و مصلح تھے اور سلاطین و امرا کی کثرت طلاق کی دیکھ بھال رکھا کرتے تھے۔

لیکن اس ایک بات کو چوڑے عموماً بربریوں کی پاکبازی بالکل مسلم و غیر مشتبہ ہے جیسا کہ خود ان کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے عورت کی عصمت کو مہتمم کرنے والے پر نسبت مرد پر بزدلی کے اتمام لگانے والے کے پندرہ گنی رستم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی۔ زنا و زنا بالجبر دونوں پر بہت سخت تعزیرات تھیں۔ پندرہ اشرفیوں کا جرمانہ اس شخص پر ہوتا جو ناجائز طور پر کسی عورت کے ہاتھ کو چھو لیتا۔ اور جراحوں کو ممانعت تھی کہ بغیر شوہروں یا در قریبے میں اعتراف کی موجودگی کے عورتوں کو قصد دے سکیں۔

مسیحیت کے اثر نے عصمت و پاکبازی کی ان تعلیمات کو اور زیادہ قوی کر دیا اب زنا کاری کے واقعات شمار میں بھی کم ہو گئے اور جتنے کچھ ہوتے بھی تھے، بالا اعلان نہیں ہوتے تھے نہ شرم و حجاب کا ایک جدید جذبہ پیدا ہو گیا، زبان و ادب میں محش کا عنصر گھٹ گیا اور قانون ازدواج کی خلاف ورزیاں کیفیت و کیفیت دونوں میں کم ہو گئیں۔ تیسرے گرگوری نے بعض فلاسفہ مشرکین کی طرح اس کی تائید کی کہائیں خود اپنے بچوں کی عصمت کریں۔ لباس و وضع رفتار و گفتار ہر شے سے متعلق قوانین نافذ کر دیے گئے، یونان و ایشیا کو چیک کی لانی ہوئی شہوت پرستی کا سد باب ہو گیا، اور طوائفوں کا طبقہ ذلت و تحقیر کا مراد قرار پایا گیا۔ سب سے بڑی اصلاح اس سلسلہ میں یہ ہوئی کہ عورت و مرد دونوں اس حیثیت سے برابر درجہ کے مجرم قرار دیدیے گئے۔ دنیا کا ایک عام دستور یہ ہے کہ اس باب میں تقویٰ با

الزام عورت پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اور مرد سے گویا متعلق باز پرس نہیں ہوتی عورت کو ایک متبہ بھی کہیں لغزش ہو جائے تو پھر زندگی بھر کے لئے 'دہ داغی' ہو گئی۔ لیکن مرد کھلے خزانہ عورتیں کرتا ہے اور پھر معصوم کا معصوم بنا رہتا ہے، حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ محرک و فاعل مرد ہوتا ہے عورت بیچاری تو صرف ایک حیثیت منفعل رکھتی ہے اور پھر ضعیف و کمزور جو ہوتی ہی سوا الگ اس عدم مساوات کی توجیہ متعدد اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ عورت کے خاظمی ہونے کا ثبوت قطعیت سے مل سکتا ہے اور مرد کا نہیں، یا یہ کہ عورت کی ناجائز اولاد کی پرورش کا بار اگر بے قصور شوہر کے سر ڈال دیا جائے تو بڑی نا انصافی ہے، وغیرہ۔ بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں۔ یہ عام خیال ہمیشہ سے رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ سنیکا و پلوٹارک کے صفحات میں اس کے خلاف اشارات ملتے ہیں، لیکن مسیحی پادریوں نے اس تعلیم کو بہت زور و قوت کے ساتھ بیان کیا کہ زنا میں قصور وار اگر ہیں تو مرد و عورت دونوں اور برابر درجہ کے لیکن تعلیم اس حیثیت سے عمل پر زیادہ موثر نہ ہو سکی۔ عمل پر موثر ہوئی ضرور یعنی ناجائز تعلقات کی ذمہ داری پر مسیحیوں کے بیاں مرد و عورت دونوں یکساں طور پر عائد ہوتی ہے، تاہم سکی بنا یہ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ایک مرد و ایک عورت کا دایمی ازدواج ایک عمل تقدیس ہے جیسا کہ خود مسیح کا ازدواج کلیسا کے ساتھ ہوا اور جو شخص اس مقدس رشتہ میں کسی حیثیت سے بھی رخصتہ اندازی کرنا چاہتا ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، مجرّم ہو یا متاہل، وہ گناہ کبیرہ کا یکساں مرتکب ہوتا ہے۔

اسی مسئلہ کو مذہبی حیثیت سے قطع نظر کر کے اگر محض دنیوی اعتبار سے دیکھیں تو بھی اس کی تائید میں یہ دو اصول ملتے ہیں۔

- ۱) ایک یہ کہ فریقین و نیز جماعت کے لئے مفید کون سی صورت ازدواج ہے ؟
 - ۲) دوسرے یہ کہ ہمارے جس اخلاق کو بلند کرنے والی کیاشتہ ہے اور پست کرنیوالی کون ؟
- ان ہر دو اصول کے معیار پر نظر کرنے سے اسی کی تائید نکلتی ہے کہ تعلقات جنسی کی

بہترین صورت یہی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت دایمی معاہدہ کر کے ایک دوسرے کے پابند رہیں۔ لیکن اگرچہ یہ صورت عقلاً بہترین ثابت ہوتی ہے، تاہم اس کا یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ صرف یہی ایک صورت قابل عمل ہے اور باقی تمام صورتیں مردود ہیں۔ بلکہ عکس اس کے تجربہ بتاتا ہے کہ دوسری صورتیں بھی مخصوص حالات کے درمیان مناسب بلکہ ضروری ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جن جماعات میں، یا جس زمانہ میں موقت تعلق زنا شوقی یا متعہ معیوہ نہیں خیال کیا جاتا اور جبکہ اس رسم پر عمل کرنے والوں میں اس سے احساس معصیت یا اور کوئی اخلاق شکن اثر نہیں پیدا ہوتا۔ یا پھر ایسی صورت میں کہ مرد اپنے جوش شباب میں اگر اپنے ہمسروں میں ازدواج کرتا ہے تو اپنے درجہ کی مالی حالت کو نہیں سنبھال سکتا، اس لئے لامحالہ اُسے اپنے سے کم درجہ عورت کے ساتھ موقت تعلق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ تو ایسی صورتوں میں یہ موقت تعلقات سوسائٹی کے لئے مضر ہونا کیسا اور مفید پڑتے ہیں۔

بت پرست متعین ان استثنائی صورتوں کے وجود اور ان کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے، چنانچہ اپنے قوانین میں انہوں نے ہر جگہ ان کا لحاظ رکھا ہے اور موقت تعلقات کو انہوں نے صاف طور سے جائز قرار دے کے ان کی ایک مضبوط باقاعدہ مکمل بنیادی اور طلاق کی آزادیوں سے بہت سی ناجائز صورتوں کو جواز کا جامہ پہنا دیا۔ کنیزوں کے رکھنے کا دستور بد چلنی کی زیادہ وضع و صریح صورتوں کو روکنے کے لئے جاری ہوا اور رفته رفته عام ہو گیا۔ یہ قانوناً بالکل جائز تھا اور نکاح کے حکم میں داخل تھا۔ جو شخص ایک کنیز کے ہوتے ہوئے دوسری کنیز رکھ لیتا تھا، یا کسی سے نکاح کر لیتا تھا، وہ قانون کی نظروں میں زنا کاری کا مرتکب ہوتا تھا۔ نکاح کی طرح اس کے لئے بھی کسی خاص رسم کی ضرورت نہ تھی اور نکاح کی طرح اس میں بھی افراق ہر وقت ممکن تھا۔ البتہ اس کے کمیزات یہ تھے کہ کنیز اپنے ساتھ جہیز نہیں لاتی تھی۔ خود ادنیٰ درجہ کی ہو کر اعلیٰ طبقہ کے شخص کو شوہر بنا سکتی تھی (دراں حالیکہ نکاح کی صورت میں میاں بیوی کو مساوی طبقہ کا ہونا چاہیے تھا) مگر اس کی اولاد

ہمیشہ مان ہی کے طبقہ میں رہتی تھی، باپ کی جائداد و نسب سے اُسے کوئی بہرہ نہ تھا۔ اس تحریک کے خلاف مسیحیت نے پوری قوت سے علم و جہاد بلند کیا جس کی صدائے باگشت گو قانون کے پردوں سے عرصہ تک بہت دہمی آئی، تاہم مذہبی و کلیسائی تحریروں میں ان کی گونج ہمیشہ بڑی زور کی سنائی دیتی رہی ہے۔ مسیحیت نے اگر یہ تعلیم دی کہ تمام نئی اغراض و منافع اور مادی نتائج و مصلح سے بالکل قطع نظر کر کے خود ارشاد ربانی کے بموجب مرد و عورت میں مباشرت کا جائز طریقہ و حید صرف ناقابل انفصال عقد مناکحت ہی اور اس کے سوا ہبستری کی ہر صورت حرام ہے۔ مسیحیت کے اس قطعی و مدعیانہ تعلیق کا اثر ہر شعبہ حیات پر پڑا جسکے شواہد آج بھی ہر طرف نظر آرہے ہیں۔

اسی تحریک کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ رفتہ رفتہ عقد نکاح ایک مذہبی رسم قرار پا گیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ زنا شونی کے اہم ددائی معاہدہ کو مذہبی استناد کی مہر سے بچد تقوت پہنچ سکتی تھی۔ لیکن سب سے پہلے جس نے اس اثر سے کام لیا وہ مسیحیت تھی۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس دستور نے بہت ہی تدریجاً رواج پایا، چنانچہ جیسا میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں۔ غلاموں کے عقد میں مدت تک اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی اور آزادوں کے عقد میں بھی اس کا لزوم دسویں صدی سے پیشتر طے نہ پاسکا۔ تہرک و تقدیس سے قطع نظر کہ کلیسا کو ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا زبردست آلہ آگیا جس سے اساتین کلیسا ہر موقع پر فائدہ اٹھا کر سچی گمراہی کی خانگی زندگی کو اپنے قابو میں لا سکتے تھے، اور اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ حال میں "قانونی شادیوں" یعنی بلا پادریوں کے توسط کے مناکحت کا جو جواز ہو گیا ہے اس سے کلیسا کے اقتدار کو ایک بہت ہی گہرا دھکا لگا ہے۔

اسی کے ساتھ طلاق کو بھی کلیسا نے مطلقاً ناجائز قرار دینا شروع کر دیا۔ ابتداءً قانون اس کی مخالفت کرتا رہا، چنانچہ قسطنطین نے شوہر کے تین گناہوں اور بیوی کے تین گناہوں پر طلاق کی اجازت دے رکھی تھی۔ بلکہ لوگوں کے عام رجحان کو دیکھ کر جٹین کے زمانہ میں

یہ قیدیں بھی اٹھ گئی تھیں اور اب قانون نے طلاق کے بارہ میں پوری آزادی دے رکھی تھی لیکن دوسری طرف آباے کلیسا اس کی پوری مخالفت کرتے رہے اور عورت سے زنا کاری کا جرم سرزد ہونے کی مشتبہ الجوا صورت کو چوڑ کر باقی ہر حالت میں طلاق کو قطعاً ناجائز قرار دیتے رہے۔ قانون و شریعت کی یہ کشمکش صدیوں تک قائم رہی۔ تا آنکہ قانون کو دہنا پڑا۔ پہلے شارلین سنے گودہ اس رسم پر خود عامل تھا اور اسے قابلِ تحریر نہ قرار دے سکا، تاہم طلاق کو ایک جرم قرار دے دیا۔ لیکن کلیسا کے جوش و خروش کی اس سے تشفی نہ ہوئی اور بالآخر بارہویں صدی میں قانون نے شریعت کے مقابلہ میں اپنی شکست کامل مان کر خود بھی طلاق کے ممنوع ہونے کا اعلان کر دیا۔

مجھے یہاں اس سے بحث نہیں کہ اس ممانعت سے دنیا کے اخلاق پر کہاں تک مفید یا مضر اثر پڑا ہے اس موقع پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ گو اس ممانعت کی تائید میں آج ماویٰ منافع و دلائل سے بھی کام لیا جاتا ہے تاہم ابتداءً اس کی بنائ چیزوں پر نہیں، بلکہ ازدواج کی تقدیس پر تھی یعنی اس عقیدہ پر کہ ازدواج یا دگار ہے خود مسیح اور کلیسا کے درمیان تھا و موصلت کی۔ اور اس بنا پر زنا کاری خطائے اخلاقی سے زیادہ معصیت مذہبی تھی جمہوریت کے دورِ آخر میں رومیوں کا خیال تھا کہ ازدواج ایک ملکی و وطنی فرض ہے کہ اس سے حکومت کو فوج کے لئے افراد ہم پہنچے ہیں، چنانچہ آگسٹس کے قوانین میں مجرد رہنے والوں کے لئے سزائیں بھی مقرر تھیں۔ لیکن اب مسیحیت کے اثر سے یہ تحرک بالکل فنا ہو گیا تھا۔ اب نہ لوگوں میں محافظت وطن کا کوئی جوش رہا تھا اور نہ ازدواج کو کوئی فرض سمجھا جاسکتا تھا، بلکہ اب تو رہبانیت کے اثر سے مجرد زیادہ مقدس و محترم سمجھا جانے لگا تھا۔

ازدواج کے سلسلہ میں ایک شے اور تھی، جس کا حصول بھی آباے کلیسا اپنے مقاصد کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اور وہ یہ تھی کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان رشتہ ازدواج نہ قائم ہو سکے۔ چنانچہ اس قانون کو بھی اب انھوں نے سختی سے نافذ کر دیا۔ یہ بے شبہ سچ ہے

کہ مختلف العقائد اشخاص کے درمیان شادیاں فریقین کے غلو و تعصب کو ہلکا کر دیتی ہیں اور
 ایک دوسرے کے ساتھ رفیق و ملاطفت سے پیش آنے کا سامان بہم کر دیتی ہیں لیکن یہ ایسی
 صورت میں ممکن ہے جب فریقین ایک خاص حد تک روشن خیالی و رواداری کا درجہ
 حاصل کر چکے ہوں تا ریک خیالی و تعصب کی انتہائی پستی میں جبکہ ہر فریق دل سے یہ نچستہ
 اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا شریک زندگی نیز اس کے مذہب پر جتنی اولاد ہوگی وہ سب قطعاً
 ضلالت و گمراہی میں مبتلا، نجات سے محروم اور ایک عذاب الیم و عقوبت دایمی کی مستحق ہی
 موانست و ملاطفت کا کھاں گزر ہو سکتا ہے؟ ایسی حالت میں تو میاں بوی دو نوں کی زندگی
 تلخ ہو جاتی ہے اور خانگی زندگی ہر وقت رنجشوں اور کدورتوں کی آماج گاہ بنی رہتی ہے۔
 خانگی زندگی کی سبب لطفیاں و رنجشیں تمام ترمیمیت کی پیداوار ہیں۔ اس سے قبل
 دنیا کے لئے یہ نامعلوم تھیں۔ کیونکہ گو زوج و زوجہ میں اختلاف عقاید پہلے بھی ہوتا تھا
 تاہم پیشتر ان پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا اور ان کی اتنی اہمیت نہیں خیال کی جاتی تھی۔ زوہر
 کے قبول سیحیت کے وقت جو کچھ حالت ہوگی اُس کا نمونہ ہمیں موجودہ زمانہ میں بھی اپنے
 گرد و پیش نظر آتا ہے۔ ایک بڑا غضب یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں اگر دو شخصوں میں اختلاف
 عقاید ہو تو نا تعلیم یافتہ شخص اپنے سے عالم تر شخص کی پیروی کرنے لگے گا یا کم از کم اس کی رائے
 کو وقعت و احب کی نظر سے تو ضرور دیکھے گا۔ لیکن خاص مذہبی معاملات کے اختلاف کے
 وقت اس کے بالکل برعکس صورت حال ہوتی ہے۔ یہاں اپنی رائے کو قطعاً صادق سمجھنا اور
 دوسرے کے عقیدہ کو گمراہ اور حصول نجات سے محروم کرنے والا اور منجانب شیطان سمجھنا
 ارکان ایمان میں سے ہے۔ اور چونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر و زوجہ یا باپ اور بیٹے کی
 علمی سطح برابر نہیں ہوتی۔ اس لئے اختلاف عقائد کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اور پھر اس سے رنجشوں
 اور بے لطیفیوں کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے انہوں نے خانگی زندگی کو تمام ترمیمیتوں سے لبریز کر دیا
 ہے یعصب غلو۔ حق پوشی۔ تاریک خیالی، ضد۔ عدم رواداری۔ ان چیزوں کو پر جوش

علمائے دین۔ جزو مذہب بنا دینا اپنا فرض خیال کیا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ اختلاف عقائد کے باوجود حیات خانگی ایک لحظہ کے لئے بھی پر لطف رہ سکے؟ ان خرابیوں کو پیش نظر رکھ کر پادریوں نے امن و لطف کی زندگی کی بقا کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان مناکحت کا سرے سے سد باب کر دیں۔ ایک یہ خیال تھا۔ دوسرے میرے نزدیک اس خیال کو اس عقیدہ سے اور انت حاصل ہو گئی کہ ہم نکاح مسیح اور کلیسا کے اتحاد و موافقت کی یادگار ہے۔ اس وقت کو حاملین مذہب اس عقیدہ کے استعارہ نہیں بلکہ اس کے لفظی معنی میں قایل تھے کہ ان کے نزدیک یہ ایک برہنہ اسرار ربانی میں سے اور تمام سچی اعضا و جوارح تھے مسیح کے، جن کے لئے کسی غیر مذہب والے کے ساتھ ازدواج کرنا ایک مذہبی محصیت تھی، جیسا کہ سینٹ سیاپرن وٹر ٹولمین وغیرہ ائمہ کلیسا نے یہ تصریح کیا ہے۔

مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے باب میں مسیحیت نے جو نتائج پیدا ہوئے ان کے خلاصہ کو ہم دفعات ذیل کی صورت میں رکھ سکتے ہیں۔

(۱) دوشیزگی و بچہ کی انتہائی تقدیس۔

(۲) نکاح کے سوا مرد و عورت کی ہمبستری کی اور تمام صورتوں کا عدم جواز۔

(۳) مسیحیوں کے لئے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ ازدواج کی قید۔

(۴) طلاق و افتراق کا عدم جواز۔

(۵) اور نکاح کی مذہبی حیثیت۔

ان سب کے علاوہ ایک خاص اثر مسیحیت کا یہ بھی ہوا کہ عورت جن خصوصیات میں مرد برتری رکھتی ہے۔ ان کے لحاظ سے اس نے ان کے درجہ کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ اس کی تفصیل کے لئے آئندہ فصل ملاحظہ ہو۔



فصل (۴)

فضائل نسوانی

مرد و عورت کے درمیان کیا باہمی تناسب ہے؟ اس سوال کا ہر قوم، ہر مذہب، ہر ملک اور ہر زمانہ نے ایک نیا جواب دیا ہے اور اس جواب کا اخلاق کے عملی پہلو پر ہمیشہ گہرا اثر رہا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل تین مختلف شعبوں پر تقسیم ہے جہاں حیثیت سے دیکھئے تو اس کا فیصلہ بالکل بدیہی ہے۔ یعنی مرد قوت و طاقت میں ممتاز ہے اور عورت حسن و نزاکت میں عقلی و دماغی حیثیت سے دیکھئے تو یہی علی العموم مرد ہی کی فضیلت نکلتی گی۔ علم و فن، فلسفہ و حکمت، زبان و ادب، غرض کسی شعبہ میں نظر کیجئے۔ مردوں ہی نام نظر آئیں گے اور خواتین کی جماعت میں کسی شکیں کسی یقین کی نیوٹن کسی ریفاصل اور کسی ہنڈل کا نام نہ ملے گا۔ دقت پسندی، وسعت نظر، قوت تحقیق و تنقید ان سب چیزوں میں مرد کی فضیلت مسلم ہے۔ البتہ نازک خیالی و لطیف الاحساسی میں عورت کا نمبر بڑھا ہی ہوا ہے۔ اسی لئے ناول نویسی، ایکٹری و لطیف مکالمات و مراسلت میں عورت کا مرتبہ فی الجملہ پست نہیں۔

لیکن اب اگر اخلاقی نقطہ خیال سے غور کیجئے تو یہ حیثیت مجموعی عورت ہی کا امتیاز فوق ثابت ہوگا۔ سب سے پہلے ہم پولس کے فراہم کردہ اعداد کو لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہ لحاظ جرایم مرد و عورت میں درمیان پانچ اور ایک کے نسبت ہے؛ اس کی تاویل میں اگر یہ کہئے کہ مرد پر کنبہ کی پرورش کا بار ہوتا ہے اور اُس کے سامنے قانون شکنی کی زیادہ ترغیبات موجود رہتی ہیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ افلاس و ناداری جو جرایم کی سب سے بڑی محرک ہے اُس کا شکار عموماً عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ لیکن خیر پولس کے اعداد سے قطع نظر کر کے بجائے خود غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایثار میں عورت کا نمبر مرد سے قطعی بڑھا ہوا ہے

فضیلت اخلاق کے سرچشمہ دو ہیں، ایک اضطراری، یعنی بلا قصد طبعاً اختیار خیر و ترک شر و دوسرے ارادی، یعنی شاہراہ فرض پر فرض جھکے چلتا ہے، سو میرے نزدیک یہ صورتیں عورتوں ہی پر زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ مرد کی بہ نسبت یہ اپنے خیال و عمل دونوں میں زیادہ عقیف ہوتی ہیں۔ ان میں گو حسد، رشک، کینہ و حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، تاہم ہمدردی، انگساری، صبر و شکر، رضا و تسلیم، قناعت و نفس کشی میں اُن کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے اور گو مرد میں غم و بلند نظری، ثبات و استقلال، جواں مردی و خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے، تاہم انکار و تواضع، خلوص و تپاک، شرم و حجاب کی حصہ داری ہی ہوتی ہیں۔ مرد کا طبعی رجحان عدل و انصاف کی جانب ہوتا ہے اور ان کا رجم خدا ترسی کی جانب۔ ان کی نظریں گو محدود ہوتی ہیں۔ تاہم تخیل بہت قوی ہوتی ہے۔ اور درد و مصیبت کے وقت دوسرے کے کام آنے میں یہ مردوں سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں ان کا ذہن کلیات و تعلیمات سے نہیں بلکہ جزئیات و شخصیات سے متاثر ہوتا ہے اور انگساری و ہمدردی کے مواقع پر مردان کا بالکل مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسیحیت کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اخلاقی تخیل میں تبدیلی پیدا کر کے فضائل انسانی کو ایک خاص شرف و امتیاز عطا کر دیا۔ یونانیوں کا تخیل جس طرح فنون لطیفہ میں مردانہ تھا اُسی طرح اخلاق میں بھی مردانہ تھا اس معنی میں کہ وہ لوگ جن چیزوں کو اُم الفضائل کے درجہ پر رکھتے تھے وہ تمام مردانہ خصوصیات تھے، مثلاً جرات و ہمت، اعتماد و نفس، وجہ وطن اور ان کے مقابلہ میں جو فضائل، خصائص انسانی میں سے ہیں اُن کی جانب کوئی خاص اعتنائ نہ تھا، مثلاً عفت و شرم و حیا، ہمدردی و فیاضی۔ چنانچہ اُن کے یہاں جو مشاہیر خواتین ہوتی ہیں اُن کے کارنامہ بھی تمام مرد ہی ہوتے تھے، جو ایک مرد کے لئے طفرائے امتیاز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک ماں کے سامنے اُس کی اولاد نے وطن کی خاطر جان دیدی اور اس کے آئینہ تک نہ نکلے۔ وقس علی ہذا۔ لیکن جو جذبات لطیف صفت نازک کے لئے مایہ ناز ہو سکتے ہیں اُن کی طرف سے وہ لوگ غافل سے تھے۔ رومی تمدن و اخلاق پر سب سے زیادہ اثر

رواقیت کا پڑا تھا اور رواقیت کے سب سے زیادہ سربرآوردہ رکن کا خود یہ اعتراف تھا کہ ہمارا تخیل بالکل مردانہ ہے۔ اور تو اور ایک ہی بات کو دیکھنا چاہئے، کہ سنگ تراشی میں بت پرستوں کو خاص کمال حاصل ہوا اور نقاشی میں مسیحوں کو۔ یہ آخر کیوں ہوا؟ اس بنا پر کہ سنگ تراشی مردانہ حسن، یعنی قوت و طاقت کی مظہر تھی، اور نقاشی زنانہ حسن یعنی لطافت و نزاکت کی ترجمان ہوتی ہے۔ چنانچہ خود مسیحی مصوروں و نقاشوں کے بہتر سے بہتر افراد جو عظمت و قوت کی نقاشی کے عادی تھے مسیحی تخیل کی صحیح تصویر کھینچنے میں ناکام رہے یہ انقلاب حالت تمام تر مسیحیت کا نتیجہ تھا جس نے قدیم یونانی تخیل کو فنا کر کے اس کی جگہ علم و انکار، خلق و تپاک، سینت و مدارات، رفعت و ملاطفت، تسلیم و رضا، الفت و محبت کے جذبات مخصوص بہ نسواں کو رنعت بخشی۔

عورتوں میں ایک تو ایسی ہی جذبہ مذہبیت بہ مقابلہ مردوں کے قوی ہوتا ہے اور دوسری مسیحیت نے جو اپنے بانی کے ساتھ عشق و شفقت کو بنیاد دین قرار دی اور جس کی بنا پر عورتوں کو اپنے مخصوص فضائل کے اظہار کا غیر متوقع موقع مل گیا اس سے مسیحیت کی تبلیغ میں عورتوں کو غیر معمولی حصہ و اقتدار حاصل ہو گیا۔ ایسا کہ کسی اور اہم ذہنی تحریک میں اتنا حصہ عورتوں نہیں رہا جو تعذیبوں کے زمانہ میں شہیدانِ راد حق کی صفِ اوّل میں اکثر ممتاز ترین اہما و خواتین ہی نظر آتے ہیں اور مسیحی و مشرک مصنفین متفق اللفظ ہیں کہ خواتین غیر معمولی مستعدی کے ساتھ کلیلیا میں داخل ہوتی تھیں اور مردوں کو اس میں داخل کرنے میں خاص حصہ رکھتی تھیں سینٹ ایکٹ میں سینٹ کریزوسٹم، سینٹ میل، سینٹ گریگوری، و تھیوڈورٹ، ان سب کی ماؤں کو ان کے مسیحی بنانے میں کافی دخل تھا۔ سینٹ ہیلینا یعنی والدہ قسطنطین، فلیسیا یعنی ملکہ تھیوڈوسیہ عظمیٰ نے پلچیریا، یعنی ہیشیرہ تھیوڈوسیہ مزد، اور پلیسیڈیا، یعنی والدہ ویلنٹینا، ان سب کا شمار خاص حامیانِ دین میں ہے۔ ان کے علاوہ جو فرقہ اہل اعتزال کے تھے ان میں بھی متواتر کا خاص زور تھا چنانچہ آرٹس، پریسلین، اور مونٹینس کے گروہ صنفِ ان

کے ایک لشکر کا مجرم رہتا تھا۔ تحریک رہبانیت میں بھی عورتیں مردوں کے دوش بدوش تھیں اور خیراتی کاموں کے نظم و نسق میں تو ان کا نمایاں حصہ تھا۔ درحقیقت اس سے زیادہ وہ کسی اور کام کے لئے خلقتاً کمزور ہی نہیں ہوئی تھیں اور گو ہرلت اور ہر زمانہ میں ان کی انفرادی مثالیں اس قسم کے کام کی ملتی ہیں، لیکن ان کی اس سرشت و جبلت کو پورا فائدہ مسیحیت پہلے کسی نے نہیں اٹھایا۔ قیسیلا، پالا، میلینیا وغیرہ بہ کثرت خواتین ایسی تھیں جنہوں نے اپنی زندگی رفاہ عام کے کاموں کے لئے وقف کر دی اور وہ کام بھی اس نوعیت کے کہ پہلے کبھی کسی کے خیال میں نہیں آئے تھے۔ مگر فلیسیلا اپنے ہاتھوں سے شفا خانوں میں بیماروں کی تیمارداری کرتی تھی اور یہ خدمت تو ہر مسیحی بیوی کے گویا فرائض میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نظیر سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اور مسیحیت و کلیسیا کی تاریخ میں گو اس پر دیگر حیثیات سے تاریک سے تاریک دُور گزرے ہیں، لیکن اب کوئی زمانہ نہیں آیا جو ایسی مسیحی خواتین کی تعداد کثیر سے خالی ہو جنہوں نے اپنی زندگی نوع انسان کی رفقہ تکالیف کے لئے وقف کر دی ہو اور یہ خدمت خلق کی خصلت جس قدر دنیا کو نفع و راحت پہنچانے میں معین ہوئی ہو اُسی قدر ان ہستیوں کی سطح اخلاق بلند کرنے میں بھی ہوئی ہے جو اس پر عامل رہی ہیں۔

بعض معتزلی فرقوں میں عورتوں کے سپرد اعلیٰ مذہبی مناصب بھی ہوتے تھے۔ عام راسخ العقیدہ گروہوں میں گویہ شے جائز نہ تھی، تاہم بعض ادنیٰ مذہبی مراسم کے ادا کرنے کی عورتوں کو ان کے ہاں بھی اجازت تھی اس سلسلہ کی ابتدا خود جوار یوں کے زمانہ سے قائم ہو گئی تھی۔ بن سیدہ کنواریوں کا ایک خاص حلقہ قائم کر دیا گیا تھا جن کے ایک خاص صلت اٹھانے کے بعد یہ قرائض قرار پا جاتے تھے کہ عورتوں کو پستیمہ لینے میں مدد دیں، بیماروں کی تیمارداری کریں، نظر بندوں اور قیدیوں کی خدمت کریں، مذہبی مجالس میں انتظام اہتمام کریں اور جو عورت پادری صاحب کا شرف زیارت حاصل کرنا چاہے اس کی رہبری کریں۔

تاریخی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس حلقے میں بھی ابتری پھیلنے لگی تا آنکہ بالآخر یہ مخصوص کنواریاں محض عام کنواریوں (نن) کے درجہ پر رہ گئیں۔ تاہم اس حلقہ کا وجود مشرق میں بارہویں صدی تک رہا۔ اس کے علاوہ پہلی مرتبہ کی بیواؤں کی خاص شہادت ہوتی تھی اور وہ کلیسیا کی فیاضیوں کی خاص حقدار سمجھی جاتی تھیں۔ علی ہذا ان بن رسیدہ مستورات کے ساتھ جن کا کوئی مرد والی و وارث نہ ہوتا (عام اس سے کہ انھوں نے کبھی شادی نہ کی ہو یا یہ کہ ان کے مرد اعزہ کی وفات ہو گئی ہو) غیر معمولی مراعات ملحوظ رکھے جاتے۔ مرد کا سن جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے، اُسی نسبت وہ زیادہ تجربہ کار و جہان نیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے ”بڑھیا عورت“ ہر جگہ عموماً ایک مضحکہ خیز ہستی سمجھی جاتی ہے اُس سے تمسخر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ حُسن و جمال جو شباب میں اس کا قوی ترین حربہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس وقت اُس کا بالکل ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور بہ مقابلہ ایک پیرزن کے ایک پیر مرد اس کا بھی زیادہ حصہ دار نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں کلیسیا کا یہ ایک خاص احسان ہے کہ اس نے مومن عورتوں کے گرد تقدس و احترام کا حلقہ کھینچ کے اُن کی قدرتی کمزوریوں کا ایک بڑی حد تک کفارہ کر دیا اور ایسے اسباب مہیا کر دیے کہ ان کی آخر عمر کی تلخیاں اور ناگواریاں کچھ تو کم ہو جائیں۔

کلیسیا کی ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ مسیحی وضعان قوانین نے بھی جائیداد کے معاملہ میں عورت کے قانونی حقوق کو وسعت دینا شروع کیا اور جسٹینین نے مشرکوں کے اس اصول کو توڑ کر کہ سرپرستی و مرنہ گری کا حق مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ بیواؤں کو ان کی اولاد کا مرنہ و سرپرست بنا دیا۔ عورتوں نے جس طرح اپنے تئیں خدمت کلیسیا کے لئے وقف کر دیا تھا نیز جس قدر امداد مقبول بیوائیں کلیسیا کو دیتی تھیں، بے شبہ ان چیزوں نے ایک حد تک کلیسیا کو بھی ان کا ہمدرد بنا دیا تھا، لیکن ان خواتین و تعلیمات سے اہم نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عورتوں کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے باب میں غیر معمولی حصہ حاصل ہو گیا اگرچہ لازمی طور پر ہر موقع

پر مفید ہی نہیں ثابت ہوا۔

لیکن قانونی حقوق سے قطع نظر کر کے محض وہ اخلاقی تخیل جو عورت کے متعلق اب قائم ہوا تھا اس کے عظمت و شرافت میں اضافہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ پیر مقدس کنواری کا جو تقدس دلوں میں تھا، صنفِ نسواں میں کثرت سے پیر و ولی پیدا ہوئے تھے۔ یہ چیزیں بھی اس اثر کے گہر کر کے میں معین ہوئیں۔ اسی سلسلہ میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ قوم یہود جس نے قدیم قومِ ثلثہ میں تاریخ و شاعری کے عالم میں سب سے قلیل تعداد جنسِ نسواں میں سے پیدا کی، اُنسی نے دنیا کے سامنے عورت کے مرتبہ کے متعلق اتنا بلند تخیل پیش کیا، اور اس حقیقتِ عورت کی دلکش ترین و محبوب ترین خصوصیات کا راز بھی کھل جاتا ہے کہ ایک ایسی خاتون جس کو متعلق ہم بجز اُس کی نیکی اور اس کی مغمومیت کے اور مطلق کچھ نہیں جانتے۔ بایں ہمہ دنیا کو اس کی جابا جو کشش و گرویدگی ہے اُس کا مقابلہ مشرکوں کے ہاں کی بہتر سے بہتر وطن پرست خواتین نہیں کر سکتیں۔ مقدس کنواری کے پرستش کے مذہبی حصہ کے جواز و عدم جواز، استحسان و عدم استحسان سے ہمیں بحث نہیں لیکن یقینی ہے کہ عورت کا مرتبہ بلند کرنے اور مردوں کے اطوار و اعمال میں گداز و لطافت پیدا کرنے میں جس حد تک یہ تخیل معین ہوا اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی مشرکوں کی دیویوں کی پرستش سے یہ بات حاصل ہونا ممکن ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ ہستیاں حُسنِ اخلاقی، اور خصوصاً زنانہ حُسنِ اخلاقی کے جوہر سے مُعترِی تھیں۔ اس تخیل نے حقیقتِ مذہبِ عیش پرستی اور عسکریت کے اُن تمام مختلف عناصر کو یکجا کر دیا جن کے اثر میں صد ہا ہزار ہا سال گزر جانے کے بعد اب تک بھی کوئی کمی نہیں پیدا ہو سکی۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ سولہویں صدی میں جو مذہبی انقلابات ہوئے ان میں کھوکھلا کا ساتھ زنانہ اخلاق نے دیا اور پُر پوٹ ازم کا ساتھ مردانہ اخلاق نے جس کی وجہ یہی ہے کہ اوّل الذکر نے مقدس کنواری کی پرستش کو قائم رکھا اور اس کے متعلقات کو برابر برتری دی جذبات کو موسیقی، نقاشی، نقش و نگار کی آرٹنگی سے براہِ نگینہ کرنا، عقل کے بجائے اپنا مطالب

تخیل کو بنانا، بجائے قوائے مدد کے قوائے حساسہ کو تحریک دینا، معتقدات کے باب میں
 تنگم سے کام لینا اور سب سے بڑھ کر اپنے متعین کو ہمیشہ تقلید کی تعلیم دینا۔ یہ تمام چیزیں
 اس کی موزیدات ثابت ہوئیں۔ مرد کی سرشت میں اپنے پیروں آپ کھڑا ہونا، اور عورت
 کی سرشت میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈھنا ہے۔ اس بنا پر جو مذہب دلوں میں دوسروں کا
 آسرا، اور دوسروں کے دامن میں پناہ لینے پر نجات کا اذعان بٹھا دیتا ہے وہ عورت
 کی طبیعت پر خاص طور سے موثر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو مذہب شخصی ذمہ داری
 پر زور دیتا ہو اور مذہب کو جذبات کے زیور سے معری کر دیتا ہے، وہ مردوں ہی کا
 مذہب ہو سکتا ہو۔ پورٹن ازم (توہب) مسیحیت کی سب سے زیادہ مردانہ شکل ہے اس کے
 مشاہیر ارکان کتھولک ازم کے مشاہیر ارکان سے نہ صرف اپنی تعلیمات کے لحاظ سے بلکہ
 اپنی علیٰ مذہبی لحاظ سے بھی ہمیشہ مختلف رہے ہیں۔ کتھولک ازم طبیعت میں میسدا کرتی ہے اور
 پروٹسٹنٹ ازم مضبوطی کو اکثر نرمی کے ڈانڈے کمزوری و بزدلی سے اور مضبوطی کے
 فوائد سختی و تشدد سے مل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں دل سے کتھولک ہیں ان میں
 تقدس و احترام، خوش مزاجی، خلق و مروت، آداب تہذیب و امناری کے جوہر نمایاں
 ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو قومیں دل سے پروٹسٹنٹ ہیں، ان میں راست بازی، فرض شناسی
 اور بلند سیرتی کے اوصاف ممتاز ہوتے ہیں۔ اطاعت و انکسار، اول الذکر قوموں کے اور
 حریت و خود داری آخر الذکر قوموں کے اوصاف خصوصی ہیں۔ اول الذکر ضعیف الاعتقاد
 وہم پرست ہوتی ہیں اور آخر الذکر متعصب غالی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پروٹسٹنٹ ازم
 نے ازواج کا احترام قائم کر کے صنف نسواں پر ایک بڑا احسان کیا۔ لیکن یہ مسلک
 اپنے تعلیمات و اعمال کے لئے ہرگز اس صنف کے لئے اتنا موزوں نہیں جتنا اس کا حریف
 ان مسائل میں پڑ کر میں تاریخ کے حدود سے تجاوز کر گیا۔ لیکن اس کتاب کی تالیف
 سے میرا مقصد کائنات اخلاقی کے محض واقعات و حوادث کو قلب بند کرنا نہ تھا، بلکہ یہی کھانا

کہ عہدِ اجتماع کے ہر تغیر پر ان کا کیا اثر رہا ہے۔ اب میں اس کتاب اور اس باب کے خاتمہ پر اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اخلاق کے تمام شعبوں میں آئندہ ہر دو اصناف کے باہمی تعلقات اور عورت کے مرتبہ کا مسئلہ سب سے زیادہ دشوار و نازک ہو۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ تمدن کی وسعت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں فیاضی، راست بازی، دیانت داری، واعتدال و پاکبازی کے جوہر ترقی کرتے جاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف خاص روشن خیالی اور معاشری تفاسیوں کے عروج کے زمانہ میں مرد و عورت کے باہمی تعلقات، قیود سے آزاد ہو جاتے ہیں موجودہ زمانہ میں ان تعلقات کی نوعیت بہت کچھ نہ ہی طرزِ تعلیم کی معلول ہے۔ لیکن اس کا اثر و زبردست ملکی معاشرت پر ہلکا پڑا جاتا ہے۔ ہر حال میں بعض اقتصادی و صنعتی حقائق کے انکشاف نے بھی اس حیثیت سے رفتارِ زمانہ کا رخ پھیر دیا ہے۔ یہ پُرانا کلیہ کہ کثرت آبادی ہمیشہ مفید ہوتی ہو۔ جو وضعین قوانین و کلامِ اخلاق دونوں کے نزدیک مسلم تھا اور جس پر قانون و اخلاق دونوں کے ایک بہت بڑے حصہ کی بنیاد تھی اب باطل ثابت ہو گیا ہے اور اب اس کی جگہ اس کے قضیہ برعکس نے لے لی ہو کہ آبادی کا محدود رہنا ملک کے حق میں مفید ہے اور اولاد ازدواج کو ایک حد متین سے آگے نہ بڑھنا چاہیئے۔ کچھ تو اس کلیہ کے اثر سے اور کچھ تمدنِ زائیدہ عیش پرستیوں کی بنا پر صنعتِ نسوان کی ایک بڑی اور روز افزوں تعداد بغیر کسی مرد کی ولایت کے خود ہی کشمکشِ حیات میں پڑتی ہے۔ لیکن قوانین و آئینِ حکومت نیز معاشری رسم و رواج جواب تک اُسی قدیم بنا پر قائم ہیں کہ ہر بالغ عورت کو بوی ہوتا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ عورت کی راہ میں سہولت پیدا کریں اسے مردوں کو مساوی تعلیمی و مالی حقوق سے محروم رکھ کر اس کے لئے اور زیادہ دشواریاں پیدا کر رہے ہیں اور بیویاں جائز ذرائع آمدنی و مشاغل اس پر بند کر کے، اسے بد چلنی یا انتہائی افلاس اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن بائیم عورت کی خانگی زندگی میں بھی ایک انقلاب شروع ہو گیا ہے جس کے اثرات اس وقت واضح طور پر کسی کی نظر میں بھی نہیں۔ جو مشاغل اس کے لوازمِ زندگی

سمجھے جاتے ہیں وہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر اب بڑے بڑے کارخانوں میں پہنچ گئے
 کپڑے سینا چرہ کا تنہا۔ اس سارے زمانہ کا رد بار کو اب بجائے عورت کی انگلیوں کے
 مشینوں اور کلوں کے پڑزہ انجام دے رہی ہیں۔

اس صورت حال کے نتائج پر غور کرنا ایک حکیم اخلاق کے لئے دلچسپ ہو گا۔ لیکن مؤرخ
 کے دائرہ عمل سے یہ باہر ہو۔ پیشین گوئی صرف اس حد تک کی جاسکتی ہے کہ عورت کے آئندہ
 مشاغل و طریقہ تعلیم موجودہ حالت سے بالکل بدلے ہوئے ہوں گے۔ ان تغیرات کا لازمی اثر
 سیرت و طبیعت پر پڑے گا۔ اور عورت و مرد کا موجودہ طرز تعلق میسوں حیثیات سے قابل
 ترمیم سمجھا جائے گا۔ متعدد دانو کھئے نظریات بھی پیش ہوں گے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان تمام
 اصلاحات و تغیرات اخلاقی کی بھی ایک خاص حد ہوگی جس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہو گا جو کہ
 نیکی و بدی کی تفریق ملحوظ رکھتے ہیں۔ قوانین اعمال بشری کو سمجھتے ہیں اور اپنی اولاد کے نفع
 نقصان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے پیش نظر یہ حقیقت اچھی طرح ہے کہ دوسرے شعبوں کی
 طرح اس باب میں بھی فطرت کی طرف سے اخلاقی امتیازات قائم ہیں جو کسی کے منائے
 نہیں مٹ سکتے۔

جانب اول - - - - -

فلسفہ اجتماع

(الایت مولوی عبدلہ جہ صاحب بی اے) یہ کتاب بھی فلسفہ جذبات کے قابلِ مہنت

کے قلم سے نکلی ہوئی ہے۔ اور نفسیات کے ایک عجیب مسئلہ سے بحث کرتی ہے۔ اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قولے و داغی کی تحلیل و تشریح ہے۔ یہ کتاب فلسفہ جذبات سے بھی زیادہ دلچسپ و پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ آج کل جبکہ ملک میں ہر طرف سے قومی زندگی میں انقلاب کی صدا میں بلند ہو رہی ہیں اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر مفید و سبق آموز ہے۔ اس پر ہندوستان و انگلستان کے علماء و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ قیمت (۵۰) مجلد (بیر) (صفحات ۲۲۶)

مشاہیر یونان و رومہ (جلد اول) مترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب انجمن نے ترجمے کے

لیے جن کتابوں کو منتخب کیا ہے یہ کتاب ان میں سب سے ضخیم اور بلند پایہ ہے۔ اگرچہ کتاب پہلی صدی عیسوی کی لکھی ہوئی ہے لیکن دنیا میں آج تک کوئی کتاب اس رتبہ کی نہیں لکھی گئی ہے اور تمام عالم کے انشا پردازوں اور عالموں نے اس کے سامنے سر جھکا یا ہے۔ کتاب کا موضوع قدیم رومی و یونانی مشاہیر کے حالات زندگی ہے۔ لیکن ان کے لکھنے میں مصنف نے سیرت نگاری کا وہ کمال دکھایا ہے جس کی نظیر دنیا کے علم ادب میں نہیں ملتی۔ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس میں ایثار، حب وطن، جو اندازی اور اولوالعزمی کے ایسے کارنامے نظر آئیں گے جو دلوں کو ہلا دیں گے۔ ہماری قوم کے نوجوانوں کے مطالعہ کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی اور اس کا مطالعہ خاص کر اس زمانہ میں ان کے لیے لازم ہے۔ اس کا ترجمہ مولوی ہاشمی صاحب نے بڑی محنت اور خوبی سے کیا ہے۔ کتاب مع مقدمہ مترجم ۵۰ صفحات پر ہے۔ قیمت (بیر) مجلد (سٹے)

مشاہیر یونان رومہ (جلد دوم) | یہ اسی مشہور آفاق اور بے نظیر کتاب کی دوسری جلد ہے جس کا ترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب نے نہایت قابلیت سے کیا ہے حجم ۳۸۲ صفحہ قیمت (نیر) مجلد (دعا)

علم المعیشت (مولفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم اے) اس علم (پولٹیکل اکنامی) پر اُردو زبان میں یہ نہایت مستند اور جامع کتاب ہے۔ مصنف نے مشکل سے مشکل مسائل کو بڑی سلاست اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ علم دنیا میں روز بروز ترقی کر رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی تمدن کا اصل راز ان اصول کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمدن و ترقی کے پیچیدہ حالات و مہاسباب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک اس علم کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے اُردو میں یہ کتاب لکھ کر ملک پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ کتاب ۸۲۵ صفحات پر تمام ہوئی ہے اور بہت اچھی پسی ہے۔ قیمت صرف (الحمد) اور مجلد ہے

بسیرونی (مولفہ مولوی سید حسن صاحب بنی بی اے) ابوریحان بیرونی اُن بلند پایہ عالمی مرتبہ حکماء میں سے گذرا ہیں جن پر ایک دنیا کو ناز ہے۔ اس فاضل روزگار نے مختلف مباحث و علوم پر توائے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ اور اکثر سائنس و ریاضیات کے نہایت دقیق اور اعلیٰ مسائل پر۔ ہندوستان میں آکر اس نے سنسکرت میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ اور ہندوستان کے فلسفہ و تاریخ و مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی جو اب تک وقعت و عزت کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ غرض یہ کتاب اس فاضل متبحر کے حالات اور اس کی نادر و نایاب تصانیف اور کمالات پر ہی ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت فی جلد (نیر) ہے

ملنے کا پتہ: صدر دفتر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)

